سمیرا شریف طور

محبت دھنک رنگ اوڑھ کر

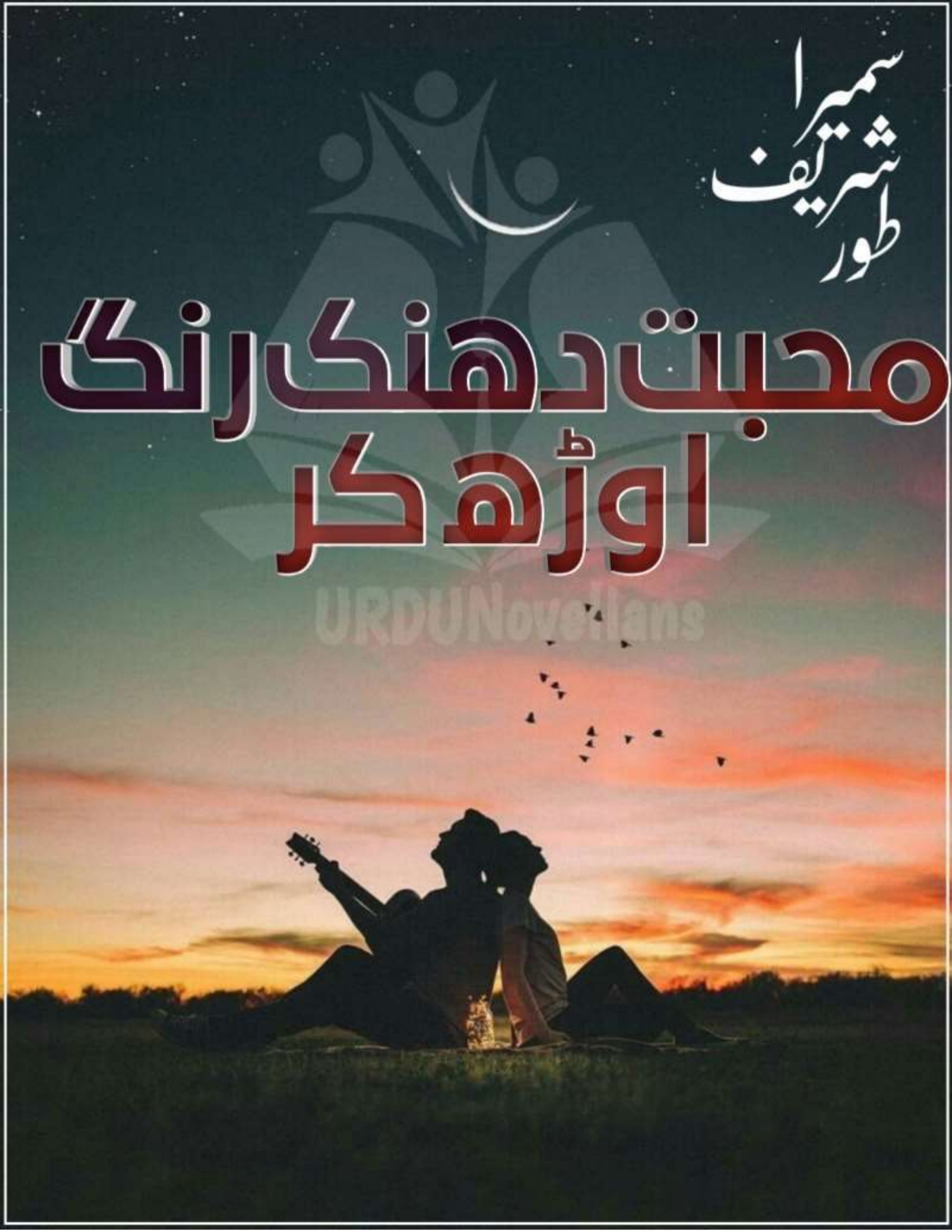

URDUNovellans

محبت دھنک رنگ اوڑھ کر

سمیرا شریف طور

عظمت دیکھیں وہ شاہ زر کھڑا ہے۔” وہ لوگ جیسے ہی ایئر پورٹ کے احاطے سے باہر نکلے تو کمال صاحب کی نظریں مسلسل شاہ زر کو تلاش کر رہی تھیں۔ آخر کار انھوں نے اپنی کوشش میں کامیاب ہوتے ہی وہیں سے ہاتھ ہلایا اور ساتھ ہی گھر والوں کو بھی مطلع کیا۔ دونوں بہنوں نے بھی اسی جانب دیکھا جدھر کمال صاحب نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں موجود شخص ہاتھ ہلا کر ان سب کو “خوش آمدید” کہہ رہا تھا مشعال کی ساری کی ساری حسیات آنکھوں میں سمٹ آئیں۔

پورے پندرہ سال بعد وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نک چڑھے اور جھگڑالو سے شاہ زر کو جس کا سارا غصہ مشعال اور چچا کو دیکھ کر محبت میں بدل جاتا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں چند لمحے پہلے بجلیاں سی برس رہی ہوتی تھیں، یک دم ان میں محبت کی اَن گنت قندیلیں روشن ہو جاتی

تھیں اور زبان جو شعلے برسا رہی ہوتی تھی فوراً پھول بکھیرنے لگتی تھی۔ وہ سب جیسے ہی اس کے پاس پہنچے شاہ زر فوراً آگے بڑھ کر چچا کے گلے لگ گیا۔

’’یقین کریں چچا جان! ساری رات نیند نہیں آئی۔ جیسے ہی آنکھ لگتی فوراً آپ کی آمد کے خیال سے نیند ہی آنکھوں سے اڑ جاتی۔ یہاں آپ کا انتظار کرتے قیامت کے پل گزرے ہیں۔‘‘ وہ چچا کمال کے گلے لگا ہوا تھا۔ عظمت بیگم اور ابیشا دلچسپ نظروں سے اس خوبرو بندے کو پاپا کے ساتھ چمٹا دیکھ رہی تھیں جب کہ وہ ویسے ہی سرسری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔

مردانہ قد کاٹھ، چوڑا سینہ، لمبا قد، گندمی رنگت، خوب صورت مردانہ نین نقوش سے مزین چہرہ کالی سیاہ گہری آنکھیں اور اس بھرپور وجاہت سے مزین سراپے پر موجود گرے پینٹ اور گہری دھاری دار گرے ہی شرٹ تھی۔

چچا کے گلے لگے شاہ زر نے بھی اپنی اس ’’انگریزن لک‘‘ دیتی کزن کا جائزہ لیا۔ اسے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بجلیاں ہی بجلیاں کوندنے لگی تھیں۔ آنکھوں میں واضح وحشت وبربریت اتر آئی تھی۔ چہرے پر ایک دم سرد مہری چھانے لگی۔ اپنی غیظ وغضب، غم وغصے، نخوت وجابریت والی نیچر کا اظہار کرنے سے بمشکل خود کو روک پایا تھا۔ مصلحتاً وہ چچا کمال سے علیحدہ ہو کر چچی کی طرف جھک گیا۔

’’السلام علیکم چچی جان!‘‘ عظمت بیگم تو شاہ زر کو دیکھ کر حیران تھیں وہ بھی تقریباً پندرہ سالوں بعد اسے دیکھ رہی تھیں۔ یہ والا خوبرو سا شاہ زر اس نخریلے، ہر وقت غصہ ناک پر

چڑھائے رکھنے والے شاہ زر سے بالکل مختلف تھا۔ انہیں ایک دم شوہر کا فیصلہ بہت پسند آیا۔ وہ جو برطانیہ سے آتے ہوئے دل ہی دل میں خائف تھیں۔ اب شاہ زر کو دیکھ لینے کے بعد بہت مطمئن ہو گئی تھیں۔ فوراً آگے بڑھ کر شاہ زر کے سر پر پیار کیا اور ساتھ ہی فراخ و کشادہ پیشانی پر بوسہ دیا۔

"کمال! آپ واقعی سچ کہتے تھے' یہ شاہ زر تو بالکل ہی بدل گیا ہے۔" اس انمول خوشی کا اظہار عظمت بیگم کے پورے وجود سے ہو رہا تھا۔ کمال صاحب نے ستائشی نظروں سے شاہ زر کو دیکھا جو اب ابیشا اور مشعال پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

"شاہ زر بیٹا! ان سے ملو یہ ابیشا ہے اور یہ مشعال۔" انہوں نے دائیں بائیں کھڑی دونوں صاحب زادیوں کا تعارف کرایا تو اس نے ایک دم ہونٹ بھینچ لیے۔

"السلام علیکم شاہ زر بھائی۔" ابیشا نے فوراً آگے بڑھ کر سلام کیا۔

اس نے دونوں کی جانب دیکھا۔ کس قدر تضاد تھا دونوں بہنوں میں۔ ظاہری حلیے دونوں کے کس قدر مختلف تھے۔ ابیشا وائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ جس نے اس کے سارے وجود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ سر پر موجود اسکارف اسے بہت معصوم ظاہر کر رہا تھا جب کہ مشعال پینٹ شرٹ میں ملبوس تھی۔ دوپٹہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کھلے بال جو اس کے ارد گرد پھیلتے اس کے نمایاں ہوتے نسوانی خدوخال کو ڈھانپ رہے تھے۔ بالوں کی کچھ لٹیں اس کے رخساروں

کے ارد گرد جھول رہی تھیں۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی وہ چونک سا گیا۔ ایسا کچھ ضرور تھا جو بغور دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس کی نظریں محسوس کر کے آگے بڑھی۔

”ہیلو...“ اپنا مرمریں ہاتھ اس نے شاہ زر کی جانب بڑھایا۔ شاہ زر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اس کے منہ پر طمانچہ کھینچ مارا ہوا۔ کہاں اس کے خاندان کی عورتیں شرم و حیا کا پیکر تھیں۔ ڈھکی چھپی رہنے والی اپنے پندار کی حفاظت کرنے والی۔ نظریں جھکا کر مرد سے کلام کرنے والی اور کہاں یہ مشعال...؟ اس کی رگیں تن گئیں غیرت مند خون تیزی سے دوڑنے لگا۔

”ہیلو...“ اس کے ہاتھ کو یکسر نظر انداز کر کے اسے مصلحتاً اپنے مزاج کے برخلاف اپنے جارحانہ وانتقمانہ اشتعال انگیز ردِ عمل کو کنٹرول کرنا پڑا تھا۔ اس کا لحاظ و مروت آڑے آ گیا۔ چچا کی خاطر وہ اسے جواب دینے پر مجبور تھا اگر وہ لوگ یہاں نہ ہوتے تو نجانے وہ کیا کر ڈالتا۔

وہ اس درجہ بیزار کن خشک انداز اور کھردرے لب و لہجے پر ششدر رہ گئی تھی۔ بھلا کب کسی نے اس کے کسی عمل پر یوں ردِ عمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تو صرف سنانے کے لیے ہی تھی۔ آج جو یوں کسی نے بیچ چوراہے پر یوں سلوک کیا تھا تو وہ بھڑک اٹھی۔ ہتک، ذلت اور احساس توہین سے لمحہ بھر کو سن کھڑی رہی۔ شاہ زر نے پتھر کھینچ مارے تھے۔ اس درجے سرد مہری، بے گانگی، اجنبیت اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا گیا تھا کہ وہ خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ ایک غصیلی

نظر اس منتقمانہ و جارحانہ وجود پر ڈال کر وہ اپنا ہاتھ گرا کر دوسری طرف رخ موڑ کے آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

افوہ... اس قدر انسلٹ...؟" اپنی کنپٹیوں کو سہلانے لگی نہیں تو اندر ایک لاوہ بھڑکنے لگا تھا جس کی رو میں سب کچھ بہتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مائی فٹ..." نخوت و غرور سے سوچتی اسے دل ہی دل میں سنانے لگی۔

گو ٹو ہیل..." اپنے انتقام کے لیے ابھرتے دل کو آخری لفظ کہہ کر اس نے تسلی دی۔

آئیں چچا جان..." وہ سامان اٹھا کر آگے آگے چلنے لگا تھا۔ اس نے مما پاپا اور ابیشا کی تقلید میں اس کے پیچھے گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

گاڑی میں اندر بیٹھنے سے پہلے تو ایک لمحہ کو اس کا دل چاہا کہ وہ اس خودسر و غیظ و غضب کے پیکر کو گاڑی سمیت آگ لگا کر راکھ کر دے۔

مجھے کیا... میری بلا سے مجھے کونسا ساری عمر یہاں رہنا ہوگا۔ چند دن رہوں گی اور پھر واپس چلی جاؤں گی۔" وہ اپنے اندر کے دہکتے آلاؤ کو ٹھنڈا اور پرسکون کرنے کی غرض سے اپنا دھیان بٹانے کو سوچنے لگی۔

یہ آج بھی ویسا ہی جنگلی، وحشی اور بدتہذیب ہے۔ مرنے مارنے کو بالکل تیار۔ خیال تھا کہ کچھ بدل گیا ہوگا۔ ظاہری شخصیت کے ساتھ ساتھ باطن بھی اثرانداز ہوا ہوگا۔ جس

طرح وقت و حالات نے مجھے بدل ڈالا ہے شاید یہ بے وقوف بھی اندر سے بدلا ہو گا۔ پرانے خیالات اور دقیانوسیت بدلی ہو گی تو ان دیہاتیوں کو بھی تہذیب آئی ہو گی لیکن... افسوس... دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو گئی ہے' چاند ستاروں اور کہکشاؤں کی باتیں کرتی ہے لیکن یہ دیہاتی اب بھی اسی کنارے پر ہیں جہاں سے چلے تھے۔" وہ بہت نیگیٹو ہو کر سوچ رہی تھی۔ پاپا اس سے پاکستانی افیئرز کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ ماما اور ابیشا بھی ادھر ہی متوجہ تھیں۔ وہ بے دلی سے باہر دیکھتی رہی رات کے اندھیرے کی بدولت کچھ صاف مناظر نہیں تھے' وہ جلد ہی بور ہو گئی۔ شولڈر بیگ سے "ببل" نکال کر منہ میں ڈالی اور واک مین کانوں سے لگا کر "مائیکل جیکسن" کو سننے لگی۔ سارے سفر میں وہ یہی کام کرتی آئی تھی' ماما پاپا کو اس کی پروا نہیں تھی اور اسے ان کی۔ تھوڑی دیر بعد شاہ زر نے گاڑی ایک چھوٹے سے فلیٹ کے سامنے روک دی۔ دو کمروں ایک کچن اور ڈرائنگ روم پر مشتمل یہ چھوٹا سا فلیٹ واقعی بہت خوب صورت تھا۔ وہ دلچسپ نظروں سے فلیٹ کو دیکھتی رہی۔ سارا فلیٹ اچھی طرح دیکھ کر وہ بے یقین تھی کہ یہ خوب صورت ڈیکوریٹڈ سا فلیٹ اس سڑیل اور نک چڑھے شخص کی ملکیت ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے دونوں کمروں اور ایک کچن کا کچھ نظارہ بخوبی ہو رہا تھا۔

برطانیہ سے پاکستان تک کی فلائٹ نے اسے کافی تھکا ڈالا تھا۔ وہ وہیں رکھے صوفوں میں سے ایک پر گر گئی۔ شاہ زر نے اسے یوں گرنے پر عجیب نظروں سے دیکھا۔

"السلام علیکم۔" وہ لگ بھگ پچاس چھپن سال کی ایک سلیقہ مند سی خاتون تھیں جو چائے کی ٹرالی دھکیلتے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ آواز پر چونک کر وہ اس عورت کو دیکھنے لگی بلکہ اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے لگی۔

"یہ...؟" ماما خاتون کو دیکھ کر پاپا کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں وہ مسکرا دیئے۔

"یاد کرو' یہ کون ہیں؟" آج کل خلافِ توقع ماما' پاپا کے تعلقات ان چند ماہ میں بہت خوشگوار ہو چکے تھے وہ دونوں کو دیکھنے لگی۔

"ارے یہ تو سارہ ہے۔" ماما نے کچھ دیر سوچنے کے بعد خوش ہو کر کہا پھر اس کی طرف بڑھیں وہ اور ابیشا بھی چونک گئیں۔ ابیشا تو بہت زیادہ نہیں لیکن وہ خود انہیں بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ ان ہی کے ہاتھوں تو وہ پل کر جوان ہوئی تھی۔ وہ خود ابیشا' شاہ زر' آزر بھیا اور حویلی کے باقی سارے بچے ان کے ہاتھوں کے ہی تو پروردہ تھے۔ حویلی میں ان کو شاہ زر کی والدہ کے انتقال کے بعد ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ملازمہ تو جیسے تصور ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر ان کی طرف آ گئی۔

"السلام علیکم اماں! میں مشعال ہوں... آپ نے پہچانا۔" وہ بچپن سے ہی اوروں کی دیکھا دیکھی انہیں "اماں" کہنے لگی تھی۔ اب بھی وہی طرزِ تخاطب استعمال کیا۔ انہوں نے اسے اپنے گلے لگا لیا۔

’’ اَرے تم مشعال ہو۔ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ کل تک تو بالکل چھوٹی سی تھی اور آج ماشاء اللہ... اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ نظر ہی نہیں ٹھہر رہی۔“ انہوں نے بے اختیار کہتے ہوئے اس کا ماتھا چوم لیا۔ اسے لگا جیسے وہ برسوں بعد سیراب ہونے لگی ہے۔ جیسے کسی نے اس کے اندر دہکنے والے آلائو پر اپنی محبت کے مہربان چھینٹے ڈال دیئے ہوں۔ وہ اندر تک سیراب ہوتی گئی۔ یہی تو وہ لمس تھا جو وہ دیارِ غیر میں بھی اپنی ماں کی آغوش میں تلاش کرتی رہی تھی لیکن اس کی ماما کو فرصت ہی کب تھی؟ انہیں یوں بچوں کو ساتھ چمٹا لپٹا کر پیار کرنا اچھا ہی کب لگتا تھا۔ وہ ماڈرن ازم کی پجاری تھیں اور خود کو گائوں کے ماحول میں ان فٹ محسوس کرتی تھیں۔

چائے سے فارغ ہو کر وہ اور ایبشا آرام کی غرض سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ تھکن کے مارے برا حال تھا۔ اس نے ایبشا کو اشارہ کیا تو وہ شاہ زر سے پوچھنے لگی۔

’’ شاہ زر بھائی! ہم بہت تھک گئی ہیں، نیند بھی آ رہی ہے ہمیں کمرہ بتا دیں تاکہ ریلیکس ہو جائیں۔“

’’ اماں! آپ انہیں میرا کمرہ سیٹ کر دیں اور چاچی کے لیے دوسرا۔“ ایبشا کی بات پر اس نے فوراً سارا اماں کو کہا۔

’’ تو کیا ہم دونوں ایک ہی کمرے میں ٹھہریں گی۔؟“ اماں جانے لگیں تو وہ درمیان میں ہی بول اٹھی۔ جواباً شاہ زر نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا وہ اسے اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئیں۔

اجڈ، جاہل، بد تمیز انسان یوں گھورتا ہے جیسے کبھی کوئی لڑکی ہی نہیں دیکھی۔" وہ دل ’ ’ ہی دل میں اسے گالیوں سے نوازنے لگی۔

مجبوری ہے، یہ میرا چھوٹا سا فلیٹ ہے دو کمروں پر مشتمل، اب اس چھوٹے سے فلیٹ ’ ’ میں آپ کے لیے ایک علیحدہ کمرہ افورڈ کرنے سے تو رہا۔" بظاہر بات مذاق کے رنگ میں کہی گئی تھی لیکن وہ اسے اندر تک سلگا گئی۔ اس سادہ سی بات میں چھپا طنز اور بیزاری اسے اچھی طرح محسوس ہو گئی تھی۔

پاپا! ہمیں اس پھٹیچر گھر میں ٹھہرنا تھا کیا؟ آپ کسی ہوٹل میں انتظام نہیں کر سکتے ’ ’ تھے۔" وہ براہِ راست پاپا سے مخاطب تھی۔ دونوں میاں بیوی کو مشعال کی یہ دیدہ دلیری ایک آنکھ نہ بھائی۔ مشعال میں تو اس وقت مروت نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن وہ دونوں یہ تلخ گھونٹ پی گئے۔ شاہ زر کا تو اور بھی برا حال تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس بد تہذیب، منہ پھٹ لڑکی کو ایک منٹ کے اندر ہی درست کر دے یا پھر نظروں سے دور کر دے

مشی موقع اور وقت کی نزکت کا خیال کر لیا کرو۔ جاؤ دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں ٹھہر جاؤ۔ رات ہی گزارنی ہے نا اور پھر کل ہم گاؤں روانہ ہو جائیں گے۔ پاپا نے تحمل سے کہا۔ ان کی بات غور طلب تھی اور پھر وہ اس شخص سے دور ہو جائیں گی۔ اسے کیا فرق پڑتا ہے وہ چاہئے کچھ سوچے سمجھے

شاہ زر بیٹا تم کوئی اور گھر کیوں نہیں دیکھ لیتے۔ میرا مطلب ہے کھلا تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ جی چچا جان میں بھی سوچ رہا ہوں ویسے بھی گورنمنٹ جاب سے مجھے بنگلہ مل رہا ہے سوچ رہا ہوں واپسی پر واہی شفٹ ہو جاؤں

اندر داخل ہوتے ہی شاہزر کے الفاظ اسکے کانوں میں پڑے۔ وہ دھیان دیے بغیر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرہ بہت سجا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے اس گھر کو پھٹیچر کہا تھا اس وقت سجاوٹ دیکھ کر دھنگ رہ گئی۔ ویسے اس بد دماغ کا زوق بہت اچھا ہے

ابیشا باتھ لے کر آئی تو اس سے رہ نہ گیا بہت سرا تو وہ بولی کمرہ کیا وہ خود بھی بہت زبردست بندہ ہے اس جیسا چارمنگ میں نے پورے برطانیہ میں نہیں دیکھا۔ مجھے تو بہت پسند آئے کیا آپ کو اچھے نہیں لگے۔

صرف شکل صورت ہی ہے اس میں اور کیا ہے۔ بات کرنے کا طریقہ دیکھا تھا جیسے دنیا اس کی ٹھوکر میں ہے۔ اس کی بات کرتے کرتے بس کڑواہٹ ہی تھی ایسا کئ برسوں سے ہو رہا تھا۔ آپی ایمان سے آپ زیادتی کر رہی ہیں اگر آپ کی فرنیڈ انھوں دیکھ لیں تو دیوانی ہو جائیں گوری چیٹی میمیں ان ایشیائی مردوں پر مرتی ہیں پھر وہ بھی کپڑے اٹھا کر نہانے گھس گئی جب نہا کر نکلی تو ابیشا سو چکی تھی وہ ایک دم بہت بور ہونے لگی۔ اسکی نیند پر لعنت بھیجتی ہوئی بالوں میں کنگی کرنے لگی. ٹیبل پر پرفیوم کی بوتل بہت عمدہ خوشبو اس نے فراخدالی سے استعمال

کی۔ ہر چیز کا جائزہ لیا تھا تو شاہ زر کی نفیس اور باذوق طبیعت کھل کر سامنے آ گئی۔ ہر چیز سلیقے سے پڑی پھر دوسری طرف رکھے ریک میں چند ایک کیسٹیں پڑی تھی۔

انتہائی بور اور بیزار شخص ہے۔" یکے بعد دیگرے اس نے اس کی سب کیسٹوں کا جائزہ لے ڈالا۔ کوئی بھی کیسٹ اس کے ٹیسٹ کے مطابق نہیں تھی۔ اسٹیریو کی طرف سے ناامید ہو کر وہ ریک کی دوسری طرف رکھی ان گنت کتابیں دیکھنے لگی۔ ساری کی ساری کتابیں اس کی دلچسپی کے مطابق تھیں۔ خاص طور پر ادب سے متعلق' ابنِ انشاء کے سفر نامے' منشی پریم چند کی کتابیں۔ پاپا نے بھی ایسی کئی کتابیں برطانیہ میں جمع کر رکھی تھیں۔ اکثر پاکستانی فیملیز ان کے ہاں کتابوں کی شوقین آتی جاتی رہتی تھی۔ دنیا بھر کا بہترین ادب ان کی لائبریری میں موجود تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پندرہ سال دیارِ غیر میں گزارنے کے باوجود وہ نہ خود اپنی مٹی' پاکستانی روایات اور اسلامی اقدار کو بھولے تھے اور نہ ہی اپنی اولاد کو بھولنے دیا تھا جب کہ وہ دانستہ ہر وہ کام کر جاتی تھی جس سے ماما پاپا کو تکلیف پہنچے۔ پاپا نے دونوں بیٹیوں کو بہترین اردو سکھائی تھی۔ پاکستانی کلچر کے بارے میں ہر طرح کی معلومات ازبر کروا دیں جب وہ برطانیہ گئے تھے تو وہ صرف دس سال کی نوخیز لڑکی تھی لیکن اسے یہاں پاکستان میں گزارا بچپن زندگی کے وہ سنہری دس سال آج بھی ازبر تھے۔ ایک ایک بات' ایک ایک واقعہ' ذہن کی اسکرین پر تازہ تھا۔ جیسے وہ کل ہی کی تو بات ہو لیکن درمیان میں پندرہ سالوں کا عرصہ محیط تھا۔ ایک دو یا پانچ سالوں کا نہیں پورے پندرہ سالوں کا۔ ان گزرے ماہ و سال نے اس کی

شخصیت کو سر سے پائوں تک بدل ڈالا تھا۔ پاپا یعنی شاہ کمال کی کہانی بھی ان سب مردوں جیسی ہی تھی جو یورپین ممالک میں تعلیم کی غرض سے جاتے ہیں اور پھر وہیں شادی کر لیتے ہیں۔ کمال صاحب بھی برطانیہ تعلیم کی خاطر گئے تھے اور عظمت بیگم سے شادی بھی اپنی پسند بلکہ محبت کی تھی۔ دونوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت خوش خوش برطانیہ سے پاکستان لوٹے تھے۔ روایتی والدین کی طرح شاہ کمال کے والدین نے چند اعتراضات کے بعد عظمت بیگم کو بہو کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ ایک مسلمان لڑکی ہیں، پیچھے برطانیہ میں ان کا پورا مسلمان خاندان موجود ہے۔ چند سال گزرنے کے بعد عظمت بیگم کو گائوں کے جاہلانہ رسم و رواج، طور طریقوں سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ گھر کے مکینوں کی موجودگی بری طرح کھٹکنے لگی تھی۔ وہ ویسی ہی آزاد اور پرسکون زندگی گزارنا چاہتی تھیں جیسے وہ برٹش فضائوں میں گزارتی رہی تھیں۔ وقت اور حالات نے نیا رخ بدلا تو عظمت بیگم دو بچیوں کی ماں بن گئیں لیکن وہ کمال صاحب کو واپس برطانیہ چلے جانے پر آمادہ نہ کر سکیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ضد میں اضافہ ہوتا گیا۔ کچھ گائوں کے حالات کافی بگڑ گئے تھے اور عظمت بیگم کے ہاتھ واپسی کا ایک معقول بہانہ آگیا۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی تو کمال صاحب کو اپنی بچیوں کے مستقبل کی فکر ستانے لگی۔ جنہیں عظمت بیگم اپنے ساتھ برطانیہ لے جانا چاہتی تھیں لیکن شاہ کمال ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہر حال میں مصالحت کے خواہش مند تھے اور پھر جب خاندانی دشمنی کی بدولت حالات قابو سے باہر ہو گئے تو عظمت بیگم ایک دفعہ پھر واپس پلٹ جانے کی ضد پر اتر آئیں۔ بڑوں کے بیچ بچائو کرانے پر کمال صاحب کو اپنی ضد چھوڑ

کر عظمت بیگم کی بات مان لینا پڑی تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر برطانیہ سیٹل ہو گئے۔

عظمت بیگم کو پاکستان رہنے کا پہلا تجربہ بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہاں جا کر وہ برطانیہ کی آزاد فضائوں میں ایسی مگن ہوئیں کہ واپسی کا خیال تک بھول گئیں۔

بچیاں جوان ہو رہی تھیں۔ شاہ کمال لوٹنا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف عظمت کی بجائے مشعال رکاوٹ بن گئی تھی عظمت بیگم دل سے واپس آنے پر رضامند نہ تھیں۔ مشعال ماں باپ کے درمیان ضد اور انا کا مسئلہ بن گئی تو روز جھگڑے ہونے لگے۔ جوان ہوتی لڑکیاں روز روز کے جھگڑوں سے متاثر ہوتی گئیں۔ ایشا کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی شخصیت پر شروع سے ہی باپ کی تربیت کے اثرات غالب رہے کچھ اس کا آنا جانا مسلم گھرانوں کے ہاں تھا۔ وہ شروع سے ہی اسلامک اکیڈمی' اسلامک انسٹی ٹیوشنز میں جاتی رہی تھی۔ سو اس کا رجحان مغرب پسندی کی بجائے اسلامی اقدار کی طرف زیادہ تھا۔ اتنی کم عمری میں بھی اس کی سوچ بہت پختہ تھی۔

اور مشعال جو دس سال کی عمر میں برطانیہ چلی آئی تھی۔ یہ دور تربیت کے لحاظ سے انتہائی نازک ہوتا ہے۔ اس دور میں وہ مغربی ماحول میں داخل ہوئی تھی۔ سب کچھ نیا اور مختلف تھا حتیٰ کہ ذہنی اپروچ تک الگ تھی۔ خیالات احساسات جذبات' نظریات روایات اقدار' رسم و رواج طور طریقے رنگ ڈھنگ آب و ہوا سب اس کی سوچ اور شخصیت کے خلاف تھا۔ جس دور میں انتہائی نگہداشت کی ضرورت تھی اسی دور میں وہ ایک آزاد بگڑے ہوئے معاشرہ کا حصہ بنی

تھی۔ دل و دماغ ہر وقت کشمکش میں مبتلا رہتا پہلے پہل تو وہ اس نئی صورت حال کو قبول کرنے سے قاصر تھی لیکن جب یہ نازک دور غالب آیا تو وہ خود کو اس ماحول میں رنگنے سے روک نہ پائی تھی۔ والدین کی باہمی چپقلش، کچھ پرانی یادوں نے اس کی آنکھوں سے پاکستان اور پاکستانی لوگوں کے متعلق دیکھے گئے خوب صورت سپنے نوچ پھینکے تھے۔ شاہ کمال کی بہت زیادہ محنت اور توجہ کے باوجود وہ ابیشا کی طرح ان کی جانب راغب نہ ہو سکی تھی۔ وہ اس کی تربیت صرف زبان کی حد تک کر سکے تھے لیکن ابیشا کی طرح وہ اسے اسلامی ڈھانچے میں نہیں ڈھال سکے تھے۔

مشعال نے جب عظمت بیگم کے دوبدو کھڑے ہو کر ان کے بھانجے ایاز کے لیے انکار کیا تو انہیں احساس ہوا کہ جو کچھ ہوا ٹھیک نہیں ہوا بلکہ ندامت ہوئی کہ برٹش معاشرہ ان کی بچیوں کے لیے کسی بھی طرح سوٹ نہیں کرتا لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ پانی سر سے گزر چکا تھا کیونکہ اس دفعہ ان کے مقابل ان کی اپنی بیٹی کھڑی تھی جو ان کی ہی طرح ضدی اور اٹل ارادوں والی تھی۔ کچھ مشعال کے ذہن میں بوئی ہوئی نفرت کی فصل ان کی اپنی سوچ کا نتیجہ تھی۔ جب تک انہوں نے چاہا وہ وہاں رہیں لیکن جب مشعال وہاں رہنا چاہتی تھی تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ کیوں انہوں نے ہر وقت طعنہ زنی کرتے مشعال کے ذہن کو پاکستانی لوگوں، خاص طور پر گائوں والوں سے متنفر کر دیا تھا۔ مشعال پاکستان سے کسی بھی قسم کا تعلق رکھنے کی روادار نہیں تھی۔ ابیشا تو ماما پاپا کے کہے میں تھی جب کہ وہ سرے سے ہی قابو سے

باہر تھی۔ نائٹ کلبوں میں اس کا آنا جانا تھا۔ مسلم و غیر مسلم لڑکے لڑکیوں سے دوستیاں کر رکھی تھیں وہ ہر وہ کام کرتی تھی جو اس کا جی چاہتا تھا۔ ماما پاپا اسے سمجھاتے تو وہ انہیں الزام دینے لگتی۔

چار سال پہلے اس کی ملاقات جولف سے ہو گئی تھی۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ مذہب کے لحاظ سے وہ کرسچن تھا۔ ملاقات ایک نائٹ کلب میں ہوئی تھی۔ دوسری دفعہ اس نے اسے ''سی سائیڈ'' پر دیکھا تھا' پھر شاپنگ مال میں حتیٰ کہ مسلسل ملاقاتیں دوستی کا رنگ اختیار کرتی گئیں اور پھر دوستی محبت کی صورت میں بدل گئی۔

ئ ء

شاہ زر سے اس کی نسبت بچپن سے ہی طے تھی۔ شاہ زر کی وجہ سے ماما پاپا میں اکثر اختلاف ہوتا رہتا تھا۔ جب ماما کی سوچ نہیں بدلی تھی تب تک وہ اسے شاہ زر جیسے شخص سے بیاہنے پر راضی نہ تھیں ان کی مرضی اس کی شادی اپنے بھانجے ایاز سے کرنے کی تھی جب کہ اس نے دونوں کو ریجیکٹ کرتے ہوئے اپنا فیصلہ پاپا کو سنا دیا۔ ایم بی اے کرنے کے بعد وہ جاب کر رہی تھی۔ جب اس نے پاپا کے سامنے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔ ماما پاپا بہت جزبز ہوئے۔ یہ خبر دونوں کے لیے ایٹم بم سے کم نہ تھی۔ جب ڈانٹ ڈپٹ زبردستی پھٹکار عاجزی محبت ہر حربہ بے سود ہوا تو انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور خود اندر ہی اندر واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ ابیشا اور ماما سب جانتی تھیں جب کہ وہ قطعی لاعلم تھی۔ ماما

پاپا نے ضروری ساز وسامان پہلے ہی پاکستان بھجوا دیا تھا۔ ماما پاپا کی سرگرمیوں نے اسے مشکوک کر دیا۔ روانگی سے صرف دو دن پہلے اسے معلوم ہوا کہ وہ سب پاکستان جا رہے ہیں۔ اس نے چیخ چیخ کر زمین و آسمان ایک کر دیا۔ وہ کسی بھی صورت پاکستان نہیں آنا چاہتی تھی یہ اس کا اٹل اور آخری فیصلہ تھا اور وہ اس فیصلے پر.بری طرح ڈٹی ہوئی تھی۔ اسے پاکستان سے کوئی غرض تھی اور نہ ہی اس نے پاکستان سے ”حب الوطنی“ کا راگ الاپا تھا۔ صرف بچپن کی سنہری یادیں چند حسین و دل فریب واقعات اور خوب صورت باتیں تھیں لیکن وہ چند واقعات اور روپہلی یادیں اس کے دل میں پاکستانی رشتوں کے لیے کوئی احساس نہ جگا سکیں‘ کوئی کشش پیدا نہ کر سکیں۔ وہ برطانیہ کی آزاد فضاؤں میں پل.بڑھ کر خود کو وہاں کا ہی ایک حصہ سمجھتی تھی لیکن وہ ماما پاپا اور ابیشا کی لاکھ منتوں پر ہار گئی۔ وہ ابیشا اور پاپا سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ کبھی بھی اظہار نہیں کیا تھا۔ ابیشا کے ہاتھ جوڑنے پر صرف اس شرط پر مانی کہ وہ پاکستان تو چلی جائے گی لیکن اس کا قیام پاکستان میں صرف چند ہفتے ہو گا اور وہ جب چاہے گی واپس آجائے گی۔ ماما پاپا نے بھی آرام سے اس کی شرط مان لی تھی۔ ان کا اصل مقصد اسے ایک دفعہ پاکستان لے آنا تھا۔ مستقل رہائش کے انتظامات وہ پہلے ہی پاکستان میں کر چکے تھے۔ وطن لوٹنے پر اپنی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ سب کچھ بھول بھال گئے تھے اور اب شاہ زر سے ملنے کے بعد انہیں اس کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ یہی بات مشعال کو بہت کھل رہی تھی۔

کتابیں ریک میں رکھ کر وہ جولف کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ یہاں آتے ہوئے ائیر پورٹ تک اسے سی آف کرنے آیا تھا۔ کلیئرنگ کروانے تک وہ اسے وطن جاتے ہی اپنی خیریت کی اطلاع دینے کی بار بار تاکید کرتا رہا تھا اور اب وہ یہاں آکر کچھ دیر پہلے تک سب کچھ بھول چکی تھی۔ یاد آنے پر اس نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھی۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت ہو چلا تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون سیٹ پڑا دیکھا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ باہر نکل آئی۔

لائٹس آف تھیں۔ سب جانب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اندھوں کی طرح اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے گھورتی رہی۔ پھر اندازے سے ادھر ادھر ہاتھ مارتی قدم آگے بڑھانے لگی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ اچانک راستے میں پڑی ہوئی کسی سخت چیز سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گری تھی۔ بے اختیار مارے خوف کے لبوں سے ہلکی سی چیخ آزاد ہوئی' باقی کی بلند ہوتی چیخ کو بمشکل ہاتھ سے روکا۔ دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔

’’کون ہے؟‘‘ شاہ زر کی آواز اپنے اس قدر قریب سنائی دی تھی۔ اپنے وجود کے ارد گرد کسی کے بازوؤں کی چٹانوں ایسی سختی محسوس ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر منہ کے بل شاہ زر پر جا گری تھی۔ وہ تیر کی سرعت سے پیچھے ہٹی تھی۔ ایک دو پل لگے تھے اسے خود کو سنبھالنے میں۔ خوف کے حصار سے باہر نکل کر جب آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو پورا ڈرائنگ روم روشنی سے نہا رہا تھا۔

’ ’ تم... کیا کر رہی ہو تم یہاں؟” شاہ زر مشعال کو دیکھ کر حیران ہوا۔ پوچھنے کا لہجہ آپ ہی آپ سخت ہو گیا۔ آنکھوں اور لہجے میں چھائی ہوئی سختی ایک دم واضح تھی۔ وہ جو کھڑی اپنے اس اچانک اور فطری فعل پر شرم و جھجک کا شکار ہو رہی تھی۔ ایک دم حیران ہو کر شاہ زر کی آنکھوں میں موجود تلخی اور برورت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔ وہ زمین میں شرم سے گرنے کو تھی۔ اس سے یہ فعل اندھیرے کی گہری لپیٹ میں آکر سرزد ہوا تھا۔ وہ کون سا جان بوجھ کر اس پر گری تھی۔ مٹھیاں بھینچ کر اسے دیکھنے لگی۔

’ ’ کہ... کہ... کیا... مطلب ہے تمہارا؟” شرم و حیا کے علاوہ اچانک اور آنے والے غیظ و غضب، غصہ و اشتعال سے وہ پاگل ہونے کو تھی۔ آواز کانپنے لگی۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس تنگ ذہن اور قدامت پسند سوچ کے حامل شخص کو اپنی نظروں سے اوجھل کر دے یا پھر خود زمین پھٹے اور اس میں سما جائے۔ اس کے مطلب پوچھنے پر وہ طنزیہ واستہزائیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید اندر ہی اندر کھولنے لگی۔

’ ’ ہونہہ... بہت پارسا اور زاہد بنتا ہے۔ جیسے صنف نازک سے کبھی کوئی تعلق اور واسطہ ہی نہ رہا ہو۔” وہ تو اس شخص کے ذکر سے بھی دور بھاگتی تھی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھی‘ اندر ہی اندر تلملانے لگی۔ شاہ زر کی نظروں میں چھپی کاٹ اسے دیوانہ کیے دینے کو کافی تھی۔

’ ’ خود کو بہت زاہد سمجھتے ہو، تم بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہو اسی خاندان سے ہی تمہارا تعلق ہے جس کی بے حیائی اور نفس پرستی مشہور تھی۔ جس خاندان کی ہوس کے قصے

زبانِ زدِ عام تھے۔ جنگلی اور حریص لوگ۔ عورت نشے اور دولت کے پیچھے بھاگنے والے، لپکنے والے علاقے کے پروردہ۔ تم خود کو کیسے ان سب سے اعلیٰ وارفع، مختلف اور پاک باز گردان سکتے ہو۔" اس کے ذہن میں ماما کی ٹھونسی سوچ اس منفی رخ پر لے جاتی جارہی تھی۔ مارے خفت کے برا حال ہو رہا تھا۔ اس سے اپنی کم ہمتی اور بزدلی پر رہ رہ کر تاؤ آرہا تھا ورنہ وہ اتنی بھی کمزور نہیں تھی۔

"مجھے برطانیہ ایک فون کرنا ہے۔" خود کو اور شاہ زر کو لعنت ملامت کرنے کا سلسلہ ملتوی کر کے وہ پھر اس بے رحم، سفاک اور پتھر ایسے وجود سے سر پھوڑنے کو تیار تھی۔

حسبِ عادت اس نے اس دفعہ مشعال کی بات پر کچھ نہیں کہا تھا بلکہ کان دھرنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی تھی۔ بے نیاز بنا اپنے اسی فرشی بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر سارہ ماں ارد گرد سے بالکل بے خبر گہری نیند سو رہی تھیں۔

"کروفر، بدتہذیب اور ان مینرڈ۔" اس کے "نوکیئر" والے انداز پر وہ اسے دل ہی دل میں گالیاں سناتی ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف لپکی۔ وہ ناک سیکڑتی نمبرز ڈائل کرنے لگی۔ اسے بار بار نمبر ڈائل کرتے اور الجھتے دیکھ کر شاہ زر اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ وہ کن اکھیوں سے اسے کچن کی جانب جاتے دیکھنے لگی۔

سنو! کہیں یہ ٹیلی فون سیٹ خراب تو نہیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچن میں گم ہوتا ‘‘ انتہائی بد تمیزی سے اس نے اسے پکارا تھا۔ اس کی پکار پر ایک منٹ کو رکا ضرور تھا لیکن پلٹ کر دیکھنے اور کوئی جواب دیئے بغیر وہ اندر گم ہو گیا۔ اسے اس کی اس حرکت پر اور غصہ آنے لگا۔

سمجھتا کیا ہے خود کو پرائم منسٹر کہیں کا۔'' وہ بڑے ضبط سے اس کی آمد کا انتظار کرنے ‘‘ لگی۔ پورے دس منٹ بعد وہ برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں موبائل تھا جسے مشعال کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔

یہ لوکل کنکشن ہے۔ باہر سے آنے والی کالز تو ریسیو کی جا سکتی ہیں لیکن بیرون ملک یا ‘‘ ایک جگہ سے دوسری جگہ کال نہیں کی جا سکتی ہیں۔ اپنی سہولت کے لیے میں یہ کارڈ اور موبائل استعمال کرتا ہوں۔'' اسی پتھر اور سخت لہجے میں بولا تھا۔ اسے تو اس کی بات میں ذرا بھی نرمی کی رمک دکھائی نہ دی تھی۔ وہ نظر انداز کرتی دوبارہ نمبرز ملانے لگی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد دوسری طرف سے جولف کی آواز سنائی دی تو وہ ہر بات بھلا کر بے اختیار خوش ہو گئی۔ حتیٰ کہ اکڑ فوں ڈھانسو اور قدامت پسند شخص کی موجودگی تک بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔

ہائے جولف! ہاؤ آر یو؟'' وہ بے پناہ خوش تھی۔ اس کی خوشی کا اظہار اس کی آواز کی ‘‘ کھنکھناہٹ اور چہرے سے پھوٹنے والی روشنی سے بھی ہو رہا تھا۔ شاہ زر چونک کر بغور اسے دیکھنے لگا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کی گفتگو کا اندازہ کرنے لگا۔ وہ گفتگو جو مشعال کے غصے سے سرخ چہرے پر اک نئی روشنی بکھیر رہی تھی۔ اس روشنی کی بدولت اس کا

سرخ و سفید چہرہ مزید گلنار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس روشنی کے عقب میں جھانکتا ایک اور تاثر اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ اس کی سماعتوں میں اتر رہا تھا۔ وہ بہت دھیمے اور ٹھہرے ٹھہرے انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔

"ریئلی آئی ٹو مس یو جولف۔" موبائل آف کرنے سے پہلے اپنی گفتگو کا اختتام اس نے اس جملے سے کیا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی لیکن شاہ زر کی ساری حسیات بہت زیادہ تیز ہو رہی تھیں جو مشعال کا یہ جملہ اس کے کانوں تک پہنچ گیا تھا۔ پھر واضح ہوتا مشعال کا چہرہ اس کی سوچوں کو بھی پراگندہ کر رہا تھا۔ اس کا دماغ منتشر ہو رہا تھا۔ وہ موبائل آف کر چکی تھی۔ اب شاہ زر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت حیران ہوئی۔

"تھینکس..." وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور بہت نپے تلے انداز میں اس کی طرف موبائل بڑھا کر صرف اتنا ہی کہہ پائی تھی۔ اسے سانس جو لینا دشوار تھا۔

"اگر کوئی غیروں کے دیس میں رہتے ہوئے اپنے وطن اور مٹی کے تقاضوں، روایات و نظریات کو فراموش کر بیٹھے اور غیروں کے طور طریقے اپنا لے تو وہ میری نظر میں سب سے بڑا غاصب، دھوکے باز اور بددیانت ہے۔ ایسے فراموش کے لیے کڑی سے کڑی سزا بھی کم ہے۔

وہ حیران ہوئی اس گل فشانی کا مطلب کیا تھا۔ وہ رک کر اسے دیکھتے ہوئے طنزیہ ہنسا۔

جانے دو بھلا تم کیا سمجھو گی انگریز پرست ! ویسے تم ہمیں ہماری زبان میں بھی شکریہ ’ ’
ادا کر سکتی تھی۔ خواہ مخواہ غیروں کا سہارا لیا۔“ وہ براہ راست اس پر بات کر رہا تھا۔ اس درجہ
ہتک آمیز لہجہ اور نظریں تھیں وہ احساس توہین کی شدید لپیٹ میں آ کر کاٹ دار نظروں سے
اسے دیکھنے لگی۔

یہ جولف صاحب کون حضرت ہیں؟“ خودسر‘ ضدی‘ جارح شخص سے وہ ہر قسم کی ’ ’
توقع رکھتی تھی لیکن امید نہ تھی کہ اس قدر جلدی ذاتیات پر اتر آئے گا۔

یہ میرا بالکل پرسنل معاملہ ہے اور ہر ایرے غیرے کے ساتھ شیئر نہیں کرتی۔“ ’ ’
زہریلی نگاہوں سے جواب دیتے ہوئے وہ اپنی طرف سے حساب بے باق کر کے جانے والی
تھی۔ جب وہ لمحہ بھر میں ڈگ بھر کر پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے مشعال کا راستہ
روک دیا۔ نتھنے سرخ پڑتے چہرے سمیت اس نے اس کا بازو پکڑ کر بے دردی سے اپنی طرف
کھینچ ڈالا تھا۔ وہ تو یہ سب توقع نہیں کر رہی تھی۔ مشعال کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ
وہ اس درجہ ہتک اور توہین آمیز جسارت پر اتر آئے گا۔ یک دم جھٹکا لگنے سے اس کی نگاہوں کے
سامنے جیسے زمین و آسمان گھوم گئے۔

اوہ... یو ایڈیٹ... ڈونٹ ٹچ می۔“ اپنے بازو کو اس کے گرم آہنی ہاتھوں سے نکالنے ’ ’
کی بھرپور ناکام کوشش کی۔

غیروں کے دیس میں رہتے ہوئے تم شاید یہ بھول رہی ہو کہ تم میری...'' وہ ایک دم سر اٹھا کر اسے گھورنے لگی۔ وہ اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں سفاکی سے دیکھتے رکا تھا۔ اس کے گھورنے کی مطلق پروانہ کرتے پھر بولا۔ ''تم میری منگ ہو' وہ بھی بچپن کی۔ منگ کا مطلب سمجھتی ہو ناں منگیتر۔ دوسرے لفظوں میں ہم جیسے لوگوں کے لیے عزت و غیرت اور ہم غیرت مند لوگ عزت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں لیکن یہ گوارا نہیں کرتے کہ ان کی عورت یوں سرعام بے حیائی کی مرتکب ہو۔'' شاہ زر بغور مشعال کے چہرے کو نظروں سے جانچ رہا تھا۔ جھیل سی گہری آنکھیں' کھڑی اونچی لمبی ناک' سفید ہونٹ' دہکتے رخسار' سرخی مائل حسین و دلفریب نین و نقوش سے سجا ساحرانہ مکھڑا تھا۔ دل کش متناسب سراپا' اونچا لمبا قد' ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ گہرا گریبان اور ٹراؤزر میں ملبوس کچھ دیر قبل والے ڈریس سے قدرے بہتر حلیئے میں تھی۔ کمر تک جاتے کالے سلکی بال اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اب شاہ زر کے بازو پر بھی ایک جانب سے لڑھک کر پھیل گئے تھے۔ بلاشبہ ایک زہد شکن سراپا تھا۔ شاہ زر کئی لمحے ڈوب کر ابھر ہی نہ سکا تھا۔

کس تعلق و رشتے کی بات کر رہے ہو تم۔ وہ تعلق جو میری ماما اسی دن ختم کر گئی تھی جس دن ہم نے تمہارا یہ ملک چھوڑا تھا۔ میں یہ تعلق اسی دن توڑ بیٹھی تھی جس دن میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ حیرت ہے تم ابھی تک اس بات کو ذہن میں رکھے ہوئے ہو۔ آئندہ حد میں رہ کر بات کرنا مجھ سے۔ میں اس لب و لہجے کی عادی نہیں ہوں اور نہ ہی آئندہ کبھی میں اپنی

ذاتیات میں تمہاری دخل اندازی برداشت کروں گی۔ مائنڈ اٹ... مسٹر شاہ زر جہانزیب۔"
ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہی تھی۔ چہرہ لال انگارہ ہو چکا تھا۔ شاہ زر نے اس کے للکارتے
اسٹائل پر بمشکل خود پر کنٹرول رکھا۔

مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں ہے تم جیسوں کو منہ لگانے کی اور یہ یاد رکھو تمہارے ’ ’
کہنے سے یہ تعلق ٹوٹ نہیں جائے گا کیونکہ یہ رشتہ میرے بڑے طے کر کے گئے ہیں۔ مجھے
ان کا ہر فیصلہ اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے اور جو بھی ان کی روایات یا کہے کو مٹانے کی
‘ ‘ ... کوشش کرے گا میں اسے ہی صفحہ ہستی سے مٹا دوں گا۔ سمجھیں

اچھا..." مشعال نے تمسخر اڑایا۔ "تمہارے بڑوں کے کہے گئے الفاظ اب میں توڑتی ’ ’
ہوں۔ بتاؤ کیا کر لو گے تم۔ مار دو گے مجھے..." غصے سے بے قابو ہوتے اس پر چلاتے ہوئے اپنا
نرم و نازک بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن لگتا تھا جیسے کسی آہنی شکنجے میں پھنس گیا ہو۔
مشعال کے دعوت دیتے نخوت آمیز انداز نے شاہ زر کی مردانگی پر ایک گہری چوٹ لگائی تھی۔
اندر باہر آگ بھڑکا دی تھی۔ جس کاٹ دار اور توہین آمیز انداز میں اس نے جوابی کارروائی کی
تھی۔ اس نے شاہ زر کے تن بدن میں وحشت بھر دی۔

کیا ہو تم... کس بات کا اتنا غرور ہے تمہیں؟ چاہوں تو میں ابھی ایک پل میں تمہارا یہ ’ ’
سارا طنطنہ و غرور توڑ کر رکھ دوں۔ چٹکیوں میں مسل دوں۔" وہ پوری سفاکی سے اس کے وجود
میں اپنی نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔ اندر تک اترتی نظریں۔ مشعال بچی نہ تھی جو اس کی بات کا

مفہوم نہ سمجھتی۔ وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی پھر ایک دم زخمی شیرنی کی طرح پھنکاری۔

اور ہے کیا تم لوگوں میں... تم اور کر بھی کیا سکتے ہو۔ جس علاقے سے تعلق رکھتے ہو اس کے لیے تو عورت اور نشہ ایک ہی زمرے میں آتے ہیں، تم سے تو توقع رکھنا ہی عبث ہے۔ اسی ماں کے بیٹے ہو ناں جس کا خاندان فحاشی و بے حیائی میں پیش پیش ہے۔" وہ بے خوف لہجے میں بول رہی تھی۔ اس کی بات نے شاہ زر کو ایک آخری چنگاری دکھائی۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا۔ مشعال کو اندر تک دہلا گیا۔ وہ لڑکھڑائی اور وہیں اس کے بستر پر گری تھی۔ بے بسی، احساس توہین، ذلت سے شاہ زر پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اگر سامنے مشعال نہ ہوتی تو اسے ماں کی گالی دینے والا اب تک ڈھیر ہو چکا ہوتا۔ وہ بے بسی سے وحشی ہو رہا تھا۔ یک دم اس کی جانب سے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مشعال لاکھ بے باک سہی پر دل خوف سے بند ہونے والا تھا۔

اٹھو اور جاؤ یہاں سے... آئندہ کسی مرد کو اس کی مردانگی کا طعنہ دینے مت بیٹھ جانا۔ اگر وہ مردانگی دکھانے پر اتر آیا تو نقصان سراسر تمہارا ہی ہو گا۔ اس کا کیا جانا ہے صاف مکر جائے گا۔" انتہائی درشت لہجے میں وہ رخ موڑے کہہ رہا تھا۔ اتنی وحشت تھی لب و لہجے میں وہ بھونچکا رہ گئی۔ اس نے کبھی بھی مرد کو اس درجہ جارحانہ وحشت بھرا مظاہرہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دم اٹھی تھی۔ بھاگ کر کمرے میں بند ہو گئی۔ ابیشا پر سکون سو رہی تھی۔ وہ وہیں

قالین پر بیٹھ کر گھٹنوں میں سر رکھ کر رونے لگی۔ شاہ زر کا لہجہ بچپن کی کوئی راکھ میں سلگتی چنگاری تھا جو وہ اس کے وجود میں دہکا گیا تھا۔

شاہو !... تم کیا سمجھتے ہو میں تمہارے ساتھ ہار جاؤں گی۔'' اپنے ہاتھوں بلکہ پورے جسم پر ایک ان دیکھا لمس محسوس کر رہی تھی۔ رخسار آگ کی طرح دہک رہا تھا وہ گال پر ہاتھ رکھے روتی رہی۔ وہ برطانوی فضاؤں میں پروان چڑھتے اپنے ہر احساس کو شکست دے چکی تھی لیکن اس اچھوتے لمس کو کبھی اپنی زندگی سے نکال نہیں پائی تھی۔ یہ احساس تو ہر لمحہ اس کے ذہن پر حاوی رہتا تھا۔ ایک ایک پل وہ اس لمس کی اسیر رہی تھی۔ اسی لمس کے ہاتھوں تو مجبور ہو کر وہ جولف کی طرف بڑھی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ محبت خود ہوتی ہے' یہ خود دل کی دھرتی سے یہ پودا سر نکالتا ہے' پنپتا ہے اور پھر پروان چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی آبیاری کے لئے کوئی کوشش' کوئی عمل' کوئی تجربہ نہیں کرنا پڑتا بلکہ جب یہ خودرو پودا دھرتی دل پر اگتا ہے تو خود اس انسان کو بھی احساس نہیں ہو پاتا جس کے دل میں یہ جذبہ پنپتا ہے اور جب انسان کو احساس ہوتا ہے تو وہ اپنی جڑیں بہت مضبوط کر چکا ہوتا ہے۔ وہ ننھا سا پودا تناور درخت بن جاتا ہے۔ اس کی کونپلیں ٹہنیوں کی صورت اختیار کر جاتی ہیں اور انسان اس جذبے کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے' جسے محبت کہتے ہیں۔ چار حروف پر مشتمل اس لفظ ''محبت'' پر کبھی کبھار وہ بہت الجھتی تھی۔ کبھی کبھار محبت کے اس فلسفے پر غور کرتے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ جولف سے سوچ سمجھ کر محبت کر رہی ہے اور جو سوچ سمجھ کر محبت کی جائے اسے محبت کے

سوا باقی سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ وہ اندر سے بہت پیاسی تھی۔ اس کے اندر تشنگی ہی تشنگی تھی۔ وہ ہونٹوں تلک پیاسی تھی اور اپنے اندر کی پیاس بجھانے کو جولف کی طرف بڑھی تھی۔ اسے اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی۔ دیوتا، محبوب، محبت اور محب سب کچھ اسے تصور کر لیا تھا۔

وہ بچپن کی اس سلگائی گئی چنگاری سے بچنے کے لیے روئے جا رہی تھی۔ زار و قطار۔ وہ اس احساس کو شکست دینا چاہتی تھی جس کی یاد برسوں بعد پھر شاہ زر اس کے دل کے ایوانوں میں تازہ کر گیا تھا۔

* * *

اگلے دن تقریباً دس کے قریب اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ سب اسے اٹھانے کی کوشش کر چکے تھے لیکن وہ اپنی مرضی سے اپنی نیند پوری کر کے اٹھی تھی۔ ایک بھرپور انگڑائی لے کر وہ بستر سے اتر آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے شیشے میں اپنی آنکھیں متورم اور سرخ سوجی ہوئی دیکھیں تو رات شاہ زر سے ہونے والی جھڑپ پوری سفاکی کے ساتھ ذہن کے پردے پر چمکنے لگی۔

مزید میں یہاں نہیں رک سکتی۔ گاؤں جاتے ہی پاپا سے واپسی کی بات کروں گی۔ ’’ ایک رات ہی خاصی اذیت ناک اور ناخوش گوار گزری ہے اور مزید مجھ میں ایسی راتیں گزارنے کا حوصلہ نہیں ہے۔‘‘ اپنا حلیہ درست کرتے ہوئے بھی وہ مسلسل ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔ وہ جب کچن میں آئی تو سارہ ماں نے خاموشی کے ساتھ اس کے سامنے ناشتہ لا رکھا۔ وہ بے دلی سے زہر مار کرتی رہی۔ ایشا سارہ ماں اور پاپا سے گاؤں کے متعلق پوچھ رہی تھی

جب کہ ماما نیوز پیپرز کا جائزہ لے رہی تھیں اور وہ دھانسوا سے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ ناشتہ کر کے جیسے ہی فارغ ہوئی ماما نے اسے تیار ہونے کو کہہ دیا۔ وہ سب گاؤں جانے کو تیار تھے۔ بس صرف اسی کے منتظر تھے۔ وہ سر ہلاتی اٹھ کر واپس اسی کمرے میں آگئی۔ شاہ زر کپڑے پہنے باتھ روم سے نکل رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر دروازے کی دہلیز پر ہی رک گئی۔ تلخ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسے نظر انداز کیے وارڈروب سے کچھ تلاش کرنے لگا پھر دروازہ بند کر کے اس کے پاس سے گزرتا باہر نکل گیا تھا۔ وہ بھی نخوت سے سر کو جھٹکتے بیگ کھول کر اپنے سب کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ سب کپڑے جینز، ٹراؤزرز اور شرٹس پر مشتمل تھے۔ ماما نے اس کے لیے کچھ شلوار قمیص لی تھیں لیکن اس نے ان کے منع کرنے کے باوجود اپنی پسند کے کپڑے پیک کیے تھے اور اب وہ پھیلائے ان کپڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی نگاہیں ریڈ کلر کی ٹائٹ سی جرسی شیپ کی ایک شرٹ پر ٹھہر گئیں۔ بظاہر کپڑوں کو دیکھ رہی تھی لیکن اندر تو جیسے ایک منتقمانہ سوچ پل رہی تھی۔ سب کچھ تہس نہس کر دینے والی سوچ۔

ہم غیرت مند لوگ اپنے عزت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں لیکن یہ گوارا ’ ’ نہیں کرتے کہ ان کی عورت یوں سرعام بے حیائی کی مرتکب ہو۔‘‘ اسے فیصلہ کرنے میں صرف ایک سیکنڈ لگا تھا۔ اگلے پل وہ ریڈ کلر کی شرٹ اور ہلکے بلیک کلر کی جین پہنے شیشے میں اپنا سراپا جانچ رہی تھی۔ ہاف بازوؤں سے بھی آدھے بازو، گہرا گلا، شرٹ اس قدر چھوٹی تھی کہ بمشکل اس کے تن کو ڈھانپ رہی تھی اور تنگ اس قدر تھی کہ لگتا تھا جیسے اس کے وجود

کے ساتھ لگا کر سی گئی ہو۔ شرٹ میں اس کا متناسب جسم بہت اچھی طرح نمایاں ہو رہا تھا البتہ جین بہ نسبت شرٹ کے کچھ معقول تھی۔ بہت نفاست سے اپنے چہرے کو میک اپ سے مزین کرنے لگی۔ بالوں کو ہمیشہ کی طرح کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بہت دل لگا کر اس نے میک اپ کیا۔ خود پر فراوانی سے پرفیوم اسپرے کیا تھا۔ اپنی تیاری کو آخری ٹچ دے کر وہ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی وہاں صوفوں پر پاپا، ماما اور ابیشا کے ساتھ اس "نک چڑھے" کو بیٹھا دیکھا تو اس کی بھنویں خود بخود تن گئیں۔

وہاں صوفوں پر موجود چاروں نفوس نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ ماما پاپا اسے اس لباس میں دیکھ کر احساسِ ندامت و شرمندگی سے چور ہو کر شاہ زر سے نظریں چرانے لگے۔ ابیشا فوراً اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی۔ اسے بازو سے پکڑ کر واپس دروازے کے پاس لے گئی۔

"یہ کیا پہن لیا ہے آپ نے؟ کوئی اور ڈریس نہیں تھا آپ کے پاس؟ ' '

کیا ہے ان کپڑوں میں...؟ اچھے خاصے تو ہیں۔" اپنے سراپے پر ایک طائرانہ نظر ڈال ' ' کر وہ مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ سب کے چہروں پر چھائی شرم و ندامت اس کے اندر کی پیاس کو بجھا رہی تھی۔ جیسے اس نے بغیر لڑے ہی شاہ زر سے اس کے تھپڑ کا بدلہ لے لیا ہو۔

مسٹر غیرت مند! کیا سمجھ کر تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میں اتنی کمزور نہیں ہوں جو ' ' اپنا دفاع نہ کر سکوں۔ تمہارا یہ سر نہ جھکایا اور تمہارے لیے سخت ثابت نہ ہوئی تو کہنا۔" اس کی زہریلی سوچیں اور زہریلی ہوتی جا رہی تھیں۔

“یہ برطانیہ نہیں ہے آپی! جہاں آپ جیسا بھی لباس پہن لیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم گاؤں جا رہے ہیں پندرہ سال بعد اور وہاں کے لوگ ہماری ایک ایک حرکت نوٹ کریں گے۔” وہ بہت دھیمی آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر پھر اس کے غصے کا گراف بڑھنے لگا۔

“سو واٹ! کیا پرابلم ہے ان کپڑوں میں؟ اور پلیز ابیشا! تم میری بڑی اماں مت بنی رہا کرو۔ مجھے عقل ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔” اس نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا لیکن وہ پھر بھی چپ نہ رہی آخر کو بہن کس کی تھی۔

“مشعال آپی! ہم گاؤں جا رہے ہیں۔” وہ تاسف وندامت سے دیکھ کر اسے یاد کرانے لگی۔

“آئی نو! ہم گاؤں جا رہے ہیں، میں نے نہیں کیا تھا کہ میں یہاں آؤں اور نہ ہی مجھے کوئی گاؤں جانے کا شوق ووق ہے۔ تم لوگوں کی ضد پر ہی میں یہاں آئی ہوں میرا اپنا ایک لائف اسٹائل ہے۔ اگر تم لوگ فیل کرتے ہو کہ میری وجہ سے تم لوگوں کی انسلٹ ہو رہی ہے تو تم پاپا سے کہو وہ مجھے میرا پاسپورٹ دے دیں میری واپسی کی ٹکٹ کنفرم کروا دیں میں آج ہی واپس چلی جاتی ہوں۔” ناک سکیڑ کر وہ قدرے برہمی سے کہہ رہی تھی۔ اپنی بات کا الٹ اثر دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔ ماما پاپا کے جھکے سر اسے بہت تکلیف پہنچا رہے تھے۔ وہ تو نہ ہی

مشعال کو اس کے موقف سے ہٹا سکتی تھی اور نہ ہی ماما پاپا کے لیے کچھ کر سکتی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

اوکے... جیسے آپ کی مرضی... لیکن اسکارف ضرور لے لیں پلیز میری خاطر۔ میرے پاس ہے۔ دیکھیں اسکارف آپ کو بہت سوٹ کرے گا۔" وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی وہ کوئی سخت سا جواب دینا چاہتی تھی لیکن اس کی روہانسی صورت دیکھ کر گردن اثبات میں ہلا گئی۔
ابیشا اس کی کمزوری تھی۔ اگر کبھی کسی کی بات مانی جاتی تھی تو وہ صرف ابیشا ہی تھی۔ ماما کو کچھ کہنے سننے کا اختیار اس نے سرے سے دیا ہی کب تھا۔ پاپا بھی اس سے ہر بات نہیں منوا سکتے تھے لیکن ابیشا کی ضد کے سامنے وہ ہمیشہ ہار جاتی تھی۔ ماما پاپا اس کی کمزوری سے آگاہ تھے اسی لیے جب وہ دونوں خود اس کی طرف سے ناامید ہوتے تو ابیشا ہی اس کے مقابل میدان میں اترتی تھی۔

اسکارف باندھ کر وہ ابیشا کے ہمراہ باہر نکل آئی۔ سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔ اب سب بیٹھ رہے تھے۔ وہ بھی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ماما پاپا اسے اسکارف میں لپٹے دیکھ کر قدرے پرسکون ہوئے تھے۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ شاہ زر کی جانب دیکھنے لگی جو تیز تیز ڈگ بھرتا گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔
سفید کلف دار سوٹ میں اس کی شخصیت کی اکڑ دیکھنے کے لائق تھی۔ سوٹ اگرچہ اس کے جسم

پر بے حد سوٹ کر رہا تھا لیکن اس کی اکڑ نے اسے اچھا خاصا بدمزہ کر دیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا تو وہ اس کی طرف سے نظریں ہٹا کر باہر کی جانب دیکھنے لگی۔

ایک گھنٹہ ان لوگوں کو شہر سے باہر نکلنے میں لگ گیا۔ گاڑی جیسے ہی شہر کے پر شور علاقے اور گاڑیوں کے بے ہنگم شور سے باہر نکلی تو وہ الرٹ ہو کر بیٹھ گئی۔ ارد گرد نظر آتے درخت، لہلہاتی و کھلکھلاتی گندم کی فصل اور ان سے دور بنے مٹی کے گھر، کھیتوں سے فصل کاٹ لی گئی تھی اور بہت سارا رقبہ ایسا بھی تھا کہ جہاں ابھی تک فصل کٹائی کی منتظر تھی۔ کھیتوں میں ہل چلاتے مرد، مٹی سے آلو چنتے بچے اور عورتیں کتنی جگہوں پر اسے یہ نظارہ دیکھنے کو ملا تھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ متوجہ رہی۔ ابیشا اور ماما نے چند ایک بار اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی جانب سے “ہوں ہاں” سے زیادہ جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ وہ مایوس ہو کر اگلی نشستوں پر بیٹھے پاپا اور شاہ زر سے باتیں کرنے لگیں وہ کوئی دھیان دیئے بغیر متواتر باہر کا جائزہ لیتی رہی۔ کھیتوں میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے بچے، کھیتوں اور ان گنت درختوں کے پیچھے نظارہ دیتے کچی و پکی اینٹوں سے بنے گھر بعض جگہ ان گھروں میں شان دار حویلیاں اور کوٹھیاں بھی دکھائی دے جاتی تھیں۔ اس کا ذہن بار بار پیچھے کی جانب سفر کر رہا تھا۔ وہاں جہاں وہ سب حویلی میں رہتے تھے۔ ایک گہری اور طویل سانس لے کر اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ نیم دراز ہو کر اس نے آنکھیں بھی موند لیں۔ کئی سین اور واقعات بند آنکھوں میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے چلے آئے۔

ئیء

مشعال! ہم آج ملکوں کی حویلی کے پیچھے بنا جو ”کھوہ“ ہے وہاں جا کر کھیلیں گی تم بھی ہمارے ساتھ چلنا۔“ اس کی سہیلیاں زرینہ اور ثمینہ کہہ رہی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ ملکوں سے ان لوگوں کی ہمیشہ سے سخت مخالفت چلی آ رہی تھی اور وہ کنواں بھی ملکوں کا ہی تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا خاندان کی بڑی خواتین جب اکٹھی ہو کر اکثر باتیں کرتیں بعض باتیں اس کے ناقص کانوں میں بھی پڑ گئیں اور ہمیشہ کے لیے ذہن کا حصہ بن گئیں۔

شاہ کمال سے بڑے شاہ جہانزیب اور چھوٹے شاہ رحیم تین بھائی تھے۔ ان کی صرف دو بہنیں تھیں۔ ایک سب سے بڑی تھیں اور ایک چھوٹی جس کا نام سبرینہ تھا۔ وہ بہت خوب صورت اور حسین وجوان لڑکی تھی۔ اس نے خاندان اور برادری کی عورتوں کو کہتے سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بلا کا حسن عطا کیا ہوا ہے۔ گائوں کے سارے نوجوان اسے دیکھ دیکھ کر اپنی کم وقعتی پر آہیں بھرا کرتے تھے۔ جس راہ سے بھی سبرینہ گزرتی تھی۔ لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ پھر ایک دن جب وہ اپنے باغ سے واپس حویلی کی طرف آ رہی تھی تو راستے میں اس کا ٹکرائو ملک ایاز سے ہو گیا تھا۔ ملک ایاز اور ملک جبار دو ہی بھائی تھے۔ دونوں ملکوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ملک ایاز نے سبرینہ کے حسن وجوانی کے بے پناہ قصیدے تو سن رکھے تھے اس دن جب حسن وجوانی کا پیکر مجسم دیکھا تو کئی لمحے نظریں پلٹنا تک بھول گیا تھا۔

گائوں میں اور ارد گرد کے دور دراز تک علاقے میں صرف دو ہی تو پارٹیاں تھیں ایک شاہوں

کی اور دوسری ملکوں کی۔ ملک ایاز نے اپنے والدین کو سبرینہ کے رشتے کے لیے بھیجا تھا۔ اس وقت اس کی صرف منگنی ہوئی تھی۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن شاہوں کا غیر برادری میں شادی کرنے کا قطعی رواج نہیں تھا۔ سو انہوں نے انکار کر دیا تو دونوں خاندانوں کے لیے رشتے سے انکار ان کا مسئلہ بن گیا۔ ایک روز دن دیہاڑے ملک ایاز نے سبرینہ کو راہ چلتے اٹھوا لیا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ برداشت نہ کر سکی اور ملکوں کی حویلی کے پیچھے بنے کنویں میں گر کر اپنی جان دے دی۔ شاہوں کے لیے سبرینہ کا اغواء اور پھر موت کوئی چھوٹی بات نہ تھی۔ عزت و غیرت کا معاملہ تھا۔ زندگی اور موت کا مسئلہ وہ ہر حال میں اپنی عزت پامال کرنے والوں سے بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن گاؤں کے معززین نے بیچ بچاؤ کروا کر پنچائیت بلوائی تو پنچائیت نے لڑکی کے بدلے لڑکی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ملک ایاز کی بہن ثریا بیگم سبرینہ کے تاوان کے عوض شاہ جہاں زیب کے نکاح میں آگئی۔ انہوں نے پہلے بھی ایک شادی کی ہوئی تھی۔ شاہ رحیم کی بات طے تھی اور شاہ کمال ان دنوں برطانیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں ہی یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ شاہ جہاں زیب نے اگرچہ ثریا بیگم سے نکاح کیا تھا لیکن اسے وہ مقام نہ مل سکا جو ان کے خاندان میں ایک عورت کو حاصل تھا۔ وہ شاہوں کے لیے ایک تاوان کے عوض آئی ہوئی عورت کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہ عورت جس کے بھائی نے ان کے خاندان کی عزت کے ساتھ کھیلا تھا وہ بھلا ان کے لیے کیسے قابلِ عزت ہو سکتی تھی۔

ثریا بیگم نے بہت کٹھن زندگی گزاری تھی' خاندان بھر کی نفرت سہتے سہتے وہ ہارنے لگی تھیں۔ پھر شاہ زر کی پیدائش کے موقع پر لامتناہی دکھوں کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے اس دنیا سے ہی کنارا کش ہو گئیں۔

ملکوں کو اپنی بہن کی بربادی کا بہت قلق تھا اوپر سے اس کی موت نے ان کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔ وہ بدلہ لینے کی فکر میں رہتے۔ وہ اس وقت کے انتظار میں تھے جب وہ شاہوں سے اپنی بہن کی موت کا بدلہ لے لیں۔ اسی لیے شاہوں کی لڑکیوں حتیٰ کہ بچیوں کو بھی اس راستے سے گزرنا منع تھا جو ملکوں کی طرف جاتا تھا اور اس کی یہ دونوں سہیلیاں ثمینہ اور زرینہ ملکوں کی برادری کی ہی لڑکیاں تھیں۔

....

“مشعال! تم نے بتایا نہیں کہ تم ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟” اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر زرینہ نے اس کا کندھا ہلایا تو اسے دیکھنے لگی۔

“نہ بابا نہ... میں تو نہیں جاؤں گی۔ پچھلی دفعہ جب میں ملکوں کے کنویں کے پاس کھیلنے گئی تھی تو دادا جان اور بڑے پاپا نے بہت ڈانٹا تھا پھر ماما کی سفارش پر دادا جان نے معاف کیا تھا۔”

“کچھ نہیں ہوتا۔ چلی چلو نا۔ سچی بہت مزہ آئے گا۔ سب لڑکیاں عورتیں بچے اور بوڑھے وہاں جمع ہوں گے اس دفعہ تو ملکوں نے وہاں میلہ لگوایا ہے۔ آج تو وہاں ”موت کا کھوہ“ کھیل

کھیلا جائے گا۔ ملک ایاز نے ہفتہ پہلے ہی سارا پانی نکلوا کر خشک کروایا ہے۔" دونوں بہنیں اس کی اچھی سہلیاں تھیں وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "موت کا کھوہ" دیکھنے کا لالچ دل میں اُمڈتا چلا آرہا تھا۔

' ' اچھا میں شاہو سے بات کروں گی وہ ساتھ ہو گا تو بڑے پاپا اور آغا جان کچھ نہیں کہیں گے۔" اس نے ان دونوں کو رضامندی دے دی تھی۔ پھر بڑی رازداری سے اس نے شاہ زر کو منایا تھا۔ در حقیقت اسے بھی آغا جان اور جہاں زیب شاہ کا ڈر تھا۔

' ' دیکھ لو کہیں پکڑے نہ جائیں۔" وہ رضامند ہونے کے باوجود ڈر رہا تھا۔

' ' کیا ہے شاہو! تم لڑکے ہو کر ڈر رہے ہو اور مجھے تو کوئی ڈر نہیں لگ رہا۔" وہ اسے جوش دلانے لگی تھی پھر اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا تھا۔ جیسے ہی شام اتری وہ دونوں باغ میں جانے کا بہانہ کر کے حویلی سے نکل آئے تھے۔ اسے تو "موت کا کھوہ" دیکھنے کا شوق تھا۔ بھاگتے' دوڑتے ملکوں کی زمینوں تک فاصلہ طے کیا تھا۔

میلے میں بڑی رونق تھی۔ تہمینہ اور زرینہ پہلے ہی اس کی منتظر تھیں۔ بوڑھے جوان بچے لڑکیاں بالیاں سب جمع تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ آس پاس کے کئی گاؤں کے لوگ بھی میلہ دیکھنے آئے تھے۔ وہ اور شاہ زر دونوں اکٹھے تھے۔ شاہ زر بہت سمجھ دار تھا۔ اس سے تین چار سال عمر میں بھی بڑا تھا۔

مشعال ! آج ملکوں کی حویلی کے اندر نذر نیاز تقسیم کی جائے گی تم بھی ساتھ چلنا۔" کھیل شروع ہونے میں ابھی بہت وقت تھا۔ زرینہ انتظار کی کوفت سے اکتا کر کہنے لگی۔ جواباً اُس نے شاہ زر کو دیکھا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"نہیں مشعال ! اب گھر چلو اماں بابا انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ اسے ٹال گیا تھا لیکن وہ حویلی کے اندر جانے کی ضد کرنے لگی۔

"مشعال ! تم سمجھتی کیوں نہیں... ہمارا ان کی حویلی کے اندر جانا ٹھیک نہیں، ویسے بھی بابا اور آغا جان ناراض ہوں گے۔" ضد، ہٹ دھرمی اور بغاوت تو جیسے مشعال کے خون میں رچی بسی تھی اس کے سمجھانے کے باوجود وہ دل ہی دل میں وہاں جانے کی ٹھان چکی تھی۔ وہ جو سوچتی تھی کر دکھاتی تھی اور بے چارہ شاہ زر ہر وقت اس کا باڈی گارڈ بنا رہتا تھا۔ کبھی کبھار تو اس کی موجودگی اس کے لیے تسلی بخش رہتی تھی اور کبھی وہ اس کی موجودگی سے چڑ جاتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شاہ زر جیسے ہی وہاں کی گہما گہمی میں کھویا وہ چپکے سے دونوں بہنوں کے ہمراہ ملکوں کی حویلی میں آگئی۔

وہاں واقعی بہت رونق تھی۔ حویلی کو قمقموں اور بتیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ حویلی کے صحن میں لائن میں دیگیں رکھی ہوئی تھیں۔ برآمدہ صحن، غریبوں، عورتوں اور بچوں سے بھرا پڑا تھا۔ برآمدے میں تخت پر بیٹھی ملکانی لوگوں کو نیاز بانٹ رہی تھی۔ وہ ابھی صرف نویں اور دسویں سال کے درمیان تھی لیکن اس کی اٹھان بہت اچھی تھی دیکھنے میں وہ بارہ تیرہ سال کی دوشیزہ

لگتی تھی۔ رنگ بھی گورا تھا تو قد بھی خاصا لمبا تھا۔ دیکھنے سے ہی پہچان ہو جاتی تھی کہ وہ شاہوں کی لڑکی ہے۔

وہ زرینہ اور اس کی بہن کے ساتھ ایک طرف کھڑی حویلی دیکھ رہی تھی۔ جب ادھر سے گزرتے ملک جبار اور ملک ایاز کی نظر ان لوگوں پر پڑی تھی۔ دونوں نے نظروں ہی نظروں ”میں تصدیق چاہی۔ “آیا یہ واقعی شاہوں کی لڑکی ہے۔

دونوں کے دلوں میں برسوں سے انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ وہ ہر وقت تاک میں رہتے کہ کب موقع ملے اور کب دشمنی پر اتریں۔ وہ تو شاہوں کی جانب سے ہاتھ ڈھیلا تھا جو ہر ہر موقع پر بچت ہو جاتی تھی' نہیں تو نجانے کب کی خون کی ندیاں بہہ چکی ہوتیں۔

اے لڑکی کیا نام ہے تمہارا؟” دونوں بھائی اس کے پاس آکر اس کا نام پوچھ رہے تھے۔ ان کی منتقمانہ نظروں کو محسوس کر کے وہ چپ رہی لیکن براہو جوان کے دوبارہ پوچھنے پر ثمینہ اور زرینہ نے بتا دیا۔

اچھا... جائو تم ادھر سے نیاز لے لو۔” مشعال کو نظروں کی گرفت میں رکھے دونوں کو جانے کا کہا تو وہ بھی ساتھ چلنے لگی لیکن ملک جبار نے اسے روک دیا۔

ملکوں کی حویلی میں آج شاہوں کی لڑکی آئی ہے۔ ارے او حمیدے...” اس نے اسے دیکھتے ادھر سے ہی کسی کو پکارا۔ فوراً ایک ملازم حکم کی تعمیل میں آ کھڑا ہوا۔ “ذرا شاہوں کی لڑکی کو باہر کا رستہ تو دکھائو۔” مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے اس نے ایک جاندار قہقہہ لگا کر ملازم

کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ ملازم نے آگے بڑھ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔ پھر اسے گھسیٹنے لگا۔ وہ چیختی رہ گئی۔ باہر لے جا کر وہاں کھڑی جیپ میں جیسے ہی اسے ڈالا کہیں سے اسے تلاش کرتا شاہ زر بھاگتا وہاں آگیا۔ کتنی ہی دور تک اس نے چلتی جیپ کا پیچھا کیا تھا پھر تھک ہار کر وہ اپنی حویلی کی طرف بھاگا تھا۔ وہ ایک خونریز جنگ تھی جو شاہوں اور ملکوں کے درمیان شروع ہوئی تھی۔ شاہ زر کے بروقت خبر کر دینے سے مشعال کو بچا تو لیا گیا تھا لیکن خون میں لت پت حالت میں، یہ بات ان لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھی، شاہوں نے ملکوں کی حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس لڑائی میں ملک ایاز اور اس کے کچھ بندے مارے گئے تھے۔ شاہوں کی جانب سے بھی شاہ رحیم اور چند ملازم قتل ہو گئے تھے۔ بظاہر فریقین کو برابر کا نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن ملک جبار اس لڑائی میں ٹانگوں پر گولیاں لگنے سے بالکل مفلوج ہو گیا تھا۔ اسے اور شاہ زر کو فوراً اسپتال لے جایا گیا تھا۔ ابھی ان دونوں کو مزید جینا تھا اسی لیے دونوں بچ گئے تھے لیکن عظمت بیگم جو اس گاؤں کی حالت، جہالت، ریت ورواج اور پابندیوں سے بیزار بیٹھی تھیں انہیں یہاں سے نکلنے کا معقول بہانہ مل گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کو خاندانی دشمنی کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتی تھیں جب ان کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا تو آغا جان کو ان کی بات ماننا پڑی تھی اور وہ شوہر اور بچیوں سمیت یہ ملک ہی چھوڑ گئیں۔ کبھی نہ آنے کے لیے۔

اسے کس کس بات کا دکھ نہ تھا۔ ایک طرف خود کے یرغمال بنائے جانے کا دکھ تھا تو دوسری طرف گاؤں چھوڑنے کا قلق تھا۔ وہ گاؤں جہاں اس نے اپنا سارا بچپن گزارا تھا۔ جہاں اس کے سب اپنے تھے۔ آغا جان، دادی جان، بڑے پاپا، بڑی امی اور ان کے بچے آذر بھائی زوبیہ، ماریہ، چچا رحیم شاہ کی بیوہ زینب چچی۔ ان کی تینوں بیٹیاں اور بیٹا تھا۔ جہاں شاہ زر تھا۔ اس کے بچپن کے سارے دوست یہیں رہ گئے تھے۔ شروع شروع میں وہ وہاں جا کر کچھ بھی بھولنے کو تیار نہیں تھی بعد میں اس نے خود کو وہاں ایڈجسٹ کر ہی لیا تھا۔ دادی جان اس دنیا سے رخصت ہوئیں ان کے بعد بڑے پاپا اور آغا جان بھی چل بسے۔ پاپا پاکستان تینوں دفعہ آئے تھے اس کے علاوہ وہ ہر چار پانچ سال بعد پاکستان کا چکر بھی لگاتے رہتے تھے لیکن ماما ہر دفعہ ایک دو تعزیتی فون کر کے رسم پوری کر لیتی تھیں۔

’’مشی آپی! سو گئی کیا؟‘‘ ابیشا نے اس کے کندھے کو چھو کر یادوں کے چنگل سے باہر لا پٹخا۔

’’ہوں... کچھ کہہ رہی تھی تم؟‘‘ وہ اس قدر بے طرح ماضی کی یادوں میں کھوئی تھی ابیشا کے کندھا چھونے پر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

’’کچھ نہیں... میں تو پوچھ رہی تھی کہ سو گئیں کیا لیکن آپ تو جاگ رہی ہیں۔ دیکھیں پاپا بتا رہے ہیں اب ہمارا گاؤں آنے والا ہے۔‘‘ ابیشا کے بتانے پر وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ کتنا طویل سفر تھا اور اسے یادوں میں کھوئے وقت بیتنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے احساسات بھی تو

عجیب ہو رہے تھے۔ برسوں بعد وہی یادیں دوبارہ تازہ ہو رہی تھیں۔ وہی کچے راستے رات کے وقت جگنوؤں کے پیچھے بھاگنا، سارا سارا دن باغ میں گھس کر کچی کیریاں اور کھٹے سیب آدھے آدھے کھا کر پھینک دینا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی زوبیہ آپی سے لڑنا تو کبھی آذر بھیا سے نت نئی فرمائش کرنا علیشا، عشاء اور نشاء تینوں کے ساتھ گھنٹوں "لکن" کھیلنا آغا جان کی ڈانٹ سننا اور دادی جان کا پیار کرنا سب کتنا اچھا لگتا تھا۔ وہ سب کچھ وہ انوکھی یادیں، سنہری پل، سب کچھ وقت کی روانی میں بہہ کر ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ سب یادیں رفتہ رفتہ باور ہو رہی تھیں لیکن اس کی مٹھی میں سب ایک ایک کر کے پھسلتی جا رہی تھیں۔ اس وقت کی ضدی، ہٹ دھرم اور ہمہ وقت بغاوت پر آمادہ رہنے والی مشعال اور آج کی اکھڑ، تند مزاج ضدی بدتمیز منہ پھٹ مشعال میں بظاہر کچھ فرق نہ ہونے کے باوجود زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت کی مشعال اپنے علاوہ دوسروں سے بھی محبت کرنا جانتی تھی لیکن آج کی مشعال ماضی کی تلخیوں کی بھینٹ چڑھ کر بہت خود غرض ہو چکی تھی۔ اس کے لیے صرف اپنا وجود ہی اہم تھا۔

اس کی نگاہیں بلاارادہ شاہ زر پر جا ٹکیں۔ یہ شخص کبھی بچپن میں اس کا فرسٹ کزن اور بیسٹ فرینڈ رہا تھا۔ بہت لڑنے کے باوجود وہ ہمیشہ اس کے ساتھ کھیلتی تھی۔ اپنی ساری خوشیاں اسی سے شیئر کرتی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جو ہر لمحے بچپن میں اس کی جانب رخ کیے رکھتا تھا۔ ہر غلط درست آرام سے کبھی لڑ جھگڑ کر سہہ جاتا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جب وہ خون میں لت پت جیپ میں پڑی ہوئی تھی تو اسے اٹھا کر باہر لایا تھا۔ اس کے خون میں لت پت وجود کو دیکھ کر اس کے

ساتھ لپٹ کر اس قدر بری طرح رویا تھا۔ اسے اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونا دیارِ غیر میں بھی یاد رہا تھا۔ اس نے اسے کبھی بھی روتے نہیں دیکھا تھا۔

اس دن جب ہر طرف گولیوں کی بوچھار تھی۔ اپنی بند ہوتی آنکھوں مختل حواسوں کے ساتھ اس نے شاہ زر کے آنسوئوں بھرے چہرے کو اپنے ہاتھوں پر سجے دیکھا تھا۔ وہ اس سارے معاملے میں خود کو الزام دے رہا تھا اور جب وہ آنکھیں بند کر رہی تھی تو اس نے اس کو بغیر کسی ہتھیار کے گولیوں کی بوچھاڑ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ ان لوگوں سے لڑنا چاہتا تھا جنہوں نے اس کی مشعال کو بری طرح لہولہان کر دیا تھا۔ اس نے اپنے وجود کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ جتنے زخم اسے لگے تھے۔ اس سے زیادہ اس نے اپنے وجود پر سہے تھے۔ جس قدر خون مشعال کے وجود سے بہا تھا اس سے دوگنا خون اس نے اپنے وجود سے بہا دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ آج اسے انتہائی قابلِ نفرت لگتا تھا۔ وہی شخص تھا جو اسے وطن سے چلے جانے کے بعد بھی اکثر فون کر کے کوئی بھولی بسری یاد اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ شاہ زر کی شخصیت میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ بن ماں کے بچہ ہر طرف سے محبتیں کشید کرنے کے باوجود بالکل تنہا و لاچار ہوتا تھا۔ اس کی ذات کے گرد ملکوں اور شاہوں کے ایک فیصلے کا جال بنا ہوا تھا۔ وہ اندر سے بالکل ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کی تنہائیوں کو محسوس کرتے ہوئے شاہ کمال نے عظمت بیگم کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کے ساتھ انتہائی مشفق و پدرانہ مہربان رویہ اپنائے رکھا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی نک چڑھی اور کچھ کچھ مختلف سی بیٹی کو بھی برسوں

اس کے نام سے منسوب رکھا تھا بلکہ برطانیہ جانے کے بعد بھی وہ ہر حال میں اس کی شادی اس شخص سے کرنا چاہتے تھے لیکن ماما درمیان میں آگئیں۔ وہ اسے اس جہالت میں نہیں دھکیلنا چاہتی تھیں جہاں سے وہ خود بڑی مشکلوں سے نکلی تھیں۔ اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے اپنے بھانجے کا انتخاب کیا تھا۔ دونوں ماما پاپا اپنا اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی نہیں تھے۔ دونوں خود کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کی ذات' اس کی خواہش تو جیسے نظر انداز ہو کر رہ گئی تھی۔ ماما پاپا کو جیسے وہ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ دونوں انے اپنی اپنی جنگ میں اسے بالکل فراموش کر دیا تھا۔ وہ کیا چاہتی ہے؟ کیا سوچتی ہے؟ کس سے شادی کرنا چاہتی ہے؟ انہوں نے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا تھا یہی وہ دور تھا جب اس نے دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے باہر کی راہ اپنائی تھی۔ پھر وہ' وہ سب کچھ کرتی گئی تھی جو اسے زیب نہیں دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے جولف کو اپنی زندگی میں داخل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کچھ ماما نے اس کے ذہن میں گاؤں والوں اور شاہ زر کے متعلق خوب زہر بھر دیا تھا لیکن اب گاؤں اور شاہ زر کی سب سے بڑی حمایتی ماما ہی تھیں۔ پچھلے کئی برسوں سے بڑی اماں فون اور خطوں کے ذریعے شاہ زر اور اس کی شادی کا کہہ رہی تھیں لیکن ماما نے ہر دفعہ انکار کر دیا تھا اور پھر جب اس کی زندگی میں جولف داخل ہوا تو اس نے شاہ زر سے خود بات کر کے اس تعلق کو ہی ختم کر دیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ رات ہونے والی جھڑپ اور شاہ زر کے رویے نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ اس کے کسی بھی قسم کے انکار کو نہیں مانا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح جان چکی تھی۔ مسلسل پچھلے کئی برسوں سے اس نے ماما پاپا کی روز بروز ہونے والی جھڑپوں کی

وجہ سے شاہ زر سے نفرت کرنا شروع کر دی تھی جس کا ذکر اس نے ماما پاپا کے تعلقات میں کشیدگی کی وجہ بن گیا تھا اور اب اسے جولف کی موجودگی میں اس کا نام بھی گوارا نہیں تھا۔ زندگی گزارنا تو دور کی بات تھی۔

ئ ء

وہ بے دھیانی میں کتنی دیر سے اس کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھی۔ بدستور گاڑی چلاتے شاہ زر نے بھی کئی بار بیک مرر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نظریں بدل کر باہر دیکھنے لگی۔ گائوں میں تقریباً ہر جگہ سے گندم کی کٹائی ہو چکی تھی۔ سوائے چند ایک کھیتوں کے۔ پورے دھیان سے وہ اس بدلے بدلے گائوں کا جائزہ لینے لگی۔ ان پندرہ سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ کچا راستہ اور کچی سڑک آگے جا کر پکی سڑک میں اور رستہ بھی بدل گیا تھا۔ وہ اپنی یاداشت کھنگالنے لگی۔ یہ راستے' یہ پکی سڑک اس کی یادوں میں کہیں بھی نہیں تھی۔ گائوں میں کلینک بھی تھا۔ ایک ہائی اسکول بھی اسے دکھائی دے گیا اور بھی کافی کچھ تھا توجہ نہ دے پائی۔ بس اس کی نظریں ایک جگہ پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔

پاپا! یہ... یہ ہمارا باغ ہے ناں...“ وہ بے قراری و بے چینی سے ان کو دیکھ کر پوچھنے لگی ’ ’ تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بے ساختہ شاہ زر کا کندھا ہلانے لگی۔ ”گاڑی روکو پلیز...“ اس کے کہنے پر شاہ زر نے بے اختیار پائوں بریک پر رکھے تھے۔ جیسے ہی گاڑی رکی' وہ بے اختیار باہر نکل آئی۔ اسے باہر نکلتے دیکھ کر پاپا بھی باہر آ گئے۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ چوکیدار نے

دونوں کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔ پاپا چوکیدار کے پاس رک گئے۔ وہ اندر باغ کے احاطے میں آ گئی۔ ہر طرف آموں اور سیبوں کے جھنڈ تھے۔ پیلے پیلے پکے آم دیکھ کر اس کے منہ سے پانی بھر آیا۔ چند قدم آگے بڑھی تو تازہ تازہ سیبوں کو دیکھ کر اس کا جی ایک دم للچانے لگا۔ ارد گرد دیکھنے پر اس کو تین چار کنکر مل گئے تھے۔ سیبوں کو ٹارگٹ بنا کر تاک تاک کر نشانے لگانے لگی۔ تین چار سیب زمین پر آ گرے تھے۔ وہ خوشی سے انہیں اٹھا کر آگے چلنے لگی۔ وہاں وہ درختوں کے درمیان لگا جھولا تھا جسے دیکھ کر اس کے قدم وہیں ساکت ہو گئے۔ جیسے کسی ان دیکھے وجود نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا ہو۔

''شاہو! میں گر جاؤں گی... نہیں کرو... شاہو آہستہ جھولاؤ...'' اس نے بری طرح آنکھیں میچ لیں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے لیکن پھر بھی آوازیں اس کے کانوں میں گھستی آ رہی تھیں۔ اسے جھولا جھولنے سے بہت خوف آتا تھا لیکن شاہ زر کو اس کا چیخنا ڈرنا ہمیشہ بہت لطف دیتا تھا۔ اسی لیے ہر چیخ کے ساتھ وہ اور زور سے اسے جھولا جھولانے لگتا پھر اچانک اس کے ہاتھ جھولے کی زنجیروں پر ڈھیلے پڑ گئے تھے اور وہ منہ کے بل زمین پر گر گئی۔ اس کے گھٹنے، بازو، ٹانگیں پاؤں، سب بری طرح چھل گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں پڑی چوڑیاں اسے بری طرح زخمی کر گئیں۔ شاہ زر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی قمیص سے صاف کرنے لگا۔

“دیکھو روؤ نہیں... میں نے جان بوجھ کر دھکا نہیں دیا تھا... پلیز چپ ہو جاؤ کسی کو کچھ نہیں بتانا نہیں تو میری تو خوب شامت آئے گی۔” اس کی بہتی آنکھوں میں جھانک کر وہ اس کے آنسوؤں کو صاف کر رہا تھا۔

“بیٹا! یہاں کیوں رک گئیں۔ آگے چلیں ابھی اس جانب امرود کے درخت ہیں اور اس جانب کینو کے۔” مالی بابا اسے بت بنے دیکھ کر آگے چلنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ حال میں لوٹ آئی۔ ایک تھکی تھکی سی سانس خارج کی۔ خود کو بری طرح سرزنش کی۔ یہی باتیں تھیں جو اسے بچپن میں بھی اور برطانیہ میں بھی چین سے رہنے نہیں دیتی تھیں اور وہ اب بھی بے چین ہونے لگی تھی۔ ایک دم بددل ہو گئی۔ اس پر جب بھی ایسی کیفیت طاری ہوتی تھی تو وہ ہمیشہ گھر سے باہر بھاگتی تھی بعد میں وہ ہمیشہ جولف کے پاس جاتی تھی۔ اسے گفتگو کرنے اور تسلی دینے کا ہنر آتا تھا۔ وہ شاہ زر کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا اور ہمیشہ وہ اس سے ملنے کے بعد قنوطیت سے نکل آتی تھی۔ آگے جانے کی بجائے وہ واپس آگئی۔ اسے گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر پاپا بھی چوکیدار کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

“تو پھر کیسا لگا ہماری بیٹی کو ہمارا باغ؟” پاپا اس کی طرف رخ موڑ کر بہت خوش دلی سے پوچھ رہے تھے ان کے اشتیاق کو نظر انداز کیے اس نے بے دلی سے کندھے اچکا دیئے۔

“لگتا ہے تمہیں پسند نہیں آیا۔” ان کا سارا جوش و خروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ انہیں ناامیدی ہوئی۔ وہ ایسی ہی تھی کسی کی خوشی کی خاطر بھی مصلحتاً جھوٹ نہیں

بول سکتی تھی۔ ایک سیب رومال سے صاف کر کے کھانے لگی۔ باقی تینوں ماما، پاپا اور ابیشا کو دے دیئے۔ حویلی تک پہنچتے پہنچتے اس کے ذہن میں کئی خیالات آ اور جا رہے تھے۔ وسیع و عریض شاندار ماربل کی بنی یہ حویلی قدیم و جدید امتزاج کی حامل تھی۔ پرانی حویلی کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ شاہ زر نے جیسے ہی گاڑی روکی کئی لوگ ان کے استقبال کو گیٹ پر ہی جمع تھے۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد اندر داخل ہوتے ہی کئی لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

استقبالیہ پر سب سے آگے جو خاتون تھیں اسے پہچاننے میں اسے چند سیکنڈ لگے تھے۔ وہ آذر بھائی کی والدہ اور شاہ زر کی سوتیلی ماں بڑی امی تھیں۔ ان کے پیچھے چچا رحیم کی بیوہ چچی زینب تھیں۔ ان سے ملنے کے بعد وہ کاریڈور میں داخل ہو گئے۔ وہاں لاؤنج کے دروازے پر تین چار لڑکیاں قطار باندھے کھڑی تھیں۔ ماما پاپا کو سلام کرنے پر دونوں نے ان کو پیار دیا تھا۔ وہ بھی انہیں دیکھنے لگی۔ ابیشا اس کے ہم قدم تھی اس کے لیے یہ سب کچھ حیران کن تھا۔

کون ہیں یہ... آپ تو جانتی ہوں گی؟" وہ اس کے کان میں آہستہ سے پوچھنے لگی۔ اس ’ ’ نے نفی میں سر ہلایا پھر خود ہی آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروانے لگی۔

"ہیلو... آئی ایم مشعل، اور یہ میری بہن ابیشا کمال۔ ’ ’

ہیلو..." ان تینوں لڑکیوں نے بھی ان دونوں سے ہاتھ ملایا۔ ’ ’

میں علیشا ہوں یہ والی عشاء اور یہ نشاء ہے۔" چچا رحیم کی سب سے بڑی بیٹی اس کی ہم عمر علیشا نے اس کو اپنا اور اپنی بہنوں کا تعارف کروا رہی تھی۔ اس نے سر ہلا دیا۔ ان سے تعارف کے مرحلے کے بعد وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ چند لمحوں میں وہ سب ان سے گھل مل گئی تھیں البتہ مشعال کا انداز لیا دیا سا تھا۔ وہ ابیشا کی طرح فوراً بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر پائی تھی۔ آذر بھائی کی دونوں بہنیں زوبیہ اور ماریہ اپنے اپنے بچوں سمیت حویلی میں ہی موجود تھیں۔ ان دونوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ بس تعارف رسمی سا تھا۔ آذر بھائی کی بیوی شگفتہ بھابی بھی بہت خوش مزاج وخوش اخلاق خاتون تھیں۔ وہ ایک طرف بیٹھی سب کو دیکھتی رہیں کبھی کوئی مخاطب کرتا یا سوال پوچھتا تو وہ بس "ہوں ہاں" سے زیادہ جواب نہیں دے پائی تھیں۔ تعارف اور خاطر مدارت کے مراحل کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے کمروں میں آ گئیں۔ سب کے سب بہت باوقار اور ملنسار تھے۔ لہجوں میں خوش اخلاقی' حلاوت اور محبت کی چاشنی سموئی ہوئی تھی۔ صرف ان سب میں ایک شخص تھا جو مختلف تھا۔ غصہ جواب بھی ناک پر رکھے اس پر کبھی کبھار نظر ڈال لی تھی۔ وہ سر جھٹک کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ پہلے کی نسبت اب حویلی بہت ہی خوب صورت پر شکوہ' پرتعیش اور لگژری آسائشات کی حامل ہو گئی تھی۔ انٹیریئر ڈیکوریشن اور نکاسی آب تک ہر چیز بہت جدید تھی۔ حتیٰ کہ فرنیچر بہت ہی ماڈرن واعلیٰ و قیمتی تھا۔ وہ گھوم گھوم کر سارہ کمرہ دیکھتی رہی۔ اس قدر وافر مقدار میں روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ وہ سراہے بغیر نہ رہ سکی۔ کمرے کا جائزہ لے کر مطمئن ہو کر وہ بستر پر گر سی گئی۔ رات بھی ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی۔ ٹینشن اڑنچھو ہو گئی اور پھر اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ کب

آنکھ لگی تھی اور کب وہ نیند کی وادیوں میں جا کھوئی تھی۔ نیند کی وادیوں میں کھوئی شام تک سوتی رہی۔ مغرب سے کچھ پہلے وہ کپڑے تبدیل کر کے اچھی طرح فریش اپ ہو کر باہر نکلی تو ہر طرف ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ بچوں کے شور اور چیخ و پکار پر وہ خود بخود باہر صحن کی جانب چلی گئی۔ چار پانچ بچے صحن میں رکھی کرسیوں کے گرد بھاگ رہے تھے۔ وہ دلچسپی سے بچوں کا کھیل دیکھنے لگی۔ پاس ہی ٹیبل پر کوئی اس کی جانب سے رخ موڑے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا پھر جیسے ہی اس نے میوزک آف کیا تمام بچے کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ صرف ایک لڑکی رہ گئی تھی۔ جس کے لیے بیٹھنے کو اب مزید کوئی کرسی نہ تھی۔ سو اس کو ایک کرسی سمیت باہر کھڑا کر دیا گیا تھا اور پھر اب دوبارہ وہی گیم کھیلا جا رہا تھا اور یہ گیم تین چار دفعہ ریوائنڈ ہوا تھا۔ آخری دفعہ جب میوزک آف ہوا تو دونوں بچوں میں لڑکی تیزی سے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ساتھ ہی بچے شور مچانے لگے تھے۔

''عینی جیت گئی... عینی جیت گئی۔'' کھیل ختم ہوتے ہی اس کی دلچسپی بھی یک دم مفقود ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑتی ٹیبل پر بیٹھے لڑکے نے رخ موڑ کر اسے دیکھا اور یقیناً اس کا دھیان مشعال کی طرف بچوں نے ہی کروایا تھا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس آ کر رک گیا۔

''آپ مشعال آپی ہیں ناں... کمال چچا کی بیٹی۔'' وہ اس کے لیے بالکل اجنبی و ناشناسا تھا۔ اس کے پوچھنے پر اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

میں اسامہ ہوں...آپ کے چچا رحیم کا بیٹا..." اس نے اپنا تعارف کروایا۔ تو وہ اسے ’ ’ دیکھنے لگی۔ سب بالکل بدل گئے تھے۔ وہ ہر ایک کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔

اوہ... ہیلو... نائس ٹو میٹ یو۔" دھیمے سے ہنسی کے جلترنگ بجاتے اپنا ہاتھ اس کی ’ ’ طرف بڑھا دیا۔ جسے اس نے مسکراتے تھام لیا۔

ایکچوئلی ایف ایس سی کے امتحانات سے فراغت کے بعد میں کراچی اپنے ماموں جان ’ ’ کے ہاں گیا ہوا تھا۔ گھنٹہ بھر پہلے واپس لوٹا ہوں۔ باقی سب سے مل چکا ہوں آپ استراحت فرما رہی تھیں اس لیے آپ سے ملاقات نہ ہو پائی۔" وہ نوعمر سا لڑکا بہت خوش اخلاقی سے بتا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے بخوبی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس سے مل کر بہت خوش ہوا ہے۔

جیسا میں نے آپ کے متعلق سنا تھا اس سے بڑھ کر حسین و جمیل پایا ہے۔ آپ بتائیں ’ ’ ہم کیسے لگے آپ کو۔" وہ خوش دلی سے اسے کرسیوں کی جانب لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔ جب سے وہ آئی تھی اب کھل کر ہنسی تھی۔ وہ حیران ہوئی

بس بہت اچھے ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا یہاں آنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ اسی لیے آپ لوگوں کے متعلق کوئی خاص خیال و تصور بھی نہ تھا البتہ بچپن کی کچھ یادیں تھیں اگر ان کو سامنے رکھ کر تمہیں پہچاننے کا دعویٰ کرتی تو تم بالکل ریجیکٹ ہو جاتے۔" اس کی بات پر اب اسامہ مسکرایا تھا۔ بچے اب دوسری طرف جا کر کھیل رہے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ہی کرسی پر

بیٹھ گئی۔ وہ اپنی ایجوکیشن، مشغلے اور معمولات کے بارے میں بتانے لگا جنہیں وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

آپ بہت کم بولتی ہیں۔” کافی دیر تک مسلسل بولتے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا تو وہ ’ ’ چپ ہو گیا۔

ارے نہیں... بالکل بھی نہیں۔ میں تو بہت باتونی ہوں۔ فی الحال تمہیں سن رہی ’ ’ ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں میں کتنا بولتی ہوں۔ اگر تمہاری جگہ جولف ہوتا تو وہ کہتا کہ مشعال تم بہت بولتی ہو۔” اچانک اس کے منہ سے جولف کا نام نکل گیا۔ ویسے بھی اس وقت اسے جولف کا ہی خیال آ رہا تھا۔ دونوں زیادہ تر وقت اکٹھے ہی گزارتے تھے اور اس سرمئی شام کو چہار سو پھیلتے دیکھ کر وہ بظاہر اسامہ کی طرف دھیان دیئے ہوئے تھی لیکن دل ہی دل میں جولف سے محوِ گفتگو تھی۔

یہ جولف کون ہیں؟” وہ بے تکلفی سے پوچھنے لگا۔ ’ ’

تم کچھ زیادہ پرسنل نہیں ہو رہے ہو؟” اس کی بے تکلفی پر اس نے اسے ٹوک دیا۔ ’ ’ وہ خاموش ہو گیا۔ بعد میں اس نے ایک دو باتیں بھی کی تھیں لیکن تکلف کے لبادے میں لپٹی ہوئیں۔ وہ بور ہونے لگی پھر اس سے معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سارے لان کا چکر لگانے لگی۔ حویلی کے پچھلی جانب وہ جا کر رک گئی۔ حویلی میں بہت کچھ بدلا تھا لیکن پچھلا حصہ بالکل ویسا ہی تھا۔ وہی شہتوت کا درخت، وہی سنگی بینچ اور اس کے ساتھ وہی دیوار تھی۔ جب

رات کا اندھیرا ہر سو پھیلنے لگتا تھا تو سب بچوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ اکثر وہ لوگ سنگی بینچ سے درخت اور درخت سے دیوار تک کا سفر طے کر کے باہر چھلانگ لگا دیتے تھے اور پھر جگنوؤں کے تعاقب میں وہ سارے کھیت کھنگال ڈالتے' ادھر سے ادھر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ وہ وہیں سنگی بینچ پر درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ بچپن کی یادوں سے ہوتا ہوا ذہن پھر سے جولف کی طرف چلا گیا۔ اس کے خیال سے وہ پھر آسودہ ہونے لگی۔

پتا نہیں وہ اس وقت کیا کر رہا ہو گا۔ اسلامک اکیڈمی کیا ہو گا یا نہیں۔" آنکھیں بند کر ’ ’ کے ہر طرف سے بے خبر اسے سوچتے صرف ایک ہی سوال ذہن میں ابھر رہا تھا۔ میری طرح یقیناً وہ بھی اداس ہو رہا ہو گا اور پھر روز کی طرح اپنی اداسی شیئر کرنے سی سائیڈ چلا گیا ہو گا۔ ساحل کے کنارے کھڑے ہو کر مجھے یاد کر رہا ہو گا یا پھر میری طرح کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ مسلسل صرف مجھے ہی سوچ رہا ہو گا۔ اپنی سوچ اسے خود بھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ واقعی اس قابل تھا کہ وہ اس کے لیے اداس ہوتی۔ کتنی دیر تک وہ صرف اسے سوچتی رہی اور پھر اپنی سوچ سے آسودگی حاصل کرتی رہی یہاں تک کہ اسے ڈھونڈتی علیشا حویلی کے پچھواڑے چلی آئی۔ اسے آپ ہی مسکراتے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں تھی۔ وہ سوچنے لگی آیا اسے ڈسٹرب کرے یا نہیں۔ دم بدم بڑھتی رات کا اندھیرا ہر سو پھیلا ہوا تھا وہ اس کی طرف چلی آئی۔

مشعال ! آپ یہاں بیٹھی ہوئی ہیں اور ادھر ساری حویلی آپ کی گمشدگی کی رپورٹ ’ ’ درج کروانے کے لیے ہلکان ہو رہے ہیں۔" علیشا کی مذاق کے رنگ میں کہی گئی بات پر وہ آنکھیں کھول کر حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اس وقت وہ مکمل طور پر جولف کی ساحرانہ باتوں کے حصار میں مقید تھی لیکن یہ حصار

تم تو کہہ رہی تھی کہ تم بڑی امی سے اجازت لے کر آئی ہو۔" اس نے کچھ تلخی سے ’ ’ پوچھا۔

جی ہاں بڑی امی کی اجازت سے ہی آئے ہیں لیکن شاہ زر بھیا قطعی لا علم ہیں۔" اس ’ ’ کے اندر کی ضدی، ہٹ دھرم اور بغاوت پر آمادہ رہنے والی سرکش لڑکی یہ سن کر پھر ضد پر آئی تھی۔

تم دونوں جائو۔ میں تھوڑی دیر بعد آتی ہوں۔" ان دونوں نے رخ موڑ کر ان کی ’ ’ طرف ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اٹل انداز پر وہ دونوں چونک گئیں پھر اس کے سرخ چہرے کو دیکھا۔

لیکن مشعال !" علیشا نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ’ ’

تم جائو۔ میں باغ دیکھ کر ابھی آتی ہوں۔" باغ اس جانب سے کافی دور تھا بلکہ متضاد ’ ’ سمت میں واقع تھا لیکن وہ علیشا کے منہ سے شاہ زر کے متعلق جان کر ضد پر اتری ہوئی تھی۔ علیشا اور ابیشا اس کے دوٹوک اور فیصلہ کن انداز کو دیکھ کر رہ گئیں۔

☆…☆…☆…☆…☆…☆…☆

کھانے پر سب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔‘‘ اس کی حیران نظروں کا جواب دے کر وہ ’ ’ واپس پلٹ گئی تو اسے بھی چاروناچار اس کی تقلید کرنا پڑی۔ وسیع و عریض ڈائننگ ٹیبل تھی۔ چاروں جانب کرسیاں ہی کرسیاں تھیں۔ اور ان کرسیوں پر براجمان ان گنت لوگ۔ وہ دروازے پر ہی رک گئی۔ اس ڈائننگ روم میں بھی بہت زیادہ تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ پہلے اسی کمرے میں ایک لمبی سی فرشی نشست بچھی ہوتی تھی اور سب کے بچے بڑے آرام سے بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے۔

رک کیوں گئیں بیٹا! آئو اندر آ جائو۔ کہاں تھیں تم اتنی دیر سے؟‘‘ اس کا لیا دیا سا انداز ’ ’ سب کو ہی تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا اسے دروازے پر ہی رکتے دیکھ کر بڑی امی خود آگے بڑھ کر اسے اندر لے آئیں۔

بڑی امی! یہ شہتوت کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔‘‘ علیشہ نے انہیں بتایا تو ’ ’ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

نہیں بیٹی‘ اس وقت‘ جب رات ہو جائے تو درختوں کے نیچے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ رات ’ ’ کے وقت سانپ اور جن پریت وغیرہ بسیرا کر لیتے ہیں۔ آئندہ رات کے وقت ادھر نہیں جانا۔‘‘

ان کی نصیحت پر اس نے بھنویں اچکا کر اور کچھ الجھ کر ماما، پاپا کی طرف دیکھا پھر خود ہی آگے بڑھ کر ابیشا کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی تو بڑی امی شگفتہ بھابی کو پکارنے لگیں۔

”جائو بہو! آذر اور شاہ زر کو بھی کھانے پر بلالو۔ ’ ’

وہ خاموشی سے پلیٹ پر جھک گئی تھی۔ تھوڑے سے چاول ڈال کر کھانے لگی جب اس کی نظر ڈائننگ روم کے دروازے سے اندر داخل ہوتے آذر اور شاہ زر پر پڑی۔ دونوں بھائی ایک ہی طرح کے گرے کلف دار سوٹ میں ملبوس اور کالے رومال کندھوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں رومال کندھوں پر رکھنا نجانے کیسا فیشن تھا۔ وہ قدرے حیران ہوئی۔ اس اکڑے اور جاگیردارانہ حلیئے میں بھی وہ کل والے شاہ زر سے بالکل مختلف نہ تھا۔ جس کے چہرے پر خشونیت و سرد مہری ہمہ وقت طاری رہتی تھی۔ بلکہ مشعال کو دیکھ کر تو دوچند ہو جاتی تھی۔ اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی کرسی گھسیٹ کر بالکل سامنے بیٹھا اس نے اس کا چہرہ دیکھ کر دل ہی دل میں سنا دیا۔

مشعال بیٹا تم کچھ لے ہی نہیں رہیں۔ یہ شامی کباب چکھو۔ میں نے بطور خاص تم ’ ’ لوگوں کے لئے بنوائے ہیں۔“ اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈال کر کھاتے دیکھ کر انہوں نے ٹوک دیا پھر اس کی طرف شامی کباب کی ڈش بڑھائی تھی۔

شکریہ آپ تکلف مت کریں، دل چاہا تو میں خود لے لوں گی۔“ وہ سب لوگ بہت ’ ’ اچھے تھے، بہت محبت، حلاوت اور مٹھاس بھرے لہجے میں مخاطب تھے لیکن وہ چاہتے ہوئے

بھی اپنے لہجے پر کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی ان کو جواب دیتے ہوئے بھی زبان میں تلخی سمٹ آئی تو وہ خاموش ہو گئیں۔ ماما پاپا اور ابیشا نے اس کو اس بدسلوکی پر خشمگیں نظروں سے لتاڑا۔ جنہیں وہ منہ بنا کر نظرانداز نہ کر پائی تھی۔ جلدی جلدی پلیٹ میں موجود چاولوں کے چند دانے حلق میں اتار کر پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو سب نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اسے مزید ایک منٹ بھی اپنا یہاں رکنا محال لگنے لگا تھا۔

مشعال ! تم نے کچھ کھایا ہی نہیں۔ بیٹھو میں تمہارے لئے سویٹ ڈش لاتی ہوں۔" ’ ’ شگفتہ بھابی ساس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر اسے روکنے لگیں۔

نہیں ! شکریہ آپ زحمت نہ کریں۔ میں کھا چکی ہوں۔" اسے ناگواری نے بری طرح ’ ’ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہ کیا کوئی اپنی مرضی سے کھا پی بھی نہیں سکتا۔

مشعال ! بیٹھ جاؤ اچھی طرح کھانا کھاؤ۔ تم نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں لیا تھا۔" پاپا ’ ’ کے کہنے پر اسے مزید غصہ آگیا آیا۔

ایم سوری پاپا، میں نے کہا میں کھا چکی ہوں، اگر بھوک لگی تو بعد میں کچھ کھا لوں ’ ’ گی۔" ناگواری و بیزاری اپنے لہجے سے چھپا نہیں سکی تھی۔ ویسے بھی اسے مصلحت آتی ہی کب تھی۔ پاپا کو جواب دے کر دروازے کی جانب قدم بڑھا لئے۔

مشعال بہت بدل گئی ہے بھائی صاحب' بچپن میں تو یہ ایسی نہ تھی۔" باہر نکلتے ہوئے ’ ’ اس نے زینب چچی کو کہتے سنا تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ یہ ریمارکس اسے اس کے انگریز ٹائپ حلئے پر دیا گیا تھا یا پھر اس کی اس تلخ مزاجی پر۔

چچی جان ! یہ ایسی ہی تھی' آپ لوگوں سے غلطی ہو گئی کہ آپ سمجھ ہی نہ سکے تھے۔ ’ ’ ورنہ ضد' ہٹ دھرمی اور بغاوت تو پہلے بھی اس کے خون میں رچی ہوئی تھی اب تو صرف اپنا اثر دکھا رہی ہے۔" شاہ زر کی تلخ طنزیہ آواز نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ وہ زخمی ناگ کی طرح بل کھا کر رہ گئی۔ اپنا سارا غصہ کمرے میں جا کر زور سے دروازہ بند کرنے میں اتارا۔ پھر جو چیز بھی ہاتھ لگتی گئی تھی وہ تہس نہس ہوتی گئی تھی۔ اس پر قنوطیت کا دورہ پڑ چکا تھا۔ جواب مشکلوں سے ہی اترنا تھا۔

///

اگلا سارا دن اس نے سوتے جاگتے اپنے کمرے میں واک مین کانوں سے لگائے گانے سنتے گزارا تھا۔ ابیشا اور ماما دونوں نے اسے ایک دو دفعہ کمرے سے باہر نکلنے کو کہا تھا لیکن اس کا رویہ بہت ہتک آمیز تھا۔ دونوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی۔ تینوں وقت کا کھانا ابیشا اس کے پاس لے آئی تھی اس نے صرف دوپہر کو کھایا تھا۔ وقتاً فوقتاً بڑی امی' چچی زینب' بھابی' زوبیہ' ماریہ' علیشہ' عشاء' نشاء سب آ کر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی رہی تھیں لیکن مشعال کا رویہ اس قدر برا اور مایوس کن تھا کہ سب نے ایک دفعہ آ کر دوسری مرتبہ

کمرے میں داخل ہونے کی زحمت نہیں کی تھی۔ رات نو بجے کے قریب ابیشا کے پر زور اصرار پر کمرے سے باہر نکلی تھی۔ سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں باتوں اور ٹی وی دیکھنے میں مگن تھے' اسے بھی ابیشا کی ضد کی وجہ سے ان کے ساتھ جا کر بیٹھنا پڑا تھا۔ اس کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر پہلے تو سب نے خاص توجہ دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی طرف سے "نو کیئر" کا انداز محسوس کر کے سب اپنی باتوں میں دوبارہ مگن ہو گئے۔ وہ ایک طرف بیٹھی خاموشی سے "نیوز" دیکھنے لگی۔ اچانک لاؤنج کے کونے میں پڑے ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف دھیان گیا تو جولف کو فون کرنے کا سوچ کر ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف آ گئی۔ چند منٹوں بعد اس کی جولف سے بات ہو گئی تھی۔ وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ سب نے اسے فون کے ساتھ لگے حیران ہو کر دیکھا تھا۔ لیکن جانتی صرف ابیشا ہی تھی کہ وہ کس سے بات کر رہی ہے۔

جولف سے بات کرنے کے بعد اس کا موڈ ایک دم خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس نے جولف کو بتا دیا تھا کہ وہ یہاں بہت زیادہ ان ایزی فیل کر رہی ہے۔ اسی لئے بہت جلد واپس آ رہی ہے۔ اپنے پروگرام سے ماما پاپا کو آگاہ کرنے کی غرض سے ان کے کمرے میں چلی آئی۔ لیکن وہاں شاہ زر' آذر بھائی کو پاپا کے ساتھ سر جوڑے دیکھ کر حیران ہوئی۔ دوسری طرف بڑی امی' چچی زینب اور ماما بھی کسی ایسی ہی پوزیشن میں تھیں۔ اسے دیکھ کر سب نے اپنی نشست بدلی تھی۔ وہ ان سب کو یوں اکٹھے دیکھ کر الجھ گئی۔

آئو مشی بیٹا! آئو بیٹھو۔‘‘ پاپا خوش ہوئے تھے کہ قنوطیت کا دورہ ختم ہو گیا ہے۔ اور وہ ’ ’ بھی کمرے سے باہر نکلی ہے۔

‘‘...پاپا! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ اگر آپ میری بات سن لیں تو ’ ’

ہاں کہو...‘‘ انہوں نے تو جیسے باقی لوگوں کو دیکھا ہی نہیں تھا وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ ’ ’ سب کے سامنے تو وہ یہ حماقت نہیں کر سکتی تھی۔

نو پاپا‘ ابھی آپ بزی ہیں‘ میں پھر آ جائوں گی۔‘‘ فوراً کمرے سے باہر نکل آئی۔ کافی ’ ’ دیر تک برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رہی۔ جب یقین ہو چلا کہ وہ لوگ چلے گئے ہیں اور پاپا اس کی بات سننے کو بالکل فارغ ہوں گے تو وہ واپس ان کے کمرے میں آ گئی تھی۔

ہاں بولو کیا کہنا چاہتی تھی تم؟‘‘ اسے سامنے بیٹھتے دیکھ کر پاپا مکمل طور پر اس کی ’ ’ طرف متوجہ ہو گئے۔

پاپا! میں برطانیہ واپس جانا چاہتی ہوں آپ کی خواہش پر میں یہاں آ تو گئی تھی لیکن ’ ’ پاپا میں اب مزید یہاں نہیں رک سکتی۔ پلیز آپ میری سیٹ کنفرم کروا دیں۔‘‘ مشعال کا انداز اٹل تھا۔ جس میں کسی بھی قسم کے ردوبدل کی گنجائش نہیں تھی۔ پاپا محسوس کر کے کچھ سوچنے لگے۔ جبکہ ماما بار بار پہلو بدل رہی تھیں۔

ہوں تو تم واپس برطانیہ جانا چاہتی ہو۔‘‘ پاپا نے ہنکارا بھرا وہ سر ہلانے لگی۔ ’ ’

’ ’ کیوں تم برطانیہ جانا چاہتی ہو' کیا ہے وہاں' کس کے لئے تم جانا چاہتی ہو؟" ماما نے تیزی سے پوچھا۔ وہ عجیب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

’ ’ جب پندرہ سال پہلے یہاں سے واپس گئی تھیں تو اس وقت میں نے تو یہ سوال نہیں کیا تھا کہ آپ کیوں جانا چاہتی ہیں؟ کس کے لئے آپ واپس جانا چاہتی ہیں؟ کاش اس وقت میں آپ سے یہ سوال کر لیتی تو آج آپ مجھ سے یہ سوال نہ کر رہی ہوتیں۔" مشعال نے کہہ کر عظمت بیگم کو لاجواب کر دیا تھا وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

’ ’ پھر بھی آپ بھول رہی ہیں۔ وہاں آپ کا پورا میکہ آباد ہے۔ آپ کی بہنیں' بھائی' بھاوجیں' رشتہ دار سب وہاں آباد ہیں پھر بھی آپ مجھ سے سوال کر رہی ہیں آپ انہی لوگوں کے پاس گئی تھیں ناں تو پھر میں بھی چلی جاؤں گی اسی طرح مجھے بھی علم ہو جائے گا کہ جن کی آپ ساری عمر مداح رہیں وہ لوگ مجھے قبول کرتے ہیں یا نہیں۔"

’ ’ مشعال! حد میں رہ کر بات کرو' مت بھولو یہ ماں ہیں تمہاری۔" پاپا نے اسے ٹوک دیا۔ "فی الحال تم کہیں نہیں جا رہیں۔ کوشش کرو کہ یہیں رہنے کی عادت ڈالو۔ اور اب جاؤ تم۔" وہ فیصلہ کر کے رخ موڑ گئے وہ تاسف و حیرانگی سے سر ہلانے لگی۔ پاپا کس قدر کٹھور لگ رہے تھے' جن کی خاطر وہ یہاں تک آ گئی تھی وہ اپنے وعدے سے مکر رہے تھے۔

نو پاپا نو، میں اب مزید یہاں نہیں رک سکتی۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں چند ’ ’ ہفتے رہ کر دیکھ لوں پھر میں جو فیصلہ کروں گی وہ آپ کو ماننا پڑے گا۔" وہ ان کو ان کا وعدہ یاد دلا رہی تھی۔

او کے مشعال، میں سوچوں گا ابھی تو تم ریلیکس ہو جاؤ۔ چند ہفتے ٹھہر جاؤ۔ بعد میں ’ ’ "خود میں سارے انتظامات کر دوں گا۔

تھینکیو پاپا تھینکیو سو مچ۔" وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ "اب آپ اپنے وعدے پر قائم ’ ’ رہیئے گا۔" ان کے ہاتھوں کو تھام کر وہ کہہ رہی تھی ماما مزید.برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

تم وہاں اس لئے جانا چاہتی ہو کہ تم اس عیسائی جولف سے شادی کر لو۔" ماما کے کہنے پر ’ ’ وہ چپ ہو گئی۔ جب بولی تو لہجے میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

"ہاں میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ’ ’

یہ جانتے بوجھتے کہ وہ ایک عیسائی نوجوان ہے اور تم ایک مسلمان لڑکی۔" پاپا نے بھی ’ ’ حصہ لیا۔

جی پاپا، اس کے باوجود میں اس سے شادی کروں گی۔ کیونکہ میں اس سے وعدہ کر چکی ’ ’ ہوں اور جہاں تک اس کے عیسائی ہونے کا تعلق ہے تو پاپا میں نے آپ کو آگاہ کیا بھی تھا کہ "وہ اب مسلمان ہونا چاہتا ہے۔

”تمہاری خاطر، تاکہ تم سے شادی کے بعد وہ پھر اپنے مذہب کی طرف لوٹ جائے۔ ’’

نہیں پاپا! آپ لوگ اسے نہیں سمجھ پائے۔ وہ میری خاطر مسلمان نہیں ہونا چاہتا ’’ بلکہ وہ اسلام کی حقانیت و صداقت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ پاپا! آپ یقین کریں ابھی اس نے باقاعدہ اسلام قبول نہیں کیا، کلمہ نہیں پڑھا لیکن پاپا وہ ہم مسلمانوں سے زیادہ اسلام میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ سب برائیاں چھوڑ چکا ہے۔ وہ ہمارے اسلام، ہمارے قرآن کے بارے میں جاننے کے لئے روز اسلامی لیکچر اٹینڈ کرتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میری اس سے بات ہوئی ہے وہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے لیکچر لے کر ہی آیا تھا۔ پاپا! وہ بہت مختلف لڑکا ہے۔ وہ عام نوجوانوں جیسا نہیں ہے۔ یقین کریں اگر مجھے اس سے شادی ہی کرنا ہوتی تو پاپا ہم دونوں بہت پہلے کر چکے ہوتے۔ میں آپ کو اس کے متعلق کچھ نہ بتاتی یہ بھی نہیں کہ وہ ایک یہودن ماں اور عیسائی باپ کا بیٹا ہے۔ میں چاہتی تو آپ سے بہت کچھ چھپا سکتی تھی۔ کورٹ میرج کر لیتی لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور یہ سب نہ کرنے کی ترغیب مجھے جولف ہی نے دی تھی۔ نہیں تو آپ کی یہ بیٹی کب کی شادی کر چکی ہوتی۔ ہاں یہ سچ ہے پاپا! میں نے اس سے شادی کرنے کی شرط ہی مسلمان ہونا رکھی ہے اور مجھے یقین ہے وہ دن دور نہیں جب وہ مسلمان ہو جائے گا۔ وہ صرف مجھ سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ میرے بارے میں بہت سنسیئر ہے ویسا ہی جیسے میں اس کے لئے سنسیئر ہوں۔ اور اب اگر میں واپس نہ لوٹی تو پاپا! وہ بہت ڈس ہارٹ ہو گا۔ آپ نہیں جانتے جب میں ان برائیوں کی طرف قدم بڑھانے

لگی تھی تو اسی جولف نے مجھے اس گندگی سے بچالیا تھا۔ میری رہنمائی کی تھی میرا ہاتھ تھام کر مجھے ان برائیوں کی طرف بڑھنے سے روکا تھا جو برطانیہ جیسے معاشرے کا طرہ امتیاز ہیں پھر بھی یہ سب جاننے کے باوجود وہ آپ کو اچھا نہیں لگتا تو پھر میں آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ میں اسی سے شادی کروں گی بلکہ میری تو خواہش ہے آپ لوگوں کی رضامندی سے اور آپ کی موجودگی میں اس سے شادی کروں لیکن آپ راضی ہی نہیں ہو رہے۔ اگر آپ راضی ہو جائیں تب بھی اگر نہیں تب بھی میں واپس ضرور جاؤں گی کیونکہ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں اور آپ ' اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو میں ایک دفعہ فیصلہ کر لیتی ہوں پھر کبھی بھی اس سے پھرا نہیں کرتی۔ آپ اچھی طرح غور ضرور کیجئے گا۔" اپنی بات کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔

ماما پاپا خاموش تھے ' تھوڑی دیر تک ابیشا اور دوسرے لوگوں میں بیٹھی رہی۔ ان لوگوں کی گفتگو بہت انٹرسٹنگ تھی وہ غور سے سننے لگی۔ کسی شادی کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں سب لڑکیاں سر جوڑے کپڑے سامنے پھیلائے شادی کا ذکر کر رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی ان لوگوں کے پاس بیٹھی وہ سب محتاط ہو کر بولنے لگیں۔ کئی باتوں سے اس نے ان لوگوں کا محتاط انداز نوٹ کر لیا تھا۔

یہ لوگ میری موجودگی میں ان ایزی فیل کر رہی ہیں۔ میرا یہاں سے چلے جانا ہی ' ' بہتر ہے۔" کسی کے سر پر زبردستی مسلط رہنے کی اسے کبھی بھی خواہش نہیں رہی تھی۔ اگر اسے علم ہو جاتا کہ کوئی اس کے بارے میں نیگیٹو سوچ رکھتا ہے تو وہ ان سے زیادہ منتقمانہ سوچ

اپنا لیتی۔ خواہ اس بات سے اس کی اپنی ذات ہی ڈس ہرٹ ہو۔ شاید اسی لئے برطانیہ میں اتنے سال گزارنے کے باوجود اس کی کزنز وغیرہ سے بالکل نہیں بنی تھی۔ ان سب کے نزدیک وہ موڈی پرائوڈ اور نجانے کیا کیا مشہور تھی۔ اسے بہت برا لگتا تھا اسی لئے اس نے کبھی خود سے ان سب سے ملنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کسی نے اس کا وہاں سے آ جانا محسوس نہیں کیا تھا بلکہ سب نے اس کے چلے آنے پر شکر ادا کیا تھا کہ خواہ مخواہ وہ سب اس کی موجودگی میں محتاط ہو گئی تھیں۔

///

اگلا دن بہت خوشگوار تھا۔ صبح ہی صبح وہ ایشا اور علیشہ باہر کھیتوں کی سیر کو نکل آئی تھیں۔ تقریباً ہر کھیت گنجا نظر آ رہا تھا۔ کتنے سارے کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔

’’گندم کی کٹائی ہو گئی ہے اب کھیتوں کو دھان کی پنیری اگانے کے لئے تیار کیا گیا ہے جب پنیری اگ آئے گی تو دھان کی فصل کاشت کرنے کی تیاریاں شروع ہو جائیں گی۔‘‘ علیشہ کھیتوں میں موجود پانی کے متعلق بتانے لگی۔ کچے راستوں اور پگڈنڈیوں پر وہ دونوں بہنیں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھیں جبکہ علیشہ عام سے انداز میں ہی چل رہی تھی جیسے اس کے قدموں کے نیچے ہموار زمین ہو۔ کبھی وہ دونوں بہنیں بھی علیشہ کی طرح ہی ان کھیتوں میں چلتی، پھرتی، بھاگتی دوڑتی تھیں۔ آج انہی کھیتوں کو دیکھنے کے لئے انہیں علیشہ کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ کافی دور تک چلنے کے بعد وہ دونوں تھک ہار کر ایک اونچی پگڈنڈی پر بیٹھ

گئیں۔ علیشہ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر کسی کھیت میں جا گھسی تھوڑی دیر بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں دو تین سورج مکھی کے پھول تھے۔

سورج مکھی کے بیج کھائیں گی؟" آتے ہی وہ ان سے پوچھنے لگی وہ تو خاموش رہی البتہ ابیشا نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"کیوں نہیں۔ لیکن ان کو تو پہلے بھونا جاتا ہے پھر بیج چنتے ہیں۔

ہاں... گھر جا کر میں پہلے آپ کو یہ بھون کر دوں گی پھر کھائیں گے بہت مزا آئے گا۔" اس نے اپنے دوپٹے میں پھول ڈال لئے تھے۔ وہ دونوں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کافی دور تک جانے کے بعد وہ واپسی کے راستے پر ہو لیں۔

یہ سارے کھیت، یہ ساری زمینیں یہ سب ہماری ہیں۔ ابھی تو آپ نے کچھ نہیں دیکھا ارد گرد کے گائوں میں بھی ہماری بہت سی زمینیں ہیں جو دور تلک پھیلی ہوئی ہیں۔ دو باغ ہیں پھلوں والے، فارم ہائوس ہیں، فش اور پولٹری فارم ہیں یہ دونوں فارم گائوں کے مغرب میں ہیں۔" راستے میں چلتے چلتے وہ دونوں کو معلومات بھی مہیا کرتی جا رہی تھی۔ درمیان میں دو راستے آتے تھے۔ علیشہ جب دوسرے راستے کی طرف مڑنے لگی تو اس نے روک لیا۔

"علیشہ اس راستے سے چلتے ہیں۔

لیکن مشعال یہ راستہ تو..." وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

یہ راستہ ملکوں کے محلے کی طرف جاتا ہے۔" بہت سی یادیں ابھی اس کے ذہن میں ’ ’ تازہ تھیں۔ "چلو آئو ادھر سے چلتے ہیں۔" اس نے واقعی اس راستے کی طرف قدم بڑھا لئے تھے۔ جبکہ وہ دونوں وہیں کھڑی رہ گئیں۔

ہم اس راستے پر نہیں جا سکتے۔" علیشہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ کچھ اس کا رنگ بھی متغیر ’ ’ ہو چکا تھا۔

کیوں...؟ ابھی بھی اتنے برس گزر جانے کے بعد شاہوں کی لڑکیوں کو ملکوں کی ’ ’ "طرف سے خطرہ لاحق ہے۔

نہیں... خطرہ تو نہیں ہے' اب وہ پہلے سے حالات نہیں رہے ہیں۔ بہت کچھ بدل گیا ’ ’ ہے۔ لیکن اب شاہوں کی لڑکیاں بہت محتاط ہو گئی ہیں۔ وہ کوئی دشمنی مول نہیں لے سکتی ہیں۔ پہلے ہی ان کے کندھوں پر اس نام نہاد دشمنی کا بہت خون جما ہوا ہے۔ اس خاندان کی دو جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ مزارعے جو قتل ہوئے وہ علیحدہ۔ اب تو ہمارے پاس اس دشمنی کی بھینٹ چڑھانے کو کچھ نہیں بچا۔" وہ بات کرتے کرتے افسردہ سی ہو گئی۔ اس کی خوبصورت احمریں آنکھوں میں آنسوئوں کے موتی چمکنے لگے۔ وہ واپس آ گئی اور خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ابیشا بھی علیشہ کے دکھ پر غمگیں سی ہو گئی۔ افسردہ تو وہ خود بھی تھی' کچھ زخم تو اس کے بھی ہرے ہوئے تھے۔ کتنا سارا راستہ ویسے ہی خاموشی کی نذر ہو گیا۔

"علیشہ جب ہم چلے گئے تھے تو کیا ملکوں نے بعد میں بھی کوئی جھگڑا وگڑا کیا تھا؟ ’ ’

اسے پرانی یادیں تازہ کرنے کا جنوں سا سوار ہونے لگا۔ وہ افسردگی سے ہنس دی۔

نہیں مشعال! ملکوں کے ہاں بعد میں لڑائی جاری رکھنے کے لئے کوئی باقی نہیں بچا تھا۔ ’ ’ کتنے سالوں تک یہ کیس کورٹ، کچہریوں میں چلتا رہا، اور پھر آخر میں فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا۔ ملک ایاز قتل ہو گیا تھا، ملک جبار کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ زندگی سے بالکل کٹ کر رہ گیا۔ زندہ ہونے کے باوجود مردوں جیسی زندگی ہو گئی تھی۔ باقی رہ گئی تھی ملکوں کی عورتیں اور بچے اور وہ بیچاری عورتیں بھلا کہاں تک کیس کی پیروی کرتیں۔ سو ہر طرح سے حقائق ہمارے حق میں راہ ہموار کرتے گئے۔ ملکوں کی عورتیں اور باقی بچ جانے والے لوگ صلح جو تھے، انہوں نے صلح کی درخواست کی۔ ہم نے البتہ صلح تو نہ کی کیس واپس لے لیا۔ ملک کیس اور ملک ایاز کے قتل ہو جانے کی وجہ سے اجڑ کر رہ گئے تھے۔ جو تھوڑا بہت بچا وہ خاموشی سے سمیٹ کر ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب ایک نئی نسل جوان ہے۔ بوئی ہوئی فصل اب نئے سرے سے لہلہا کھلکھلا رہی ہے سنا ہے ملک ایاز کا بڑا بیٹا دوبارہ اس حویلی میں آباد ہوا ہے اور اب دوبارہ اس گاؤں میں ملکوں کا ذکر چلنے لگا ہے۔ اب دیکھیں وقت کیا رخ بدلتا ہے۔

’’ملک صہیب ملک ایاز کا ہی بیٹا ہے اور کسی بھی طرح اپنے باپ سے کم نہیں ہو گا۔

اور یہ شاہ زر کیا یہ اپنے ننھیال والوں سے ملتا جلتا ہے، میرا مطلب ہے کبھی تو ملاقات ’ ’ ہوتی ہو گی آخر کو اس کی ماں ملکوں کی ہی تو بیٹی تھی۔’’ اس کی بات پر وہ چونک گئی۔

نہیں... جہاں تک ہماری معلومات میں ہے وہ کبھی بھی ان لوگوں سے ملنے نہیں گئے حتی کہ کتنی دفعہ ملکوں نے خود کوشش کی لیکن وہ اس معاملے میں بہت سخت اور روایت پسند ہیں جب تک بڑے بابا زندہ تھے ان کی حاکمانہ اور سخت گیر شخصیت ہر طرف چھائی رہتی تھی' ان کی وفات کے بعد شاہ زر بھائی نے ان کی جگہ لے لی۔ ویسے ہی سخت گیر غصے والے' ہر وقت جنگ وجدل کو تیار اور کچھ کچھ سفاک بھی ہیں۔ ملکوں اور شاہوں کے خون نے مل کر ان کے خون میں کوئی اور ہی طاقت بھر دی ہے۔ وہ ڈبل خون ہیں جہاں حق کی بات ہوتی ہے اڑ جاتے ہیں۔ پھر کوئی لاکھ سر پٹخے' کچھ بھی کر لے وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی نہیں ہٹتے۔ بڑے بابا اور آغا جی (دادا جان) کے بعد انہوں نے یہ زمینیں خود سنبھالنا چاہیں لیکن ان کی طبیعت اور غصے کو دیکھتے ہوئے آذر بھیا نے سارا کنٹرول خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شروع شروع میں انہیں اس بات پر دکھ بھی ہوا تھا انہوں نے اپنے شک کا اظہار بھی کیا تھا کہ ہمیں ان پر اعتبار نہیں لیکن یہ بات نہیں وہ بہت جلد آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی ان کی طبیعت سے خائف رہتا ہے۔ جبکہ شاہ زر بھیا کی نسبت آذر بھائی' میں تحمل و برداشت زیادہ ہے۔ ان کا ذہن بہت جلد باریک بینیاں دیکھ لیتا ہے جبکہ شاہ زر بعض اوقات جلد بازی اور اپنی نیچر کی بدولت نقصان اٹھا لیتے ہیں۔ اسی لئے بڑے بھیا نے انہیں گائوں سے دور ہی رکھا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ ان کی طبیعت' ذات میں موجود خامیاں ختم ہو سکیں۔ آذر بھیا نے الیکشن لڑے تھے اور پھر بہت شاندار طریقے سے کامیاب بھی رہے ہیں اب وہ اس سارے علاقے بلکہ ارد گرد کے گائوں کے ناظم ہیں جبکہ شاہ زر بھائی سی ایس ایس کا امتحان کلیئر کرنے کے بعد

اسی علاقے میں جاب کرتے تھے۔ شروع شروع میں وہ یہیں رہے لیکن ان کی طبیعت کی وجہ سے ہر دوسرے روز ایک نیا مسئلہ کھڑا ہونے لگا۔ انہیں چیلنج قبول کرنے میں مزا آتا ہے۔ لیکن ان کی حق پرستی ہمارے لئے باعث آزار بنتی جارہی تھی کہہ سن کر اور مل ملا کر آذر بھیا نے ان کی پوسٹنگ کروادی اب تقریباً دو سال ہونے کو ہیں وہ لاہور سائیڈ میں چلے گئے ہیں۔ وہاں بھی مسئلے مسائل کھڑے تو ہوتے رہتے ہیں لیکن اب وہ ان مسائل کو اپنی ذات تک ہی رکھتے ہیں۔ اب تو کافی بدل گئے ہیں لگتا ہے شہر کی ہوا انہیں راس آنے لگی ہے۔ ان کی شخصیت میں پہلے والی جولانی و طغیانی ابھی ختم تو نہیں ہوئی لیکن پہلے جیسی شدت پسندی بھی نہیں رہی۔”

کتنی بھولی ہو تم علیشہ! اس نے اپنے گرد چولا ضرور چڑھالیا ہے لیکن بدلا نہیں۔ وہ اب بھی ویسا ہی ہے کرخت و سفاک۔ میں ایک رات میں ہی اس کے اندر کا چھپا سفاک انسان دیکھ چکی ہوں۔” وہ نخوت و تحقیر سے سوچنے لگی۔ اسے شاہ زر کی سفاک آنکھیں نہیں بھول پارہی تھیں۔ ”شاہ زر اسسٹنٹ کمشنر ہی ہے نا؟“ اچانک وہ پوچھنے لگی۔

”جی ہاں... اسسٹنٹ کمشنر کی جاب کرلی۔

علیشہ کی باتیں سنتی وہ دوبارہ ملکوں کی حویلی کے متعلق سوچنے لگی پھر سر جھٹک کر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ وہ تینوں جیسے ہی کھیتوں سے نکل کر سڑک پر چڑھیں اور دور کھڑے شاہ زر اور آذر کو کسی شخص سے باتیں کرتے دیکھ کر رک گئیں فاصلہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"لو جی اب خیر نہیں ہے۔ شاہ زر بھیا کی باتیں سننے کے لئے خود کو تیار کر لیں۔ "

کیوں...؟ وہ کیوں باتیں کرے گا؟" اسے علیشہ کی بات ذرا بھی پسند نہ آئی تھی۔

آپ کچھ نہیں جانتیں مشعال! وہ کتنے سخت اور اصول پسند ہیں اس معاملے میں۔ آپ تو برطانیہ چلی گئیں لیکن حویلی کی لڑکیوں پر باہر نکلنے کی پابندی لگ گئی حتیٰ کہ ٹیوٹرز اور ٹیچرز حویلی میں آکر لڑکیوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ آغا جی تو کچھ تحمل مزاج تھے لیکن بڑے بابا بہت سخت تھے۔ اور شاہ بھیا تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ کبھی بھی کسی لڑکی کو بے کار حویلی کی دہلیز سے باہر دیکھ لیں بہت خفا ہوتے ہیں۔ بڑے بابا کے بعد یہ زیادہ تر شہر میں رہتے تھے۔ پہلے تعلیم کی غرض سے اور اب جاب کی وجہ سے اسی لئے آذر بھیا کی وجہ سے کچھ سہولت ہو گئی ہے۔ میں نے جو انگلش میں ماسٹر کیا ہے وہ حویلی میں ہی رہ کر پرائیویٹ کیا ہے جبکہ نشاء اور اسامہ ان کے ساتھ لاہور میں ہی رہ کر پڑھے ہیں۔ عشا اور شاہ میر کراچی رہ کر پڑھ رہے ہیں۔" وہ ان لوگوں کی طرف دیکھتے آہستہ آہستہ بتا رہی تھی۔

وہ دونوں اسے بے چارگی سے دیکھتی تیز تیز قدم اٹھاتی واپس حویلی والے راستے کی طرف چلی گئی تھیں جبکہ وہ واپس اسی راستے کی طرف لوٹ آئی جہاں کچھ دیر پہلے علیشہ نے قدم رکھنے سے انکار کیا تھا اور اس نے علیشہ کی آنکھوں میں ان چمکتے موتیوں کو محسوس کرتے قدم واپس موڑ لئے تھے۔ پہلی دفعہ بھی اس نے شوق و ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر نقصان اٹھایا تھا اور اب بھی وہ پھر صرف انا اور ضد کی خاطر دوبارہ انہی راستوں پر چل دی تھی جو دشمنی کے خون سے

رنگے ہوئے تھے۔ جن راستوں کو تصور میں رکھتے ہوئے اس نے پندرہ سال نفرت کی تھی۔ اپنے وجود کی تلاش میں ہلکان ہوتی رہی تھی۔ کچھ تلاش کرتے کرتے وہ خود کو بھی کھو بیٹھی تھی۔ اب لگتا تھا جیسے وہ ان راستوں میں کچھ تلاش کرنے آئی ہو۔ محبت، بچپن، عزت، غیرت، انا، ضد، شوق، جنون، ولولہ نجانے کیا کچھ کھو گیا تھا۔ اسے تو لگتا تھا وہ پندرہ سالوں سے بے مقصد گھوم رہی ہے۔ نگری نگری، بستی بستی، گوشے گوشے، نجانے وہ خود کہاں تھی۔ اسے کچھ علم نہیں تھا۔

ڈھونڈتے ڈھانڈتے وہ ملکوں کے "کھوہ" تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں کھڑی دو عورتیں کنوئیں سے پانی نکال کر اپنی بھینسوں کو پلا رہی تھیں۔ جب اس پر نظر پڑی تو نگاہوں میں حیرت سمٹ آئی۔ وہ دونوں عورتیں حیران ہو کر اس کی خوبصورتی سے زیادہ اس کی جوانی اور حلیئے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے پائوں میں سفید جوگرز تھے۔ وہ لکی اسکن کلر کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور بلیک ٹراؤزر پہنے ہوئے تھی۔ البتہ اسکارف گلے میں رسی کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں عورتیں اسے دیکھ کر ایک دوسرے سے سر جوڑ کر باتیں کرنے لگیں۔ اسے بہت اچنبھا ہوا وہ خاموشی سے کنوئیں کے جنوب کی طرف بنی تنگ و تاریک گلی میں گھس گئی۔ کافی تلاش بسیار کے بعد اسے ایک گھر مل ہی گیا تھا۔ اس ٹوٹے پھوٹے گھر کے دروازے پر دستک دیتے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ انتظار کرنے لگی۔ چند منٹ بعد ایک بوڑھی عورت باہر آئی تھی۔ اپنے

گھر کے سامنے ایک ”شہری میم“ کو ایستادہ دیکھ کر وہ جس قدر حیران ہو سکتی تھی وہ حیران ہوئی۔

”آپ زرینہ کی والدہ ہیں؟“ عورت کی اشتیاق بھری نظروں سے جھجکتے ہوئے وہ اس سے پوچھنے لگی تو اس نے سر ہلا دیا تھا۔

”میں مشعال ہوں... شاہ کمال کی بیٹی۔ کئی سالوں کے بعد ہم اس گاؤں میں آئے ہیں۔ تہمینہ اور زرینہ میری دوست تھیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ ان سے مل لوں۔“ اس دفعہ پھر اس عورت نے بہت غور سے اسے سر تا پا دیکھا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ چند منٹ بغور جائزہ لینے کے بعد اسے اندر آنے کا کہہ کر خود آگے آگے چلنے لگی۔

”ادھر بیٹھو...“ جلدی جلدی چارپائی بچھا کر کھیس ڈال کر اس کے لئے جگہ بنائی۔

”اری او زلیخا دیکھ کون آیا رے۔“ وہ اندر منہ کر کے کسی کو آوازیں دینے لگی۔ کسی درمیانی عمر کی خاتون نے فوراً آواز پر لبیک کہا تھا پھر سامنے ایک اجنبی چہرہ دیکھ کر رک گئی۔

”کون اے اماں؟“ وہ زرینہ کی ماں سے پوچھنے لگی تو وہ اسے مشعال کے متعلق بتانے لگی۔ اس کے بارے میں جان کر وہ اس سے ہاتھ ملانے لگی۔

”تہمینہ اور زرینہ کو بلوا دیں تو بہت مہربانی ہو گی؟

ان دونوں کی تو شادیاں ہو گئی ہیں۔ دونوں آج کل اپنے سسرال میں ہیں۔“ زلیخا کے ’ ’ بتانے پر وہ قدرے حیران ہوئی بلکہ نہ ملنے پر دل مسوس کر رہ گئی۔

کب ہوئی دونوں کی شادی؟ زلیخا کچھ پڑھی لکھی لگتی تھی۔ انداز بھی اچھا تھا۔ ’ ’ خوبصورت، مدھر و شیریں، وہ اس کے پاس ہی بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

”چار پانچ سال ہو گئے ہیں شادی کو اب تو دونوں کے تین تین بچے بھی ہیں۔ ’ ’

اچھا...“ اسے تعجب ہوا کتنی جلد دونوں کی شادی ہو گئی تھی بلکہ تین بچے بھی۔ ’ ’

لو بیٹی! یہ دودھ پیو۔“ زرینہ کی والدہ اس کے لئے فوراً دودھ کا گلاس بھر لائیں۔ اسے ’ ’ شرمندگی نے آ گھیرا۔

آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا۔“ دودھ کا گلاس تھام کر پینے لگی۔ زرینہ کی بھابی اور اماں ’ ’ دونوں کبھی اس کے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھتیں اور کبھی اس کے سرخ و سفید خوبصورت نین و نقوش سے مرتعش چہرے کو۔ وہ سراپا حسن تھی۔ دیکھنے والوں کو سیکنڈوں میں مدہوش کر دیتی تھی۔

آپ بہت خوبصورت ہیں، کبھی بڑوں سے شاہوں کی لڑکیوں کی خوبصورتی کے ’ ’ تذکرے تو سنے تھے لیکن یہ آج آپ کو روبرو دیکھا تو یقین آ گیا ہے۔ واقعی حسن تو پٹا پڑا ہے تم ”لوگوں میں۔

اس کی بات پر وہ مسکراتی رہی، جیسے روٹین کی بات ہو۔ زلیخا بہت اچھی اور میٹھی باتیں کرتی تھی وہ کتنی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ باتوں کے دوران ہی اس نے اس کو مکئی کی روٹی پکا کر شلجم کے سالن کے ساتھ کھلائی۔ وہ انگلیاں چاٹتی رہی۔ گھی میں پکی روٹی بڑے شوق اور رغبت سے کھاتی رہی۔

مکئی کی روٹی کا مزا ساگ کے ساتھ کھا کر محسوس بھی کیا اور سنا بھی تھا لیکن آج شلجم کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا کر اور بھی اچھا لگا۔ ”ایمان سے بہت مزا آیا ہے۔“ لسی کا گلاس چڑھاتے ہوئے وہ ان کے خلوص کی کھلے دل سے تعریف کرنے لگی۔ کتنی دیر تک وہ ان کے گھر میں رہی تھی۔ کسی قسم کا خوف اور ڈر دل میں نہ تھا۔ زلیخا، زرینہ اور تہمینہ کی شادی کی تصاویر لے آئیں تو وہ انہیں دیکھنے لگی۔ باتوں باتوں میں وقت بیتنے کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ ویسے بھی گھر میں اس وقت کوئی مرد موجود نہ تھا۔ دونوں ساس بہو ہی تھیں اسی لئے اسے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی تھی۔ کافی وقت گزارنے کے بعد اچانک اس کی نظر کلائی میں موجود گھڑی پر پڑی تو چونک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ضد میں چلی تو آئی تھی لیکن حویلی والے اس کے بارے میں بالکل بے خبر تھے کہ وہ کہاں آئی ہے جبکہ گھڑی اب ساڑھے دس بجا رہی تھی۔ اسے ڈر تو کسی کا بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے مزید رکنا سوہان روح ہی لگا۔

’’اب میں چلوں گی کافی دیر ہو گئی ہے؟“ دونوں ساس بہو نے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"جا لقمان بی بی جی کو حویلی کے اندر تک چھوڑ کر آنا ہے۔" زلیخا نے اپنے دس گیارہ سالہ بچے کو چلتے وقت اس کے ہمراہ کر دیا۔ وہ لڑکے کی ہمراہی میں کھیتوں کی جانب سے جانے کے بجائے سڑک پر ہولی۔ ابھی تھوڑا سا فاصلہ ہی طے ہوا تھا جب سامنے سے آتی گاڑی کے ہارن پر دونوں رک گئے۔ وہ ایک طرف ہو کر چلنے لگی۔ جبکہ بچہ بھاگ کر گاڑی کی طرف گیا تھا۔

"سلام چھوٹے ملک جی۔" ہاتھ ماتھے تک لے جا کر وہ اسے سلام کر رہا تھا وہ گردن موڑ کر گاڑی میں موجود شخص کو دیکھنے لگی۔ کافی زبردست پرسنالٹی تھی۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملنے پر اس نے فوراً اسمائل پاس کی تھی۔ مشعل کے خوبصورت چہرے کے تاثرات کشیدہ ہونے لگے۔ اسے اس کی یہ گستاخی ذرا بھی نہ بھائی تھی۔ وہ بچے سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اس نے توجہ دینے کی زحمت نہ کی۔ وہ ایک دو منٹ رک کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا اور بچہ پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

"کون تھا یہ؟" مارے تجسّس وہ اس سے پوچھنے لگی۔

"یہ ملک ایاز کا بڑا بیٹا ہے۔ اب ملک دوبارہ گاؤں آ گئے ہیں۔ وہ پرانی حویلی میں ہی رہتے ہیں۔" وہ پھولے سانس میں ہی بتا رہا تھا۔ وہ باقی رستہ چپ ہی رہی۔ تیز تیز چلتے وہ جیسے ہی حویلی کے پاس پہنچی تو گیٹ پر شاہ زر کو ادھر سے ادھر ٹہلتے دیکھ کر رک گئی۔

اچھااب تم جاؤ۔" پہلے اس نے بچے کو چلتا کیا۔ پھر سہم سہم کر قدم اٹھاتی حویلی کے ’ ’
داخلی گیٹ کی طرف.بڑھنے لگی۔

کہاں تھیں تم؟" وہ جیسے ہی حویلی کے گیٹ کے پاس پہنچی وہ اس کے سامنے آگیا۔ ’ ’

کہاں ہونا چاہیئے تھا مجھے؟" اس کے متفکر سرخ الجھے پریشان چہرے کو دیکھ کر اسے ’ ’
بہت سکون حاصل ہوا۔ اسے لگا وہ.برسوں کی پیاس مٹنے لگی ہو۔ اسے زچ کرنے کو الٹا سوال
کر دیا۔

شٹ اپ" وہ چیخ اٹھا۔ "کہاں تھیں تم؟" مارے تپش کے وہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ’ ’
نسیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ مسکرانے لگی۔ کوئی اور ہوتی تو اس وقت شاہ زر کا غصہ دیکھ کر بے
ہوش ہو چکی ہوتی۔ اس کے سامنے تو بڑے.بڑوں کی سٹّی گم ہو جاتی تھی۔

ملکوں کے محلے میں گئی تھی۔" اس کے غصے کو نظرانداز کر کے اس نے تاک کر ایک ’ ’
اور نشانہ لگایا۔ وہ تڑپ اٹھا' اسے دیکھا جس کے لبوں پر جاندار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

کیوں گئی تھیں تم وہاں اور کس سے پوچھ کر گئی تھیں؟" اہ ذر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ’ ’
وہ اس الٹے دماغ والی "سر پھری" لڑکی کا دماغ سیدھا کر دے۔

میری مرضی، میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ ویسے بھی وہاں جانے کے لئے مجھے کسی ’ ’ کی اجازت درکار نہیں، خاص طور پر تمہاری تو بالکل نہیں۔" وہ آج اس منتقم مزاج شخص سے تھپڑ کا بدلہ لے لینا چاہتی تھی۔ آنکھیں گاڑھ کر کہہ رہی تھی۔ شاہ زر بلبلا اٹھا۔

تمہاری مرضی کی تو ایسی کی تیسی۔ وہاں جانے کے لئے تمہیں سب کی اجازت درکار ’ ’ ہے۔ وہ دشمن ہیں ہمارے۔" اس کے سامنے وہ جم کر کھڑی تھی وہ بمشکل اپنے کھولتے دماغ کو کنٹرول کر رہا تھا۔ مشعال مسلسل مسکراتی رہی۔ وہ نجانے کیا تھی. بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی اس کی۔

اچھا... حیرت کی بات ہے۔ ننھیال والے تمہارے بھی دشمن ہیں۔" وہ اس کی ذات ’ ’ کو اچھالتی استہزائیہ ہنسنے لگی۔ اس کا انداز معنی خیز تھا۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں چھپی کاٹ اور معنی خیزی شاہ زر کو پاگل کر دینے کو کافی تھی۔ وہ اس کی اس استہزائیہ ہنسی اور طنزیہ بات پر خشمگیں نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

ہاں وہ ہم سب کے دشمن ہیں اور جو بھی ہماری حویلی کی عزت پر نگاہ ڈالے وہ میرا بھی ’ ’ دشمن ہے۔ سمجھ گئیں تم۔ تمہیں اپنا آپ دکھانے کا زیادہ شوق ہے تو چلی جاؤ اسی دیس میں وہاں تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ یہ تمہاری پہلی غلطی نہیں ہے لیکن پھر بھی معاف کر رہا ہوں۔ کان کھول کر سن لو مشعال بی بی، آئندہ تم نے بغیر پوچھے اور بتائے حویلی کی چوکھٹ سے ” باہر قدم بھی نکالا تو کاٹ کر رکھ دوں گا تمہاری یہ ٹانگیں۔

“شٹ اپ... اپنی زبان کو لگام دو اور لہجے کو بھی کنٹرول رکھو۔ تم بھی کان کھول کر سن لو مجھے کہیں بھی جانے کے لئے تمہاری اجازت درکار نہیں ہے۔ میں جاؤں گی، جہاں بھی میرا دل چاہے گا۔ روک سکو گے تو روک لینا۔ میں بھی دیکھتی ہوں کتنے طرم خان ہو تم اور یہ اپنی ٹانگیں توڑنے والی دھمکی بھی کسی اپنے جیسی کے لئے سنبھال رکھنا۔ ایسی گیدڑ بھبھکیوں سے میں ڈرنے والی نہیں۔” اس نے بھی مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کی تھی۔ دونوں مقابل تھے ایک دوسرے کی نفی کرتے۔ دونوں سب کچھ فراموش کر رہے تھے۔ تاک تاک کر وار کرتے ساری حدیں پار کر رہے تھے۔

“چپ کرو تم، شاہ زر... اور مشعال تم اندر چلو۔ آئندہ جہاں کہیں بھی جانا ہو کسی مرد کو ساتھ لے کر جانا۔” آذر بھیا دونوں کی اس لایعنی بحث اور آتش فشاں لہجے میں الجھتے جھگڑتے دیکھ کر آگے بڑھ آئے۔ اس نے قہر زدہ نظروں سے شاہ زر کو گھورا۔ جس طرح اس نے اس کی ذات کا نشانہ بنایا تھا وہ اندر ہی اندر زخمی شیرنی کی طرح بپھر اٹھی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ لمحوں میں اس قہر و غضب کے پیکر کا منہ نوچ کھسوٹ لے۔

“دیکھو میری اچھی بہن، سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب ملک دوبارہ گاؤں چلے آئے ہیں۔ اگر پرانی دشمنی چلانے لگے تو ایک دفعہ پھر تاریخ دہرائی جائے گی۔ اور ہم ایسا نہیں چاہتے۔ اسی لئے اچھی بہن احتیاط لازم ہے۔” وہ بہت پیار سے سمجھا رہے تھے۔

تو یہ بات آپ اپنے اس لاڈلے کو بھی سمجھا سکتے ہیں۔ خواہ مخواہ زیادہ اسمارٹ بننے کی ’ ’ کوشش کر رہا ہے۔ سمجھا دیں اسے مجھ سے اس لہجے یں بات مت کیا کرے میرا ابھی دماغ گھوم جاتا ہے۔“ وہ نخوت و حقارت سے انہیں کہہ کر سے شاہ زر کی کھا جانے والی نظروں کو نظر انداز کئے اندر چلی آئی۔ وہاں سب بے تابی سے اس کے منتظر تھے۔

کہاں تھی تم؟“ ماما اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ وہ چپ رہی۔ یوں لاؤنج کے صوفے پر ’ ’ گری جیسے میلوں کی مسافت طے کر آئی ہو۔ شاہ زر نے اس کے کردار کی دھجیاں بکھیری تھیں۔ وہ کیسے.برداشت کر لیتی۔

بتاتی کیوں نہیں ہو... کہاں تھی تم؟“ ماما کے کندھا ہلانے پر وہ زچ ہو گئی۔ ’ ’

یہی تھی۔ اسی گاؤں میں۔ مر نہیں گئی تھی جو سارے یوں پوچھ رہے ہیں۔“ وہ پہلے ’ ’ ہی اس جھگڑالو سے سر کھپا کر آئی تھی۔ ان کے یوں بے قراری سے پوچھنے پر مزید چڑ گئی۔ بدتمیزی سے بولی تھی۔ شاہ زر کا سارا غصہ ان پر نکل گیا۔ بڑی امی تاسف سے سر ہلاتیں اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

مریں ہمارے دشمن بیٹی! ایسی بدفال زبان سے کیوں نکالتی ہو۔ صبح ساڑھے پانچ بجے ’ ’ سے تم لوگ گئی تھیں اور اب گیارہ کے قریب تم لوٹ رہی ہو۔ ہمارا پریشان ہونا فطری ہے “اور پوچھ گچھ کرنے میں بھی حق ہے۔ خدانخواستہ ہم تم پر ظلم تھوڑا کر رہے ہیں۔

ہونہہ... حق بجانب ہیں۔ سب کے ہوش یوں اڑے ہوئے ہیں جیسے میں کہیں بھاگ ’ ’ گئی ہوں اور وہ ڈھانسو اجڈ کون ہوتا ہے جو مجھ پر اتنا رعب جماتا ہے۔ بڑی امی آپ اسے سمجھالیں وہ میرا باپ نہیں ہے جو میری ٹانگیں توڑے گا یا میری ذات کو انوالو کرے گا۔ مائی فٹ... نان سنس... بدتہذیب انسان...“ وہ تپی ہوئی تھی اندر اتنی تپش تھی ایسی آگ لگی ہوئی تھی کہ وہ کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر جو منہ میں آیا کہہ رہی تھی۔ شاہ زر اور آذر بھیا جو اندر آرہے تھے۔ دروازے پر ہی اس کی خوش کلامی سن کر خاصے جز بز ہوئے۔ بڑی امی بھی متاسف دیکھتی رہیں۔ پھر شاہ زر کا دفاع کرنے لگیں۔

اس کا انداز ہی ایسا ہے تم برا کیوں مانتی ہو۔ تم نئی ہو نا اسی لئے زیادہ محسوس کرتی ہو۔ ’ ’ نہیں تو وہ سب لڑکیوں کو ڈانٹتا ہے۔ اسی لئے تمہیں بھی کچھ کہہ دیا ہوگا۔“ بڑی اماں اسے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے کہہ رہی تھیں۔ جبکہ ماما باقی سب بالکل خاموش تھیں۔

پھر بھی آپ اسے کہہ دیں حد میں رہے اپنی۔ آپ کو نہیں پتا وہ مجھے دیکھتا کیسے ہے۔ ’ ’ نہ لحاظ‘ نہ مروت‘ جیسے نظروں سے ہی تو نگل لے گا۔ اتنی عام ہوں نا؟ میں بچی نہیں ہوں جو اس کی نظروں کا مفہوم نہ سمجھ سکوں۔ وحشی درندہ کہیں کا۔“ وہ جانتی نہیں تھی کہ وہ وحشی درندہ بھی اسی کمرے میں ہے۔ اور اس کی ساری باتیں سن کر لڑکیوں کو دوپٹوں کے اندر منہ چھپا کر مسکراتے دیکھ کر اس کی خوش گفتاری پر تلملا رہا ہے۔ ”جس کو چاہے جو مرضی ہے‘ جسے چاہے جیسے دیکھے۔ میری بلا سے۔ میں اس کی یہ آنکھیں‘ یہ لہجہ اور یہ رویہ ایک منٹ برداشت

نہیں کروں گی... مائی گاڈ... اس لہجے میں تو کبھی پاپا نے بھی مجھ سے بات نہیں کی اور وہ چلا ہے مجھ پر حق جمانے... ایڈیٹ..." وہ تن فن کرتی، بڑی امی کا بازو جو کہ اس کی کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا ہٹا کر جیسے ہی اٹھ کر پلٹی سامنے شاہ زر کو دیکھ کر رک گئی۔ وہ غیظ بھری آگ برساتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا، پھر تمسخرانہ نظر حاضرین پر ڈالتے ہوئے وہ بڑی امی سے کہنے لگی۔

"دیکھ لیا آپ نے، ان نظروں سے کبھی اس نے علیشہ، عشاء، نشاء، ماریہ اور زوبیہ کو تو نہیں دیکھا ہو گا کیوں میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔" وہ بد تمیزی کی حد پار کرتے بڑی امی سے مخاطب تھی۔ بڑی امی کی کیفیت ایک سرپرست کی سی تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کی شان میں گستاخی کر جائے لیکن وہ بد تمیزی کی حد پار کرتی جا رہی تھی۔ ماما کو بے پناہ غصہ آیا۔ فوراً آگے بڑھ کر اس کا بازو دبوچا۔ شاہ زر نے بمشکل اپنے ہاتھ کو بند کیا۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے مشعال۔"

"چھوڑیں میرا بازو۔" اس نے سر جھٹکتے اپنا بازو چھڑوایا۔ بے بسی سے انہیں دیکھا۔ آج انہی کی وجہ سے وہ اتنی بے عزت اور ہلکی ہو گئی تھی۔ "آئندہ میرے معاملے میں مت بولئے گا۔ اس سب کی ذمے دار صرف آپ ہیں اور اب آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ میری ذات میں خامیاں تلاش کریں یا میرے کردار کی دھجیاں بکھیرنے والوں کی لائن میں کھڑی ہو کر مجھ پر انگلی اٹھائیں۔ کوئی حق نہیں آپ کو۔ کچھ نہیں لگتی آپ میری۔ کچھ نہیں... سن لیا

آپ نے۔” وہ تنفر و بے بسی‘ سے پھولی سانسوں سمیت انہیں کہہ رہی تھی۔ نجانے اس سمے اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخی تھی پھر تیزی سے بھاگ کر سیڑھیاں عبور کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر پر گرتے ہی آنسو بہنے کو بے تاب ہو گئے۔ ابیشا بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ اس نے اس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً بستر کی چادر سے اپنے آنسو صاف کیئے۔ آنکھوں کو ملتے وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ابیشا اسے روتے دیکھے۔ اس نے ہمیشہ مشعال کو خشک آنکھوں اور سرد لہجے میں دیکھا تھا اور وہ اپنا یہ تاثر اب بھی برقرار رکھنا چاہتی تھی۔

اب خدا کے لئے تم میرا دماغ چاٹنے مت بیٹھ جانا۔ پہلے ہی اس اجڈ‘ جاہل‘ وحشی نے ’ ’ پلپلا کر کے رکھ دیا ہے۔” وہ کچھ بولنے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے پیش بندی کے طور پر ہاتھ جوڑ کر اسے چپ کرا دیا۔

اوکے... میں کچھ نہیں بولتی‘ کچھ نہیں کہتی‘ لیکن آپ خود سوچیں کیا آپ کا یہ رویہ ’ ’ مناسب تھا کتنی بدتمیزی سے آپ نے بڑی امی سے بات کی ہے۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ لوگ۔”

چپ کرو ابیشا! پلیز تم تو ان لوگوں کی حمایت مت کرو‘ ان کے ساتھ مت ملو۔ میں ’ ’ تمہاری بہن ہوں۔”

جی ہاں ! آپ میری بہن ہیں‘ یہی محسوس کر کے ہر وقت شرمندہ ہوتی رہتی ہوں ’ ’ لیکن آپ کو کیا۔ آپ اپنی ذات سے باہر نکل کر کچھ دیکھیں تو محسوس کریں۔ آپ تو وہ ہر کام کریں گی جس سے ہمیں تکلیف ہو گی‘ نجانے ماما نے کیوں یہ سب کیا؟ کیوں اتنے کانٹے بوئے کہ آج تکلیف سے کراہ بھی نہیں سکتے؟ کاش واپس جانے سے پہلے سوچ لیتیں تو آج آپ اس طرح کا رویہ نہ اپناتیں۔ آپ کا بھی بہت قصور ہے‘ خود کو بدلیں۔”

ہاں‘ ہاں‘ میرا ہی قصور ہے‘ میں ہی بری ہوں‘ تم ایسا کرو مجھ سے ہر تعلق توڑ لو اور ’ ’ خدا کا واسطہ ہے یہاں سے جاؤ۔ سکون لینے دو‘ جان چھوڑ دو میری میں جیسی بھی ہوں ٹھیک ہوں۔”

نہیں چھوڑ سکتی میں آپ کو تنہا۔ مان کیوں نہیں لیتیں کہ آپ جو بھی کر رہی ہیں غلط ’ ’ ہے۔ آج ہی کے واقعے کو لے لیں۔ کس قدر پریشان ہوئے ہیں ہم لوگ۔ ہمیں باغ امین جانے کا کہہ کر نجانے آپ کہاں گئی تھیں۔ جب ہم حویلی لوٹے تو بڑی امی ہم دونوں کو تنہا دیکھ کر آپ کی بابت پوچھنے لگیں۔ ہمارے سچ سچ بتانے پر پریشان ہو گئیں اور عین اسی وقت آذر بھیا اور شاہ زر بھائی بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سب سن لیا۔ دو دفعہ آذر بھائی خود باغ میں گئے ہیں لیکن آپ وہاں ہوتی تو نہیں ملتیں۔ ہم اتنے پریشان تھے اور پھر آپ کو تلاش کرنا بالکل بجا تھا۔ شاہ زر بھائی اس قدر ٹینس تھے اور آپ نے نجانے انہیں کیا کچھ کہہ دیا۔” اس کی بات سن کر وہ چپ لیٹی رہی۔ شاہ زر کی حمایت کرنے پر ہونٹ کچلنے لگی۔ شاہ زر کو طیش دلا کر

نجانے اس کی کس حس کو تسکین پہنچی تھی‘ البتہ اس کی انا ضرور سرمست تھی۔ وہ بظاہر بہت مطمئن مسرور تھی کہ وہ اس شخص کو نیچا دکھا آئی تھی‘ جس نے اس پر بلاوجہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کے کردار پر انگلی بلند کی تھی‘ لیکن ماما کی وجہ سے اس کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔ وہ زخمی ناگن بن گئی تھی۔ ماما ہمیشہ اس کی راہ کا پتھر بن جاتی تھیں اور اب اسے یہ قبول نہیں تھا

مشعال آپی...“ اسے مسلسل چپ دیکھ کر ابیشا نے اس کا کندھا جھنجوڑا۔ ’ ’

پلیز ابیشا! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ اس نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ’ ’

مسٹر شاہ زر جہانزیب! تم نے کیا سمجھ کر مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اتنی ارزاں نہیں ہوں ’ ’ کہ اپنے کردار پر انگلی اٹھانے والے کو معاف کر دوں۔ بے فکر رہو میں اتنی جلدی تو تمہیں نہیں بخشوں گی۔ بہت پچھتاؤ گے تم۔“ ابیشا کے چلے جانے کے بعد وہ شاہ زر کے تصور سے ہم کلام تھی۔

///

دن کی شروعات کے برعکس اور خلاف توقع باقی سارا دن اس کا موڈ بہت خوشگوار رہا تھا۔ وہ سارا دن اپنی بدتمیزی بھلائے شگفتہ بھابی کے ساتھ باتیں کرتی رہی تو کبھی علیشہ اور اس کی سب بہنوں سے۔ سب اس کے پل پل بدلتے موڈز پر حیران تھیں۔ اور کچھ خائف بھی۔ صبح وہ جیسی بدتمیزی بڑی امی سے کر بیٹھی تھی اور بعد میں اس نے اپنی بدتمیزی کے لئے معذرت بھی کر لی تھی۔ اور اس کا معافی مانگ لینا باقی سب کے ساتھ ماما پاپا کو بھی حیران کر گیا تھا سو

سب لڑکیاں جھجکتے اس سے گفتگو کرنے پر مجبور تھیں۔ جبکہ ابیشا بہت خوش تھی کہ وہ اپنا جھگڑالو ڈپریس رویہ بھول بھال کر خوش مزاجی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جیسے ہی رات ہوئی بے تحاشا عورتوں سے حویلی کا صحن بھر گیا۔

’’ ارے یہ اتنی ساری عورتیں حویلی میں کیا کرنے آئی ہیں۔‘‘ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے وہ نیچے صحن میں دیکھ رہی تھی۔ پھر باہر نکل آئی۔ نیچے آئی تو وہاں سے گزرتی نشاء سے پوچھنے لگی۔

’’ ڈھولک بجانے۔‘‘ وہ بہت مصروف انداز میں جواب دے کر صحن میں چلی گئی۔ مارے تجسّس کے وہ بھی باہر کی طرف لپکی۔ نشاء ملازمائوں سے صحن میں دریاں بچھوا رہی تھی۔ سب چادریں بچھا دینے کے بعد ملازمائیں کرسیاں اور موڑھے بھی لا کر رکھنے لگیں۔ پھر عورتیں ان بچھی چادروں پر بیٹھنے لگی تھیں ان کے بیٹھنے کے بعد گھر کے مکین بھی وہاں رکھی کرسیوں پر بیٹھنے لگے تھے۔ ایک عورت ڈھولک بجانے لگی اور دوسری چمچ، باقی ارد گرد چند عورتیں تالی کی تھاپ ڈھولک کی لے سے ملانے لگیں۔ کسی نے اپنی میٹھی سریلی گنگناتی کوئل ایسی آواز میں گانا گانا شروع کر دیا تھا۔ ساری حویلی اس خوبصورت و مدھ بھری سریلی آواز کی لے میں ڈوبنے لگی۔ وہ خود بخود ان کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ پندرہ سالوں بعد اس نے کوئی ایسا روائتی منظر دیکھا تھا۔ اتنا مکمل و بھرپور پرجوش و سحر انگیز۔ ڈھولک کی تھاپ گانے کی لے دل کی آواز بنتی گئی۔ ہاں دری پر بیٹھی علیشہ، عشاء، نشاء اور ابیشا نے اسے اپنے پاس جگہ دی۔

علیشہ ! حویلی میں کوئی فنکشن ہے کیا؟” وہ آہستگی سے علیشہ سے پوچھنے لگی تو اس نے ’ ’ تالی بجاتے سر ہلا دیا۔ وہ منتظر رہی کہ وہ کچھ مزید بتائے۔ کم از کم فنکشن کی نوعیت کے بارے میں ہی۔ لیکن وہ کافی دیر تک نہ بولی تھی البتہ وہاں موجود عورتیں پلٹ پلٹ کر اسے ضرور دیکھ رہی تھیں پھر ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہنے لگیں۔

سنو‘ میرے چہرے پر کچھ لکھا ہے؟” وہ عورتوں کی اس حرکت سے خائف ہوتے ’ ’ علیشہ کا کندھا ہلا کر پوچھنے لگی جواباً اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیوں پوچھ رہی ہو؟ ’ ’

سب عورتیں بار بار پلٹ کر مجھے دیکھ رہی ہیں۔” اس نے گویا اطلاع دی تھی اسے۔ ’ ’

وہ تمہیں نہیں بلکہ ہم سب کو دیکھ رہی ہوں گی کہ کس قدر مثالی لائن ’ ’ ہے۔” مسکراہٹ ہونٹوں تلے دباتے اس نے کہا۔ وہ چڑ گئی۔ اسے مذاق کی توقع نہیں تھی۔

نہیں علیشہ ! وہ مجھے ہی دیکھ رہی ہیں۔” وہ بضد ہوئی۔ ’ ’

غلط فہمی ہے یار تمہاری۔” وہ اب بھی سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی ’ ’ تھی۔ وہ اس کی مصروفیت پر لعنت بھیجتی اٹھ کر شگفتہ بھابی کے پاس آ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

بھابی یہ ڈھولک کیوں بجائی جا رہی ہے۔‘‘ ان کے پاس کرسی پر بیٹھتے اس نے پوچھا تو ’ ’ وہ بھی خاموش ہو گئیں، وہ الجھ گئی۔

’’کیا بات ہے، کوئی بتاتا کیوں نہیں۔ آخر کس لئے یہ ڈھولک رکھی گئی ہے۔ ’ ’

’’شادی ہے حویلی میں۔ ’ ’

ش... ش... شادی... حویلی میں... لیکن کس کی...؟‘‘ وہ بے پناہ حیران ہوئی۔ ’ ’

حویلی میں شادی ہے اور اسے ابھی تک کچھ علم ہی نہیں۔ وہ کتنی احمق تھی اسے احساس ہوا۔

شاہ زرکی۔‘‘ بھابی کے اس انکشاف پر تو جیسے حیرت و انبساط کا آسمان ٹوٹ گرا تھا۔ ’ ’

حیرانگی ہی حیرانگی تھی اس ڈھانسو کی شادی تھی اور وہ قطعی بے خبر تھی۔ اور کسی نے اسے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی حتی کہ ابیشا نے بھی نہیں۔ چند لمحے بعد شاک سے نکلی تو بے انتہا خوش تھی۔

رئیلی... مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہاس اکڑ فو کی شادی ہو رہی ہے۔ ناحق میں نے اتنا ’ ’ خون جلایا۔‘‘

تم نے پوچھا ہی کب تھا جو ہم بتاتے۔ ویسے بھی پندرہ دن سے ڈھولک بج رہی تھی دو ’ ’ دن صرف تم لوگوں کی وجہ سے یہ ڈھولک نہ رکھی۔ آج پھر رکھ لی ہے۔‘‘ وہ کرسی پر بیٹھی ہولے ہولے گانے کی لے پر جھومتیں تالی بجا رہی تھیں۔ وہ ان کے صبیح چہرے کو دیکھنے لگی۔

‘ ‘ کب ہے شادی؟

”جمعہ کو۔

واٹ؟“ وہ چیخ اٹھی۔ ”یعنی کہ آج سوموار ہے اور جو چار دن کے بعد فرائی ڈے آرہا ہے اس دن اس شاہو کی شادی ہے۔ ویری آمیزنگ۔“ اس نے کئی سالوں بعد کسی کے سامنے یوں برملا شاہ زر کو شاہو کہا تھا۔ اس قدر حیران تھی کہ اپنے اس پکارے گئے نام پر بھی نہ غور کر سکی بھابی اس ”نک نیم“ پر چونک کر دیکھتیں گردن ہلا کر تصدیق کرنے لگیں۔

کس سے ہو رہی ہے؟“ سب سے اہم سوال وہ اب کر رہی تھی۔

سرپرائز ہے۔ تمہیں چند دن بعد خود بخود پتا چل جائے گا۔“ بھابی اس کی طرف دیکھ کر ایک خاص ادا سے مسکرائیں تو وہ ان کے گالوں پر پڑنے والے ڈمپلز کو دیکھ کر خود بخود مسکراتی گئی۔

سو جان چھوٹی سو لاکھوں پائے۔“ کے مصداق بہت خوش تھی۔ اس کی بلا سے اس کی چاہے جس سے بھی شادی ہو۔

ویسے بھابی! آپ کے اس خاصے پاگل، ڈھانسو، جھگڑالو، اور اکڑ فو سے دیور کو آخر کس عقل کے اندھے نے لڑکی دے دی ہے۔“ وہ انہیں چڑانے کو کہہ رہی تھی وہ اس کے نام سن

کر ہنستے ہنستے بیر بہوٹی ہونے لگیں۔ ان کے چہرے پر بہت خوبصورت سا شرارت سے مزین تاثر ابھر آیا تھا۔ وہ آنکھیں جھپکائے بغیر کئی لمحے سچل نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

“دنیا میں قدردانوں کی کمی تھوڑی ہے۔ ویسے بھی کیا کمی ہے میرے چاند سے بھائی میں۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ ویل ایجوکیٹڈ، پاور فل پرسنالٹی، اٹریکٹو مینرز دولت وجاں وحشمت کا مالک ہے۔ ایک پرکشش و مہذب پوسٹ پر فائز ہے۔ ہزاروں لڑکیاں ہیں جو اس پر مرتی ہیں اور لاکھوں والدین ہیں جو اسے لڑکی دینے کو تیار بیٹھے ہیں جبکہ ایک وہ ہے اس کی نظر انتخاب ٹھہری بھی تو کس پر۔” وہ سر ہلاتے دھیمے سروں میں ہنسنے لگیں۔

“ارے آپ تو واقعی روائتی بہن کا کردار ادا کر رہی ہیں لیکن ایک بات تو بھول گئیں اس میں کمی تو کوئی نہیں ماسوائے دل کے اس سے کہیں محبت کرنا بھی سیکھ لے بہت اچھی زندگی بسر ہوگی، بیوی بیچاری ساری عمر دعائیں دے گی۔” وہ انہیں چھیڑنے لگی۔

“نہیں مشعال! اس کی طرف سے دل میلا مت کرو، نہ ہی کوئی بدگمانی بسنے دو، وہ دل کا بہت اچھا ہے بہت سوبر اور نرم۔ بس نجانے کبھی کبھار اسے کیا ہو جاتا ہے پھر کسی کا سمجھانا، کہنا سننا، سبھی بے کار جاتا ہے اور وہ وہی کرتا ہے جو وہ ٹھان لیتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ ایک بہت اچھا انسان ہے۔” وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔

“ارے...رے...آپ تو جذباتی ہو گئی، میں تو مذاق کر رہی تھی۔” وہ یکدم انہیں کہہ بیٹھی۔ پھر خود ہی حیران ہوئی۔ (وہ شاہ زر کے بارے میں یہ کہہ رہی تھی جس نے صبح اس کے

کردار پر انگلی اٹھائی تھی) یہ سوچ بھی اس کے موڈ کو غارت نہ کر پائی تھی وہ ہنستے مسکراتے کھلکھلاتے کتنی دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی۔ پھر اٹھ کر واپس ابیشا کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ رات گئے تک ڈھولک پیٹنے کا پروگرام تھا۔ وہ بھی کافی دیر تک بیٹھی رہی۔ عجیب طرح کے گانے ٹپے' ماہیے ہوئے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔ بہت عرصے بعد وہ اتنے مکمل اور روائتی ماحول کا حصہ بنی تھی۔ اسی لئے اس کی سوچیں بھی بہت مثبت ہو رہی تھیں۔ کبھی کوئی عورت گانے پٹوں' ماہیوں میں بڑی امی کو گھسیٹ لاتی اور کبھی شگفتہ بھابی کو۔ کبھی عورتیں چچی زینب کی شامت لاتیں تو کبھی اس نا معلوم لڑکی کی جسے وہ سرے سے جانتی ہی نہیں تھی۔ اس نے تو جس جس سے بھی دلہن کے متعلق پوچھا سب نے سرپرائز کا کہہ کر ٹال دیا تھا۔ عجیب عجیب طرح کے مقامی بولی میں گانے تھے بہت جلد اس کا سر دکھنے لگا۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ وہاں ملازمہ موجود تھی۔ اسے چائے کا کہہ کر خود پاس ہی کھڑی رہی اچانک ایک خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"خورشیدہ! تم جانتی ہو یہ شاہ زر کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔" بہت پیار سے مخاطب کر کے اس سے پوچھ رہی تھی۔ کسی سے مطلب نکلوانے کا یہ بھی اس کا اپنا مخصوص انداز تھا۔

"آپ نہیں جانتیں؟" چائے بناتے بناتے وہ حیران ہو کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

وہ مزید الجھ گئی۔

’ ’ نہیں...میں کچھ نہیں جانتی۔ پلیز بتاؤ کس سے ہو رہی ہے؟" اس سے دوبارہ پوچھا۔

’ ’ "...وہ جی ان کی شادی تو

’ ’ خورشیدہ...!" باقی کے الفاظ اس کے منہ سے شاہ زر کی پکار نے اچک لئے۔ وہ بھی چونک کر دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے اس خوبرو سے شاہ زر کو دیکھنے لگی۔

’ ’ جی شاہ جی۔" وہ فوراً حکم ماننے کو تیار تھی' چائے چھوڑ کر۔

’ ’ جاؤ میرے کمرے میں ٹیبل پر موبائل پڑا ہے وہ لے آؤ۔" مشعال حیران ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ باہر کتنی ساری ملازمائیں تھیں وہ یہ کام کسی سے بھی کہہ سکتا تھا۔ خاص طور پر خورشیدہ کو کہنا اسے مشکوک کر گیا۔ خورشیدہ اسے چائے کا خیال رکھنے کا کہہ کر باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی شاہ زر نے بھی دروازے کی دہلیز چھوڑ دی تھی۔ پھر جتنی دیر میں اس نے چائے بنا کر اپنے لئے کپ میں انڈیلی خورشیدہ بھی چلی آئی۔

’ ’ تم نے بتایا نہیں اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔" اس نے ڈھیٹوں کی طرح دوبارہ پوچھا۔

’ ’ ہم ملازموں کو تو کچھ علم نہیں۔ حویلی والے جانتے ہوں گے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ چائے کا کپ لے کر باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی نظر گلاس وال کے اس پار صحن میں جمع عورتوں

کو دیکھتے شاہ زر پر پڑی۔ وہ واپس آ گئی۔ باہر صحن میں محفل ابھی تک زور و شور سے جاری تھی۔

شاہ زر نے اسے اپنے پاس آ کر رکتے دیکھ کر ایک لحظہ کو اچٹتی نگاہ ڈالی پھر باہر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے سبکی تو ہوئی لیکن کچھ بھی کہنے سے خود کو باز رکھا۔ اس وقت اس کی شادی کا سن کر بہت خوش تھی۔ کچھ بدمزگی پھیلا کر وہ اپنے موڈ کو غارت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ہیلو...“ اپنی طبیعت اور موڈ کے برعکس اس نے اسے متوجہ بھی کر ڈالا۔ جواباً شاہ زر ’ ’ سوالیہ نظروں سے اس خوش اخلاقی کی وجہ جاننے کے لئے اسے دیکھنے لگا۔ (شاید مزید کچھ کہے)

چائے پیو گے؟“ آنکھیں پھیلا کر کھڑے کھڑے ہی اس نے اپنا آپ اس کی طرف ’ ’ بڑھاتے پہل کی۔ وہاں سب کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ اس شخص کے ساتھ اب نہیں جھگڑے گی۔ اور اپنی سوچ پر عمل درآمد کرنے کے لئے اب وہ اس سے مخاطب بھی تھی۔

نو شکریہ۔“ بہت سخت جواب وصول ہوا تھا۔ مشعال صرف دیکھ کر رہ گئی۔ ’ ’

یہ شخص کبھی بھی نہیں سدھر سکتا۔ بھابی کا کہنا تھا کہ یہ بہت اچھے دل کا مالک ہے ’ ’ لیکن مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ دل نام کی کوئی چیز بھی اس کے پاس نہیں بلکہ اس سے بالکل “ناواقف ہے۔

پاپا کہتے ہیں کہ خوبصورت لوگوں اور اچھی آفرز کو کبھی ریجیکٹ نہیں کرنا چاہئے۔ ’ ’ نہیں تو ساری عمر پچھتاوے ہی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بڑے بیڈ لک ہو پہلی دفعہ خود چل کر آئی

ہوں تمہاری طرف لیکن تم...او کے ایزیو وش...ہر کوئی ہم جیسی آفرز تھوڑی کرے گا۔ مجھے تو چائے کی طلب بہت ہو رہی ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔“ وہ دلکشی سے مسکرائی تو اس کے چہرے کا دلکش و مسحور کن تاثر بھی مسکرانے لگا۔ وہ جو اسے ہی دیکھ رہا تھا‘ کڑے تیوروں سے‘ وہ اس کی بات کا مفہوم بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات بہت واضح تھے۔ آنکھیں شرارے اگلنے لگیں۔

’’شٹ اپ مشعال تم اور کتنا گروگی اپنے مقام سے؟“ اگر باہر صحن عورتوں سے نہ بھرا ہوتا تو وہ اس کے اس بے حیا شرمناک آفر پر اس کا منہ ہی توڑ دیتا۔ بمشکل آواز کو دھیمی رکھ کر وہ بولا تھا۔

وہ بے اختیار مسکراتی کپ ہونٹوں سے لگا کر پلٹی پھر رک گئی۔ شاہ زر بہت لوز ٹمپرز تھا سو جلدی ہی بول اٹھا تھا۔ وہ مزہ لیتی رہی اس کی بات کا جیسے اس نے اسے ایوارڈ سے نوازا ہوا۔

’’تم نے تو اس دن بڑے دھڑلے سے کہا تھا کہ تم اپنے بڑوں کی روایات اور ان کے کہے کے بہت پاسدار ہو‘ اب کیا ہوا ہے۔“ اس کا انداز اشتعال دلانے والا تھا۔

’’شٹ اپ...اینڈ یو گیٹ لاسٹ۔“ وہ غرا کر چیخا۔ وہ بے اختیار مسکراتی چلی گئی۔ بڑی طنزیہ ہنسی تھی۔ وہ مزید بھڑکنے لگا۔ لیکن خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کے لئے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے۔ مشعال اس کی بے بسی کا مزہ لیتی رہی۔ شاید اس کا مطلب پورا ہو چکا تھا۔

میں تو جا ہی رہی تھی ڈیئر کزن...اوکے گڈ نائٹ...” وہ آرام سے کہہ کر سیڑھیاں ’ ’ چڑھتے اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے لیکن حویلی میں ابھی بھی کافی رونق لگی ہوئی تھی وہ چائے ختم کر کے بستر پر لیٹی تو فوراً سو بھی گئی تھی۔ آج دوسری راتوں کے برعکس ذہن بہت مطمئن اور آسودہ تھا اسی لئے لیٹتے ہی نیند مہربان ہو گئی تھی۔

///

وہ صبح ہی صبح اٹھ کر صحن میں چلی آئی تھی۔ گلابوں کے غنچوں کے قریب بیٹھ کر وہ ”یوگا“ ایکسرسائز کرنے لگی۔ بالوں کی کس کر چٹیا باندھ رکھی تھی۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے دونوں پاؤں ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر آنکھیں بند کئے وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ جب اپنے پاس ایک اجنبی آواز پر چونک گئی۔

اسلام علیکم !” اجنبی آواز پر اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ مشعال کی نظروں کی ’ ’ تلاش پاؤں سے شروع ہو کر اس کے سر پر جا کر ختم ہو گئی وہ جو کوئی بھی تھا بہت زبردست پرسنالٹی کا مالک تھا۔ بلا کا حسین اور جوان اس کے لئے اجنبی بھی تھا۔ ہر روز ایک سے ایک اجنبی چہرہ اسے دیکھنے کو مل رہا تھا وہ اسے سرتاپا گھورنے لگی۔

میں شاہ میر ہوں۔” اس نے مسکراتے صرف نام بتایا تھا۔ باقی وہ پہچان گئی پھر رسماً ’ ’ مسکرا دی۔

”ہیلو...آئی ایم مشعال۔ ’ ’

رئیلی... یو آر مشعال' مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" وہ برجستہ بولا وہ دھیمے سروں ’ ’ سے ہنسنے لگی۔ شاہ میر نے اسامہ کی طرح بلکہ اس سے بھی مختلف سب سے منفرد رسپانس دیا تھا۔ وہ اس کی نظر میں بہت جچا۔

میں کراچی میں ایم بی اے کر رہا ہوں۔ رات کو ہی شاہ بھائی کی شادی کے سلسلے میں ’ ’ یہاں پہنچا ہوں۔ میری صبح خیزی کی عادت ہے۔ اگرچہ رات تین بجے سویا تھا صبح جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ آپ کو یہاں بیٹھے دیکھا تو کمرے سے نکل آیا۔ باقی ابھی کسی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔" اس نے اس کی انفارمیشن پر سر ہلا دیا۔

اوکے... آپ بزی تھیں اور میں نے ڈسٹرب کر دیا۔ آپ بھی یہیں ہیں اور فی الحال ’ ’ چند دنوں تک میں بھی یہیں ہوں۔ بعد میں ملاقات ہو گی اور وہ بھی تفصیلی اور سہولت سے۔ گڈ لک..." وہ ہاتھ ہلاتا چلا گیا وہ مسکراتی نظروں سے اس کی چوڑی پشت کو دیکھتی رہی۔

درحقیقت وہ اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنی وہی نشست اختیار کر لی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد وہ فارغ ہو کر کچن میں پہنچی تو شگفتہ بھابی بڑی تیزی اور چابکدستی سے ملازماؤں کے ساتھ مل کر ناشتہ تیار کروا رہی تھیں۔

کچن کا سارا چارج چچی زینب اور شگفتہ بھابی نے سنبھال رکھا تھا۔ اپنی نگرانی میں ہی وہ کھانا تیار کرواتی تھیں۔ بڑی اماں ہر وقت تسبیح ہاتھ میں لئے ادھر سے ادھر ملازماؤں کو حویلی کے دوسرے کاموں کے سلسلے میں ہدایات جاری کرتی نظر آتیں۔ سب لڑکیاں تعلیم حاصل

کر رہی تھیں۔ علیشہ اسی سال انگلش میں ماسٹر کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی تھی۔ عشاء نے اسی سال گریجویٹ کا امتحان دیا تھے۔ نشاء اور اسامہ ایف ایس سی کے پیپروں کے بعد جشن فراغت منا رہے تھے۔ دونوں بہن بھائی کا مستقبل میں ڈاکٹر بننے کا ارادہ تھا آج کل تینوں بہنیں شگفتہ بھابی کے ہمراہ ابیشا، زوبیہ اور ماریہ کو ساتھ ملائے شادی کی تیاریوں میں مگن تھیں۔ علیشہ اپنے ماموں زاد اور عشاء خالہ زاد کے ساتھ منسوب تھیں۔ دونوں کو بالترتیب کراچی اور اسلام آباد بیاہ کر جانا تھا۔ جبکہ نشاء فی الحال ایسے کسی بھی جھنجٹ سے بالکل آزاد تھی۔ اور اپنی آزادی دوسروں کو چھیڑ چھاڑ کر خوب انجوائے کرتی تھی۔

’’میرے لئے ہیوی ناشتہ تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک انڈہ اور ٹوس اور دودھ کا ایک گلاس دے دیں۔‘‘ اسے کچن میں موجود پا کر بھابی نے ناشتے میں اس کی پسند پوچھی تو وہ انہیں بتا کر اسٹول گھسیٹ کر بھابی کے پاس ہی بیٹھتی ملازماؤں کو تیزی سے ہاتھ چلاتے دیکھتی رہی۔

’’اس قدر کم کھاتی ہو، اسی لئے تو اتنی اسمارٹ ہو۔‘‘ ان کے کمنٹس پر اس کے ہونٹوں پر ہنسی کے شگوفے پھوٹے۔ ماریہ اور زوبیہ دونوں اپنے بچوں سمیت کچن میں وارد ہوئیں۔ ان کے بچے بہت ہی زیادہ آفت کے پرکارے تھے۔ وہ انہیں دودھ کا گلاس اور فیڈر تیار کر کے دینے لگیں۔ سارے کچن میں ایک افراتفری کا عالم برپا ہو چکا تھا۔ اس نے یہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی۔

''بھابی ! میرا ناشتہ میرے کمرے میں بھجوادیں۔'' کچن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے انہیں ہدایت دی تو باہر نکلتے وقت اندر داخل ہوتے شاہ زر نے انتہائی ناگواری سے اسے دیکھا۔

''بھابی کیوں بھجوائیں۔ تمہارے ہاتھوں میں مہندی تو نہیں لگی۔ تم خود لے جائو۔'' وہ سخت آواز پر چونک کر رک گئی۔ دروازے کی دہلیز پر ہی اس سے صرف دو قدم کے فاصلے پر ہی رک کر بغور شاہ زر کے لاپرواہ مغرور وجود کا جائزہ لیا۔

وہ بہت لاپرواوجود کا مالک تھا۔ اس نے کتنی دفعہ اسے بغور دیکھا تھا۔ اور ہر دفعہ یہی اندازہ لگایا تھا۔ شخصیت سے بظاہر لاپرواہی و بے نیازی چھلکتی تھی۔ انداز میں استغناء تھاایک اکڑ تھی اور غرور تھا۔ سفاکی تھی کبھی کبھی یہ سفاکیت ایک وحشی کا روپ دھار لیتی تھی۔ اس نے ان آنکھوں میں سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرتے بے شمار دفعہ اپنائیت دیکھی تھی وہ بھی صرف اپنوں کے لئے لیکن وہ اپنائیت اس وقت سختی کا روپ دھار لیتی تھی جب ناقابل برداشت ہستی آنکھوں کے سامنے آجائے۔

بہت ہی پرکشش اور چھاجانے والا انداز رکھتا تھا۔

حتمی انداز میں وہ جب بات کرتا تھا تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ سب کچھ تہس نہس کردینے کا پورا پورا ارادہ باندھ چکا ہو پھر بھی اسے اس سے خوف نہیں آتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے خود پر اس کے مقابلے میں حد سے زیادہ یقین تھا۔

فولادی وآہنی وجود دولت وجاگیر' مرتبے ومقام کے نشے میں ڈوبا یہ وجود۔

گائوں کے تصنع و بناوٹ سے پاک کھلے ڈلے صاف ستھرے اور بالکل خالص و تر و تازہ ماحول وفضا میں پلا بڑھا یہ سراپا' دلکش وجود مردانہ وجاہت و حسن کا مرقع شخص جسے شاہ زر جہانزیب کہتے ہیں بالکل نا قابل شکست تھا۔

اسے دل و جان سے اعتراف تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں ایسی سحر انگیز چھا جانے والی اور مکمل شخصیت کا مالک شخص نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ جولف بھی اس کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ یہ مردانہ حسن و وجاہت کا جیتا جاگتا شاہکار تھا۔ اوپر سے یہ شاہ زر جس طرز عمل کا عادی تھا وہ کسی بھی ناگواری ناپسندیدگی حسن و جوانی' دلکشی و دلربائی' رعونیت و طنز کو دیکھے بغیر اپنا کام کرتا تھا۔ جو چاہتا تھا منوا لیتا تھا۔ اس کو اس شخص سے چڑ تھی۔ اس کی شخصیت کی وجہ سے اسے اس سے نفرت تھی اس کی سوچ کی وجہ سے اسے اس پر ترس آتا تھا' اس کی شخصیت میں موجود رہ جانے والے خلا کی وجہ سے جسے وہ دیر سے سہی محسوس کر گئی تھی۔ وہ اٹل لہجے والا شخص تھا جبکہ ہمیشہ اس کے موڈ کو دیکھ کر بات کرتا تھا۔

“کیا اس شخص کے لئے میری زندگی میں گنجائش نکل سکتی ہے۔” اس کو بغور دیکھتے اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ جواب حسب توقع تھا۔

“نہیں۔” وہ ہنس دی۔

“میں کیوں لے جائوں... تم لے آنا ڈیئر کزن۔” پندرہ سالوں بعد جو اسے دیکھ کر ایک شکست رگ وپے میں سرائیت کرتی گئی تھی وہ ساری کی ساری اس پر انڈیل کر وہ خود کو ریلیکس

کرنا چاہتی تھی۔ سوزہریلی مسکراہٹ سمیت بات اس کی طرف اچھال کر وہ یہ جا وہ جا تھی۔ وہ تاسف بھری نظروں سے اسے غائب ہوتا دیکھتا رہا۔

///

حویلی میں شادی میں شرکت کے لئے مہمانوں کی آمد ورفت شروع ہو چکی تھی ایک ایک کر کے سارے عزیز واقارب حویلی میں جمع ہو رہے تھے۔ اس سے ملنے والوں میں اسے. بڑی پھوپی زہرہ خاتون بہت پسند آئی تھیں۔ وہ اپنی بہوئوں بہنوں' بیٹیوں پوتوں پوتیوں کے ہمراہ تشریف لائی تھیں۔ کتنی دیر تک مشعال کو ساتھ چمٹائے بیٹھی رہیں۔ اسے ان کا محبت بھرا شیریں انداز بہت بھایا۔ وہ شگفتہ بھابی کی والدہ بھی تھیں۔ اسی لئے اس کے دل میں ان کے لئے ایک خاص جگہ بن گئی۔ وہ بچپن سے ہی ان کی دیوانی تھی۔ اب بھی ان سے ملنے کے بعد وہ بہت خوش تھی۔ ان لوگوں کے بعد علیشہ کے ماموئوں اور خالائوں کی آمد ہوئی تھی۔ وہ لوگ اس کے لئے اجنبی تھے۔ ان سے وہ صرف سرسری سا ملی البتہ اس نے عشاء اور علیشہ کے منگیتروں کا بغور جائزہ لیا تھا۔

دوپہر کے قریب وہ لڑکیوں کے درمیان سے اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ ابھی بھی بھابی وہاں موجود تھیں۔ ”آپ ہر وقت کچن سنبھالتے اکتاتی نہیں؟“ وہ سیبوں اور آموں کے ٹوکروں میں سے پھل نکلوا کر ملازمہ سے دھلوا کر فریج میں رکھوا رہی تھیں جو کہ مہمانوں کی وجہ سے

باغ سے توڑ کر بھیجے گئے تھے۔ کچھ دیر وہ ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی پھر موڈ نہ دیکھ کر پوچھ لیا۔ وہ اس کے اس قدر اپنائیت سے پوچھنے پر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

’’اکتاہٹ کیسی مشعال ڈیئر! یہ روٹین کی بات ہے۔ اور پھر میں کونسا خود کام کرتی ہوں۔ سارا کام تو یہ بیچاریاں کرتی ہیں۔ میں تو صرف حکم چلاتی ہوں۔‘‘ ان کی انکساری پر وہ ہنس دی۔

’’واہ کیا شان ہے حکم چلانے کی۔ پھر تو خدا ہر ایک کو موقع دے۔‘‘ بھابی بدستور جتی رہیں۔

’’کتنے فریش مینگوز ہیں۔ دیکھ کر میرے منہ میں پانی آنے لگا ہے۔‘‘ ان کے پاس سے ایک آم پکڑ کر وہ اچھالنے لگی۔

’’تو کھالو۔‘‘ انہوں نے پیار سے کہا وہ دیکھنے لگی۔

’’نہیں... ملک شیک بنائوں۔‘‘

’’تمہیں بنانا آتا ہے؟‘‘ وہ دوسری ٹوکری سے ایپلز نکلوا کر رکھتے پوچھ رہی تھیں۔

’’ایسا ویسا‘ ملک شیک کیا‘ میں سب کچھ بنا سکتی ہوں آپ کو کسی دن کوئی ڈش بنا کر کھلائوں گی۔ انگلیاں نہ چاٹتی رہ گئیں تو مجھے کہیئے گا۔ وہاں برطانیہ میں ایشین انسٹی ٹیوٹ سے میں نے ’’ریشین فوڈز‘‘ کا باقاعدہ ڈپلومہ کر رکھا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی ذہین ترین اسٹوڈنٹ

تھی۔ میرے کھانوں کی پاکستانی فیملیز میں اتنی دھوم تھی کہ پاکستانی لیڈیز مجھ سے کھانے کی تراکیب پوچھنے آتی تھیں۔" وہ اپنی تعریفیں کرنے لگی۔ بھابی کبھی کبھی محبت پاش نظر ڈال کر بدستور کام میں مصروف رہیں۔

"... میں تو سمجھی تھی کہ تم ’ ’

کیا...آپ سمجھی ہوں گی کہ مجھے سوائے ناراض ہونے' غصہ کرنے کے اور کچھ آتا ہی ’ ’ نہیں۔" ان کی بات کاٹ کر مصنوعی خفگی سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

ہاں میں سمجھی تو تھی لیکن ساتھ رہنے سے بات کرنے سے رائے بدلنے لگی ہے۔ تم ’ ’ جو نظر آتی ہو وہ ہو نہیں۔ بہت اچھی لڑکی ہو تم۔" وہ آرام سے آم چھیلنے لگی۔ نفاست سے کاٹ کر گرینڈر کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"بھابی گرینڈر کہاں ہے؟ ’ ’

ادھر اس کیبن میں رکھا ہے۔" انہوں نے مصروف سے انداز میں کیبن کی طرف ’ ’ اشارہ کیا تو وہ گرینڈر نکال لائی۔ چند لمحوں میں ہی ملک شیک تیار تھا۔ گلاس میں انڈیل کر وہ بھابی کے پاس آ گئی۔

لیں ٹیسٹ کریں اور بتائیں کیسا بنا ہے؟" ان کو گلاس تھما کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔ ’ ’

ویری گڈ... بہت اچھا ہے۔ واقعی تمہارے ہاتھ میں بہت ٹیسٹ ہے۔‘‘ پہلا گھونٹ بھر ’ ’ کر وہ تعریف کرنے لگیں۔ وہ مسکرا کر اپنے لئے گلاس میں نکال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

مینگو جوس واقعی بھابی کو پسند آیا تھا۔ ایک گلاس ختم کر کر جگ میں سے اور ڈالنے لگی۔

بھابی! ایک گلاس ٹھنڈا ٹھار پانی دے دیں پلیز۔‘‘ ابھی وہ دونوں باتوں میں ہی مگن ’ ’ تھیں کہ شاہ زر گرمی کا راگ آلاپتا کچن میں چلا آیا۔ وہ کہیں باہر سے آیا تھا۔ پسینے سے شرابور پیشانی رومال سے صاف کر رہا تھا اور آتے ہی پانی کی فرمائش کر دی۔ اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے گلاس لبوں سے لگا لیا۔

پانی چھوڑو‘ یہ مینگو جوس پیو۔ اتنا ٹیسٹی ہے ساری گرمی بھول جاؤ گے۔‘‘ بھابی نے ’ ’ گلاس میں ڈال کر اس کی طرف بڑھایا وہ مسکرا کر پینے لگا۔

واقعی۔‘‘ وہ بھی گھونٹ بھر کر تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا اور یہ تعریفی نظریں اس ’ ’ کے لئے نہیں تھیں بلکہ بھابی کے لئے تھیں وہ دل ہی دل میں ہنس دی۔

ویری فنی کزن‘ جب تمہیں علم ہو گا کہ یہ میں نے بنایا ہے تو سارا ٹیسٹ پوائزن میں ’ ’ بدل جائے گا۔‘‘

ہاں یاد آیا بھابی! آذر بھیا کمرے میں گئے ہیں کہہ رہے تھے کہ آپ کو بھیج دوں۔” ’ ’

گلاس ختم کر کے وہ بتانے لگا۔ بھابی سن کر فوراً باہر نکل گئیں۔ شاہ زران کی عجلت محسوس کر کے بے اختیار مسکرا دیا پھر وہ جگ میں سے بچا کچا ملک شیک گلاس میں انڈیلنے لگا۔

سنا ہے تمہاری شادی ہو رہی ہے؟” وہ اس کی آواز پر گلاس لبوں سے لگاتا لگاتا رک ’ ’ گیا۔ خوبصورت مسکراہٹ یکدم سنگین جذبے کی لپیٹ میں آ گئی۔

ہاں... تو...” وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ وہ بغیر نروس ہوئے ہنس دی۔ ’ ’

پھر اس کے پاس سے گزرتی رک گئی۔ بالکل قریب ’صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر

چلو اچھی بات ہے تمہارے بھی سہرے کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ کچھ اور نہیں تو کم از ’ ’ کم بیچارے غصے میں ہی کمی آ جائے گی۔” وہ جانے لگی پھر فوراً پلٹی کہ درمیانی فاصلہ اور بھی کم ہو گیا۔ کندھوں پر بکھرے بال ایک دم لڑھک کر سائیڈ پر ہو گئے۔ اتنا قاتل انداز تھا لیکن مقابل بھی تیکھے چتون کا مالک تھا۔ ”اور ہاں ملک شیک کی تعریف کرنے کا شکریہ۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ یہ میں نے ہی بنایا تھا اور انجانے میں ہی سہی تم میری تعریف کر گئے ہو۔ میری... یعنی مشعال شاہ کمال کی۔” پلٹ کر جاتے جاتے اپنے کندھے سے شاہ زر کے کندھے کو چھو کر دل جلا دینے والی ہنسی ہنستے اس کے غصے کا گراف یکدم ایک سو ڈگری سے بھی اوپر پہنچا گئی۔ جس تیزی سے مشعال نے اس کے کندھے سے اپنا کندھا مارا تھا اسی تیزی سے باہر

بھی نکل گئی تھی۔ پیچھے وہ گلاس ہاتھ میں تھامے اس کی اس حرکت پر کھولتا سر کو بار بار نفی میں جنبش دینے لگا۔

تم اچھا نہیں کر رہیں مشعال، بالکل اچھا نہیں کر رہیں۔ بہت نقصان اٹھاؤ گی تم..." ' '

اس کی آنکھوں میں جلال کی بجلیاں کوندنے لگی تھیں۔ غصہ حد سے بڑھا تو اس نے گلاس کچن کے فرش پر کھینچ مارا۔ گلاس فرش پر گر کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اس میں موجود جوس کچن کے فرش پر بہہ رہا تھا اور وہ ہر ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے میں مشعال کا منقسم وجود دیکھ رہا تھا۔ دل ودماغ دھوئیں سے بھر گئے تھے۔ اور سنک میں برتن دھوتی ملازمہ حیران ہو کر اس کے سرخ چہرے کو دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ شاہ زر نے گلاس کیوں توڑا ہے۔

///

اس کے دماغ میں جو فوراً برطانیہ پلٹ جانے کا خبط سوار تھا وہ شاہ زر کی شادی کا سن کر اب اتر چکا تھا۔ اب اس کا ارادہ مزید کچھ عرصہ رہنے کا تھا۔ ماما پاپا تو یہاں آ کر بالکل بدل گئے تھے۔ ابیشا یوں ان کے رنگ میں رنگی گئی تھی جیسے برسوں سے یہاں مقیم ہو اور وہ ایک خود تھی جو بظاہر مطمئن ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی شاہذر سمیت سب کے ساتھ تلخ کلامی یا بدتمیزی کر جاتی تھی۔ وہ اپنے طور طریقوں اور انداز و اطوار کو نہیں بدل پا رہی تھی اور وہ بدلنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے کونسا ساری عمر یہیں رہنا ہے یا یہ رشتہ داریاں نبھانی ہیں بس اس کا ہر عمل اس کی سوچ کا ترجمان تھا۔

سنو... یہاں حویلی میں تم لوگوں کے پاس کتابیں نہیں ہیں؟" وہ سب کے کمروں میں ’ ’ جا چکی تھی سوائے کورس کی کتابوں کے اسے وہاں اور کوئی کتاب دکھائی نہیں دی تھی۔ اور وہ خود کتابوں کی شیدائی سارا سارا دن واک مین لگائے میوزک سن سن کر اب ایک ہی طرح کی روٹین سے بور ہو چکی تھی۔ مہمانوں کے پاس وہ زیادہ بیٹھتی نہیں تھی اب جیسے ہی علیشہ اس کے کمرے میں آئی وہ اس سے پوچھنے لگی۔

ہاں کتابیں تو ہیں لیکن وہ ساری کی ساری شاہ زر بھائی کے کمرے میں ہیں۔ انہیں ’ ’ کتابیں جمع کرنے کا خبط ہے اور ان کے پاس اس وقت بھی کتابوں کا ایک زبردست کولیکشن ہے۔" اس کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

وہ سب کے کمروں میں آسانی کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ ساری حویلی کے کمرے دیکھ چکی تھی سوائے شاہ زر کے کمرے کے۔ ابھی تک وہ اس کے کمرے کے قریب بھی نہیں پھٹکی تھی۔ اس کی وجہ ایک تو شاہ زر کا رویہ تھا اور دوسرا اپنی غیر دلچسپی تھی۔ اس کے دل میں اس کے کمرے میں جانے کی کوئی خاص حسرت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی بس کبھی کبھار سامنا ہو گیا تو اسے زچ کرنے کی ساری حدیں ہی پار کر دیں۔ شاہ زر کا کمرہ نیچے بھابی وغیرہ کے کمروں کے ساتھ تھا اور جبکہ اس کا اپنا کمرہ علیشہ ‘عشاء ‘ابیشا اور نشاء کے کمروں کے ساتھ دوسری منزل پر واقع تھا اب افسوس ہو رہا تھا کہ وہ پہلے ہی کیوں نہیں اس کے کمرے میں گئی۔

"اور اب شاہ زر کہاں ہے؟ ’ ’

ٹھیک سے تو مجھے بھی علم نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کل دوپہر کے بعد وہ بڑی امی کو ’ ’ بتا رہے تھے کہ وہ سارہ اماں کو لینے شہر جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں وہاں کچھ کام بھی ہے۔ ”آج شام تک ہی واپسی ہو گی۔

ہوں...” اس کا جواب سن کر وہ ایک دفعہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ایک فیصلے پر پہنچ کر ’ ’ کھڑی ہو گئی۔

”سنو... آؤ اس کے کمرے میں چلتے ہیں۔ مجھے کچھ کتابیں لینی ہیں۔ ’ ’

لیکن شاہ بھائی اپنی کتابیں ہر کسی کو نہیں لینے دیتے اور بغیر اجازت کے تو کوئی ان کی ’ ’ ”کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔

ابھی وہ حویلی میں نہیں ہے۔ جب ہو گا، میں خود نمٹ لوں گی۔ فی الحال تو تم ساتھ ’ ’ چلو۔” وہ اس کا ہاتھ تھام کر نیچے آ گئی۔ علیشہ دل ہی دل میں اس کی ہمت کی داد دیتی ساتھ ہو لی۔

کمرے میں آ کر وہ چہار سو جائزہ لینے لگی۔ بیڈ روم بہت خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیا ہوا تھا۔ خاص طور پر کمرے کی لوکیشن بہت سوٹ ایبل تھی۔ ہر چیز سے اسے مالک کی امارت اور ذوق کا اندازہ ہو رہا تھا۔ (بڑے دل والا ہے یہ شخص بھی) چاروں طرف دیکھنے سے بھی اسے کہیں بھی کتابیں نہیں نظر آئی تھیں۔

’’کتابیں کہاں ہیں؟‘‘ کمرے کا جائزہ لے کر علیشہ کو دیکھنے لگی۔

’’کتابیں ادھر ہیں۔‘‘ وہ اسے ساتھ لے کر کمرے میں موجود دروازے سے ہو کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی یہ کمرہ دیکھ کر وہ مزید بھونچکارہ گئی۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس نے ایسا کمرہ نہیں دیکھا تھا لیکن یہ کمرہ شاہ زر کا تھا اسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

’’کیا یہ واقعی شاہ زر کا کمرہ ہے؟‘‘ اس نے کا پر زور دیا۔

’’جی ہاں جناب! یہ واقعی انہی کا کمرہ ہے۔‘‘ کمرہ حویلی میں موجود سب کمروں سے زیادہ ہوادار، کھلا، وسیع خوبصورت اور نفیس تھا۔ ایک طرف ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا تو دوسری طرف سے اسٹڈی کے طور پر۔ لیفٹ سائیڈ دیکھنے سے ڈریسنگ روم اور رائٹ سائیڈ دیکھنے سے اسٹڈی کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ کمرہ ایک ویل کلچرڈ اور نفیس انسان کا معلوم ہو رہا تھا۔ پرانے نوادرات ہر جگہ دکھائی دے رہے تھے جبکہ اس کی اپنی رائے اس شخص کے بارے میں بالکل مختلف تھی۔ وہ تمام سوچوں کو جھٹکتے کتابیں دیکھنے لگی۔ علیشہ اسے کتابوں میں گم ہوتا دیکھ کر واپس چلی گئی تھی۔ واقعی اس شخص کے پاس کتابوں کا بہت اچھا کولیکشن (مجموعہ) تھا۔ کتابیں دیکھنے کے بعد اسے ماننا پڑا۔

اپنی پسند کی دو تین کتابیں منتخب کر کے وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کتابیں پڑھنے میں ایسی گم ہوئی کہ کمرے میں دم بدم پھیلتے اندھیرے کا بھی احساس نہ ہوا اور جب احساس ہوا تو شاہ زر کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ کمرے میں اس کی موجودگی سے قطعی لاعلم تھا۔ اسی لئے اپنی ہی

دھن میں لائٹ آن کر کے دوسری طرف بنی وارڈوب سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ کتاب چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ کپڑے نکال کر جیسے ہی پلٹا' سیدھی نظر مشعال پر پڑی تھی۔ اپنے کمرے میں خاص طور پر اس کمرے میں دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ بھی عجیب سی تھی' کیش کرتی ہوئی' اپنی طرف کھینچتی ہوئی۔ مقناطیسیت کی کشش لئے ہوئے۔

ہیلو...'' اس کی حیرت کو اس نے اپنی آواز سے کم کرنا چاہا۔

تم... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ اور یہ میری کتابیں کیوں پکڑی ہوئی ہیں؟'' اس کے ''ہیلو'' کو کسی بھی خاطر میں لائے بغیر غصے سے پوچھنے لگا۔

علیشہ بتا رہی تھی کہ اس کمرے میں بہت اچھی کتابیں ہیں۔ بس انہی کی تلاش میں تمہیں یہاں دکھائی دے گئی ہوں۔ کیوں برا لگا ہے؟'' سیدھے سبھاؤ سے بات کرنا تو وہ جیسے جانتی ہی نہیں تھی۔ اس کے غصے کو بغیر خاطر میں لائے بہت سکون سے بتانے لگی۔ وہ اس منہ پھٹ لڑکی سے بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سر جھٹکتا کپڑے لے کر واپس چلا گیا تھا۔ وہ باتھ لے کر دوبارہ اس کمرے میں آیا تو وہ ابھی تک وہیں موجود تھی۔ اس کی بھنویں تن گئیں وہ سمجھا تھا کہ وہ چلی گئی ہو گی لیکن وہ اس طرح کتابوں میں گم تھی کوفت اس پر بری طرح سوار ہونے لگی۔ وہ چند قدم بڑھا کر اس کی طرف ہی آ گیا۔

وہ پہلی نظر سے لے کر اب تک ایک سے ہی حلیئے میں دیکھ رہا تھا۔ جینز شرٹس اور ٹراؤزر میں۔ اس وقت بھی وہ اپنے سابقہ بے ڈھنگے اور قابل اعتراض حلیئے میں تھی یا شاید اس کا یہ حلیہ صرف اسے ہی قابل اعتراض لگتا تھا۔

دوسری طرف مشعال کا موڈ بھی آج کسی بھی قسم کی جھڑپ اور آتش فشانی کے لئے تیار نہیں تھا شاہ زر کو تلوار کی طرح اپنے سر پر لٹکتے دیکھ کر جلدی سے کتابیں سمیٹ کر جانے لگی۔

’’اے سنو... تمہارے پاس کوئی ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں؟‘‘ وہ کوشش کے باوجود خود کو یہ کہنے سے نہیں روک پایا تھا۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتی مشعال رک گئی۔ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی‘ اس کی نظریں اپنے وجود کے اندر تک اترتی دیکھ کر بغور اپنا جائزہ لیا۔

اسے تو ان کپڑوں میں کوئی اعتراض دکھائی نہ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی ہی ڈریسنگ کرتی آئی تھی۔ البتہ یہاں آنے کے بعد ابیشا اور ماما کے بار بار ٹوکنے پر کبھی کبھی اسکارف لے لیتی تھی۔ اور اس وقت بھی اس نے اسکارف لیا ہوا تھا جو کہ جلدی میں وہ یہیں صوفے پر ہی بھول کر جا رہی تھی۔

’’کیا ہوا ہے ان کپڑوں کو؟‘‘ اس کا ارادہ آج گولہ باری کا نہیں تھا لیکن شاہ زر کی نظروں میں چھپا زہر لہجے سے چھلکتی گہری آگ اور جس انداز میں اس کی نظریں اس کے وجود کو چھید رہی تھیں وہ سب اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس کی نظروں کی کاٹ اور لہجے کی آگ مشعال کا رواں رواں جھلسا گئی۔ لیکن وہ پھر بھی تحمل سے پوچھنے لگی۔

تمہیں اپنا تماشا بنوانا مقصود ہے تو بصد شوق اسی دیس میں رہتیں جس کا یہ نام نہاد کلچر ’ ’ لے کر تم یہاں آئی ہو۔ ہم لوگوں کی اس علاقے میں بہت عزت ہے، لوگوں کی نگاہوں میں ایک خاص مقام ہے، ہم اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتے۔ اسی لئے آئندہ تم مجھے اس حلئے میں بھی نظر نہ آئو۔‘‘ وہ صاف صاف بات کرنا پسند کرتا تھا۔ لگی لپٹی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا کھڑا لہجہ مشعال کے لئے زہر خند تھا۔ وہ غصیلی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ کسی نے بھی آج تک اس کے حلئے پر اعتراض نہیں کیا تھا سوائے ایبشا اور ماما پاپا کے۔ اور یہ شخص بار بار اس کی تذلیل کررہا تھا۔ اب کی بار اس سے یہ برداشت نہیں ہوا تھا۔

کیا ہے عزت تم لوگوں کی اور کتنا مقام ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اپنی یہ گھٹیا ’ ’ سوچ اور شرمناک نظریں کسی اور کو دکھانا مجھے نہیں۔ تم میرے گارڈ جین نہیں ہو جو تم نے کہا میں فوراً مان لوں گی۔ اسی لئے آئندہ اپنی انرجی ویسٹ کرنے مت بیٹھ جانا۔ مسٹر شرافت وتہذیب کے علمبر دار۔‘‘ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسے اس کی نظروں کی غلاظت اور سوچ کی گندگی بھی دکھانا چاہتی تھی لیکن نجانے کونسی مصلحت تھی جو آڑے آگئی اور وہ چپ ہوگئی۔

بکواس بند کرو بے حیا لڑکی۔‘‘ وہ اس کی دوبدو چلتی زبان کو دیکھ کر چیخ اٹھا۔ ’’جو میں ’ ’ نے کہا ہے وہ تمہیں کرنا ہوگا۔ میں کسی کو رعایت نہیں دیتا۔ نجانے کیوں تم ابھی تک بچی ہوئی ہو۔ شکر کرو ابھی صرف زبان سے سمجھا رہا ہوں جس دن ہاتھ سے عمل کیا تو

پچھتاؤ گی۔ مجھے بار بار کہنا نہ پڑے اسی لئے آئندہ تم مجھے اس حلئے میں دکھائی دیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ جو غصے میں آکر ایک دم چیخ اٹھا تھا اس کے قریب آکر اس کی گھورتی آنکھوں میں اپنی نفرت و غیظ بھری آنکھیں ڈال کر انتہائی غصیلے اور اکھڑ لہجے کو کنٹرول کر کے بولا تھا۔ وہ جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

تم بھی بکواس بند کر لو اپنی۔ تم مجھ پر حکم چلانے کا کوئی حق نہیں رکھتے اور نہ ہی میں ’ ’ تمہاری زر خرید غلام ہوں جو تمہارے اشاروں پر سر کاٹ کر حاضر کر دوں گی۔ شاہ زر جہانزیب اس بھول سے نکل آؤ کہ تم کبھی مجھے زیر کر لو گے میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔ انڈراسٹینڈ..." آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جس نڈر اور بے خوف انداز میں کہہ کر وہ جانے لگی تھی شاہ زر کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ فوراً آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھی ایک دم لڑکھڑائی پھر بے پناہ غصے سے اس کی طرف گھومی۔

یو ایڈیٹ۔ چیٹ... حد میں رہو اپنی۔" غصے سے اسے بولنا مشکل ہو گیا۔ ہاتھ میں ’ ’ پکڑی کتابیں اس پر دے ماریں وہ کوسنے لگی اس وقت کو جب وہ اندر آیا تھا۔

حد میں ہی ہوں میڈم! البتہ تمہیں اپنی حدود سے تجاوز ہوتا دیکھ رہا ہوں۔" اس کے ’ ’ بازو میں اپنی انگلیاں پیوست کئے وہ انتہائی سفاکی سے کہہ رہا تھا۔ اس کے اندر تو جیسے ابال ہی آگیا۔ انتہائی نخوت سے اس کا ہاتھ پرے دھکیل کر اپنا بازو آزاد کروایا۔

مجھے اپنی مردانگی دکھانے مت بیٹھو۔ ہاتھ میں بھی اٹھا سکتی ہوں لیکن تم پر ہاتھ اٹھانا ’ ’
میں اپنی توہین سمجھتی ہوں۔" انتہائی حقارت سے کہہ کر وہ اس کے سامنے سے ہٹنے کو تھی کہ
وہ پل بھر میں دوبارہ سامنے آ گیا۔ صوفے پر پڑا اسکارف اٹھا کر اس پر پھینکا۔

ایک مرد کو للکارنے اور اس کی مردانگی کو چیلنج کرنے پر مت بھولو کہ تم ایک عام سی ’ ’
لڑکی ہو اور میں مرد۔ اس وقت تم میرے کمرے میں موجود ہو۔" اس کے سرخ
چہرے، ہوشربا وجود کو اپنی آنکھوں سے چھیدتے کہہ رہا تھا۔ شاہ زر کی بات پر ایک لحظہ کو وہ
سکتے میں آ گئی۔ کتنی گندی، گھٹیا، مغرورانہ و حاکمانہ اور سطحی سوچ تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی
تھی یہ شخص اس حد تک گر سکتا ہے اسے خود پر ندامت ہوئی۔ دکھ سے کٹ کر رہ گئی۔ جو بھی
تھا ایک عرصے سے وہ اس کے لئے بہت خاص تھا۔ اپنے اوپر سے اسکارف کھینچ کر اسے دیکھنے
لگی۔ جس کی آنکھوں کے ڈورے سرخ انگارہ تھے۔

یہ تم اوڑھ لینا۔ تم پر زیادہ سوٹ کرے گا، مسٹر غیرت مند..." اسکارف شاہ زر پر ’ ’
پھینک کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی اور شاہ زر کے پورے وجود کو آگ کے شعلوں کی نذر
کر گئی تھی۔ اس نے اپنے چہرے سے اسکارف ہٹا کر گولا بنا کر دوبارہ صوفے پر پھینک دیا۔
قریب ہی انگلش لٹریچر کی کتابیں بکھری پڑی تھیں خود ایک ہارے ہوئے جواری لیکن
احساسات کے مارے انا پرست شخص کی طرح صوفے پر گرا تھا۔

"مشعال بیگم! تمہیں یہ چیلنج بہت مہنگا پڑے گا۔ بہت مہنگا۔ ’ ’

دھواں دھواں دماغ اور سلگتی سوچوں سمیت وہ اس کے تصور سے مخاطب تھا۔

///

وہ اس خود سر و مغرور شخص کو چیلنج کر آئی تھی اور اس چیلنج کا انجام بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ بظاہر بہت سکون سے رہ رہی تھی لیکن اپنے اندر کی تلملاہٹ اور مغرورانہ وانا پرست منتقمانہ سوچ سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھی۔

آج شاہ زر کی مایوں تھی۔ سارا دن علیشہ، بھابی، ایشا کے کمروں میں چکر لگاتی رہی۔ جیسے ہی شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا، وہ کمرے میں آ گئی۔ ساری حویلی مہمانوں، رشتہ داروں اور دوست احباب سے بھری ہوئی تھی۔ سارا دن شور شرابہ، ہنگامے، سن سن کر اس کا سر دکھنے لگا تھا۔ کمرے میں آتے ہی ڈسپرین کی گولی پانی سمیت نگل لی۔ تھوڑی دیر تک بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے اندر کی ٹینشن کو باہر نکالتی رہی۔

مشعال ! ابھی تک یونہی لیٹی ہو۔ بڑی امی کا حکم ہے جلدی سے تیار ہو جائو۔ تھوڑی ’ ’ دیر بعد کھانے کے بعد مایوں کی رسم ہو گی۔" وہ اس کے کپڑے لے کر آئی تھی۔ وہ اس کے بجائے کپڑوں کو دیکھنے لگی۔ یلو ہلکے کام والا سوٹ تھا۔ کپڑوں سے ہوتی ہوئی اس کی نظر علیشہ کے مسکراتے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

اگر میں یہ کپڑے نہ پہنوں تو..." علیشہ اس کے بالکل سپاٹ، بغیر کسی تاثر والے چہرے ’ ’ کو دیکھنے لگی پھر گردن ہلانے لگی۔

تو پھر میں زبردستی تمہیں یہ کپڑے پہنا دوں گی۔ کیا ہے مشعال! آج تو مایوں ہے اور ’ ’ شادی بیاہ پر سب ایسے ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ شوخ و چنچل، تمہارے ذوق اور مائنڈ کا خیال کرتے ہوئے میں نے یہ بالکل ہلکے کام والا سوٹ منتخب کیا تھا۔ اب اگر تم نے نہیں پہنا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ تم یہ کپڑے ضرور پہن لو گی۔" وہ مان، محبت بھرے لہجے میں اسے پریشرائز کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر سر ہلا کر بستر سے اتر کر اس سے کپڑے لے لئے۔

تھینکیو سو مچ، تم کتنی اچھی ہو۔" وہ ایک دم اس کے گلے لگ گئی تھی۔ پھر اس کو چھوڑ ’ ’ کر باہر نکل گئی۔ وہ کپڑے بغور دیکھنے لگی۔ پاجامہ تھا ساتھ ہرے پیلے رنگ کی قمیص تھی جس کی سائیڈز پر ہلکا ہلکا کام تھا اور ساتھ میں لمبا سا دوپٹہ بھی تھا۔ وہ کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ کپڑے چینج کر کے وہ واپس کمرے میں لوٹی تو کمرے میں علیشہ، عشاء، نشاء اور ابیشا تھیں۔ ان کے ساتھ دو اور انجان لڑکیاں تھیں۔ اس کی نظریں سب کو چھوڑ چھاڑ ابیشا کا طواف کرنے لگیں اس پر تو نظر ٹھہر ہی نہیں رہی تھی۔ اتنا ملکوتی اور دمکتا حسن تھا وہ ورطہ حیرت میں غرق رہی۔ وہ بھی اسی کی طرح کے ہلکے کام والے سوٹ میں ملبوس تھی۔

جیولری، پھولوں اور گجروں کی یلغار نے اسے دو آتشہ کر دیا تھا۔ وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

دونوں لڑکیوں میں سے ایک ینگ سی لڑکی اسے میک اپ کر رہی تھی اور دوسری اس کا ہیئر اسٹائل بنا رہی تھی۔ وہ وہیں ٹھٹک کر سب کو دیکھے گئی۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کی

طرف چلی آئی۔ علیشہ اور عشاء دونوں اسے دیکھ کر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو چکی تھیں۔

مشعال آپی ! اگر میں لڑکا ہوتی تو فوراً آپ پر فدا ہو جاتی۔’’عشاء کے انداز پر وہ ہولے ’ ’ سے مسکرا کر ابیشا کو دیکھنے لگی۔

کیسی لگ رہی ہے ابیشا؟’’علیشہ اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کر کے پوچھنے ’ ’ لگی۔

بہت اچھی اور بہت بیوٹی فل۔’’ وہ دونوں لڑکیوں کو مہارت سے اپنا کام کرتے دیکھ ’ ’ کر کرسی کھینچ کر ادھر ہی بیٹھ گئی۔ بہت نفاست سے ابیشا کو تیار کر کے وہ اسے مخاطب کرنے لگیں۔

‘‘آئیں اب آپ کا میک اپ کر دیں۔ ’ ’

‘‘میرا...’’ وہ حیران ہوئی پھر کچھ سمجھ کر پوچھنے لگی۔’’آپ دونوں بیوٹیشنز ہیں۔ ’ ’

جی ہاں... یہ دونوں بیوٹیشنز ہیں۔ شہر سے ہم نے ان کو شادی کے لئے بلوایا ہے۔ یہ ’ ’ ولیمے تک یہیں رہیں گی۔’’علیشہ کے بتانے پر وہ اٹھ کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ بہت جلدی انہوں نے اسے بھی تیار کر دیا تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد علیشہ اور عشاء کی باری آئی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر اپنے بدلے بدلے سراپے کا جائزہ لینے لگی۔ ایک عرصے بعد اس

نے اس طرح کا لباس پہنا تھا، ڈریس، میک اپ، جیولری، گجرے، پھول، ہیئر اسٹائل سب نے مل کر اس کی شخصیت کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کی بولتی زبان جیسے میک اپ کی گہری لپیٹ میں گنگ سی ہو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے بازوئوں میں موجود گجروں بے تحاشا چوڑیوں اور انگلیوں میں موجود انگوٹھیوں کو دیکھنے لگی۔ صبح سب کے اصرار پر اس نے مہندی بھی لگوالی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھوں پر موجود مہندی کے بیل بوٹے دیکھتی رہی۔ مہندی کی خوشبو اندر کے سناٹوں میں ایک تلاطم برپا کر رہی تھی۔ اپنی مخروطی انگلیوں پر موجود کیوٹکس اور خوبصورت انگوٹھیوں کو دیکھ کر بہت جزبز ہوئی۔ تھوڑا سا ہاتھ اٹھا کر اپنے ڈھلکتے دوپٹے کو ٹھیک کرنے لگی تو کلائیوں میں موجود ساری چوڑیاں ایک دم کھنکنے لگی تھیں۔ چوڑیوں کی یہ دلفریب و دلربا کھنکھناہٹ اس کے دل و دماغ اور سوچوں میں عجیب و غریب سا ارتعاش پیدا کر گئی تھی۔ جہاں ہاتھ تھا وہیں رک گیا۔ ابیشا اپنے حلیے اور بناؤ سنگھار کے برعکس ان چاروں کے ساتھ نوک جھونک میں مصروف تھی۔ وہ خود سے مزید الجھنے لگی۔ نجانے وہ خود کیوں ایسی تھی۔ وہ آج تک نہ سمجھ پائی تھی۔

کیا عورت بس ایک ذرا سے لباس کی تبدیلی سے اس قدر انوکھی، منفرد اور پیاری لگنے ‘ ‘ لگتی ہے؟" وہ بار بار خود سے ایک ہی سوال کر رہی تھی۔

وہ بہت دفعہ بنی سنوری تھی، بہت دفعہ میک اپ بھی کیا تھا۔ اسے اپنے حسن کو اجاگر کرنے کے سارے گر ازبر تھے۔ ایک عرصے سے وہ انہیں استعمال بھی کر رہی تھی۔ قیمتی سے قیمتی

لباس، جیولری میک اپ اس کے پاس موجود تھا۔ بہت دفعہ اس نے عورتوں کے اس دلفریب وساحر روپ کو دیکھا تھا۔ آنکھیں سینکی تھیں۔ دل کو معطر کیا تھا لیکن آج اپنے اس بناؤ سنگھار میں گونجتی، کھنکتی بے نام سی جو آواز تھی، کشش تھی، ایک مہک تھی وہ سب سے مختلف و منفرد تھی۔ ہر نظر آنے والے منظر سے زیادہ دلکش تھی۔ ہر خوشبو سے زیادہ معطر تھی۔ ایک پاکیزہ سیکسک دنیا، دل کو لبھاتا ایک من بھاتا احساس تھا جو اس نے اپنی زندگی کے پچیس سالوں میں صرف آج پہلی دفعہ محسوس کیا تھا۔ کس قدر انوکھا احساس تھا۔ اس کی روح تک بے قرار ہو گئی۔ عجیب سی بے چینی روح و جسم کو شیشے سے چھیدنے لگی۔ وہ بے دردی سے لپ اسٹک سے اٹے ہونٹوں کو کچلنے لگی۔ دونوں ماہر بیوٹیشنز اپنے کام سے فارغ ہو کر اپنا سامان سمیٹ کر دونوں بہنوں کے ساتھ کمرے سے چلی گئی تھیں۔ کمرے کی خاموشی اور اندر سے اٹھنے والی ان گنت پراسرار آوازوں سے گھبرانے لگی۔ باہر جانے کا سوچ کر اٹھنے لگی تو وہاں موجود بے شمار مہمانوں اور ان کی اٹھتی نظروں سے خائف ہو کر بستر پر گر گئی۔ خود سے لڑتے لڑتے جیسے ایک دم ہار گئی ہو۔

’’میں ان کپڑوں میں خود کو بہت ان ایزی فیل کر رہی ہوں۔ چینج کر لوں۔‘‘ ابیشا اس کی بات سن کر اسے بغور دیکھنے لگی۔

’’خبردار اگر کپڑے چینج کرنے کا سوچا بھی۔ قسم سے پہلی دفعہ آپ کو ان مشرقی کپڑوں میں یوں اہتمام سے تیار دیکھ رہی ہوں۔ ایمان سے بہت اچھی لگ رہی ہیں نظر لگ

جانے کی حد تک۔" اس نے مشعال کی ٹھوڑی تھام کر تعریف کی تو وہ جھینپ گئی۔ اس کا شرمانے کا انداز اتنا پیارا اور کیوٹ تھا کہ ابیشا نے اسے بے اختیار گلے لگا لیا۔ بعد میں اپنی باتوں سے اس کا دھیان بٹانے ہیں وہ کامیاب ہو گئی تھی۔

اس وقت وہ دونوں کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھیں جب کمرے میں ماما' پاپا داخل ہوئے ان کے پیچھے بڑی امی' چچی زینب' شگفتہ بھابی' آذر بھائی' ان کی بہنیں' اسامہ علیشہ وغیرہ تھیں۔ وہ ان سب کو یوں اکٹھے اپنے کمرے میں دیکھ کر چونک گئی۔ ابیشا نے فوراً دوپٹہ اوڑھ کر ایکدم سر جھکا لیا تھا۔ وہ خالی ذہن سے اس کے جھکے سر کو دیکھنے لگی۔ سب سے زیادہ حیرانگی تو اسے اس وقت ہوئی جب پاپا اور آذر بھیا ہاتھ میں پکڑا ایک رجسٹر لے کر ابیشا کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔

لو ابیشا بیٹا! یہاں پر دستخط کر دو۔" ان کے کہنے پر وہ کبھی انہیں اور کبھی باقی سب کو ’ ’ دیکھنے لگی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کی سمجھ سے سب بالاتر تھا۔

یہ سب کیا ہے پاپا؟" اس سے پہلے کہ ابیشا واقعی دستخط کرتی اس نے اس کے ہاتھ ’ ’ سے قلم چھین لیا۔ دل اندر ہی اندر انجانے وسوسوں سے بند ہونے والا تھا۔

نکاح ہو رہا ہے۔" پاپا نے بہت رسانیت سے اس کی طرف دیکھ کر اس کے ہاتھ سے ’ ’ قلم لینا چاہا لیکن اس پر تو جیسے ہفت آسمان آ گرے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھنے لگی۔

نا... نا نکاح ہو رہا ہے لیکن کس سے؟” شاک اس قدر گہرا تھا کہ وہ بمشکل پوچھ پائی۔ ’ ’ سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کے انجانے خوف اور وسوسوں کی تصدیق کرتا پاپا نے اس کے ہاتھ سے قلم لے کر دوبارہ ابیشا کو تھما دیا۔

نہیں ابیشا...” اس نے اسے روک دیا۔ “آپ اس کا نکاح کر رہے ہیں اور مجھے بتایا تک ’ ’ نہیں۔” وہ دکھ سے ان سے پوچھنے لگی۔ لیکن وہ کوئی بھی جواب دیئے بغیر ابیشا کو دستخط کرنے کا اشارہ کرنے لگے۔ اپنی بے وقعتی پر تو مشعال کا دماغ گھوم گیا تھا۔ کوئی اسے قابل توجہ ہی نہیں سمجھ رہا تھا۔ مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا تھا۔ وہ دکھ سے رونے لگی۔

شگفتہ آپ پلیز اسے باہر لے جائیں۔” اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ قلم چھین کر ابیشا کو ’ ’ سائن کرنے سے روکتی‘ آذر بھیا نے بھابی کو کہا وہ اس کا بازو پکڑ کر تقریباً کھینچ کر کمرے سے باہر لے گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور وہ کیا کرے۔ بے بسی سے روئے جا رہی تھی‘ زار و قطار‘ اس کی کومل و نرم جذبوں والی سجل و معصوم سی بہن ایک اجڈ‘ گنوار‘ پڑھے لکھے وحشی کے پلے باندھی جا رہی تھی۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بے اختیار بھابی سے اپنا بازو چھڑا کر وہ دوبارہ اندر کی طرف بھاگی تو بھابی نے اس کا راستہ روک لیا۔

پلیز مشعال‘ جو ہو رہا ہے اسے ہونے دو۔” انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ’ ’ تو وہ انہیں ایک طرف دھکیل کر اندر جانے لگی تھی لیکن انہیں دھکا بہت زور کا لگا تھا۔ بھابی

ایک دم فرش پر گری تھیں۔ ان کا ہونٹ دانت کی نوک لگنے سے پھٹ گیا۔ وہ توجہ دیئے بغیر دروازہ پیٹنے لگی جو اندر سے لاک ہو چکا تھا۔

پاپا پلیز دروازہ کھولیں۔" زور زور سے دروازہ پیٹتے وہ چیخ رہی تھی۔ شاہ زر جو سیڑھیوں کے سرے پر کھڑا ریلنگ تھامے ساری صورتحال دیکھ رہا تھا۔ بھابی کو گرتے دیکھ کر وہ بھاگ کر بھاگی کی طرف آیا۔ انہیں زمین سے اٹھایا تو ان کا نچلا ہونٹ خون بہنے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ حواس کھونے لگا۔ انہیں چھوڑ کر مشعال کا بازو دبوچ کر اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا تھا۔ وہ جو رو اور چیخ رہی تھی یکدم ساکت ہو کر اس وحشی انسان کو دیکھنے لگی۔

شاہ زر! چھوڑ دو مشعال کو۔" بھابی شاہ زر کے اشتعال انگیز رد عمل اور غصے سے ڈر کر اسے اس کی سخت گرفت سے چھڑانے لگیں۔

اس نے کیا سمجھ کر آپ کو دھکا دیا ہے۔ میں مار دوں گا اسے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔" وہ شدید غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ بھابی اس کا بازو چھڑوا کر اسے ایشا کے کمرے میں لے آئیں۔ نیچے حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کو معاملے کی کوئی سن گن لگے۔ اور وہ رو رہی تھی بڑی شدت سے۔ اس قدر ناقدری ہوئی تھی، اس کی یہاں۔ وہ بے یقین تھی۔ وہ بری تھی، وہ مانتی تھی لیکن ماما پاپا نے اس کے ساتھ وہ کچھ کیا تھا جو کوئی بھی ماں باپ اپنی اولاد کیساتھ نہیں کرتے، بھابی نے خاموشی سے اسے رونے دیا۔

کس سے ہو رہا ہے اس کا نکاح... کیا شاہ زر سے؟" روتے روتے سر اٹھا کر وہ ان سے ’ ’ خود ہی سوال کر کے جواب مانگنے لگی۔ انہیں اس پر بے پناہ ترس آیا۔ اپنی پرواہ کئے بغیر اس کے پاس بیٹھ کر اس کا چہرہ اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔

نہیں شاہ زر سے نہیں بلکہ شاہ میر سے اس کا نکاح ہوا ہے۔" جواب کے جواب پر وہ ’ ’ آنکھیں حیرت سے پھیلائے بے یقین کیفیت میں انکا چہرہ دیکھنے لگی۔ جہاں واقعی سکون رقم تھا۔

شاہ میر سے؟" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ بھابی نے سر ہلا دیا۔ اسے تو گویا اک نئی ’ ’ زندگی ملی تھی۔ وہ جو ہولناک تصور کر رہی تھی ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ اس کی نفیس اور مختلف سی بہن ایک قدردان شخص سے منسوب ہوئی تھی۔ وہ ہی جو اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔ وہ فوراً اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

لیکن بھابی! یہ اتنی رازداری کیوں برتی گئی۔ کیا میں اتنی ہی بری اور غیر اہم تھی کہ ’ ’ کسی نے مجھے بتانا تک گوارا نہ کیا۔" خیال آتے ہی وہ پھر رونے لگی۔ شاہ زر کا تھپڑ تو جیسے یاد ہی نہیں تھا۔ ماما پاپا نے جو ناقدری اور غیر اہم ہونے کا تھپڑ اس کے چہرے پر مارا تھا وہ تو شاہ زر کے مارے گئے تھپڑ سے کئی گنا زیادہ تکلیف دہ تھا۔ بھابی اسے چپ کرانے لگیں لیکن وہ اور زیادہ بکھرتی جا رہی تھی۔

’ ’کیوں کیا بھابی! سب نے ایسا؟ کیوں کسی نے مجھے بتایا تک نہیں۔” وہ بھابی سے شکوہ کرنے لگی۔ رونا تو ویسے ہی آرہا تھا۔ بے اختیار` بے پناہ۔

’ ’سب کا خیال تھا کہ تم انکار کر دو گی اسی لئے کسی نے تمہیں بتانے کی کوشش نہیں کی۔”

’ ’چلیں یہ تو ابیشا کی بات ہے۔ مجھے تو کسی نے یہ بھی بتایا تک نہیں کہ شاہ زر کی شادی ہو کس سے رہی ہے۔ آپ سب نے مجھ سے چھپایا ہے حتیٰ کہ نوکروں تک کو مجھے بتانے سے منع کر دیا گیا ہے۔” اس نے ایک اور شکوہ کیا۔ بھابی نظریں چرانے لگیں۔

’ ’پلیز بھابی! مجھے بتائیں` اس حویلی میں کیا ہو رہا ہے؟ پلیز بھابی` میری خاطر مجھے بتائیں` اصل بات کیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے یہ اور کیا ہونے والا ہے؟ بتائیں پلیز نہیں تو میرا دل بند ہو جائے گا۔ میں ساری زندگی خود کو سنبھالتی آرہی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اب بکھر جاؤں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ جیسے ابھی کچھ اور ہونا ہے` جیسے ابھی کوئی اور سازش باقی ہے۔ پلیز بھابی!” وہ ان کے ہاتھ تھام کر منت پر اتر آئی۔

’ ’پلیز بھابی...” وہ مزید عاجزی پر اتر آئی۔

’ ’شاہ زر کی شادی تم سے ہو رہی ہے۔” ایک طویل گہری سانس خارج کرتے انہوں نے آخرکار انکشاف کر ہی دیا تھا۔

واٹ...؟" انکشاف کا یہ بم پہلے سے زیادہ تباہی مچا گیا تھا۔ گویا کمرے کی چھت اس پر ’ ’ آ گری تھی۔ بے یقین نظروں سے بھابی کو دیکھے گئی۔

نہیں... دھوکہ ہے... جھوٹ ہے... بالکل غلط... آپ پلیز کہہ دیں جھوٹ ہے یہ... میں ’ ’ غلط سن رہی ہوں۔" وہ ان کے ہاتھ جھٹک کر پھٹ پڑی تھی۔

دھوکہ ہوا تھا اسکے ساتھ' یہاں سب کچھ پہلے سے طے تھا۔ باقاعدہ ایک پلاننگ کے تحت یہ سب ہوا تھا۔ پاپا کا مقصد اسے پاکستان لانا تھا اور اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اسے پاکستان لے آئے تھے۔ یہاں آکر انہوں نے اس کی طرف سے بالکل منہ موڑ لیا تھا۔ وہ اپنی خجالت و شرمندگی مٹانے کو سب سے الجھتی رہی۔ سب بالا ہی بالا طے تھا اور وہ کم عقل سمجھتی رہی کہ ماما پاپا اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ اسے تو ماما سے کبھی توقعات تھی ہی نہیں لیکن انجانے میں ہی سہی وہ پاپا پر کافی اعتماد کرتی تھی۔ لیکن ان کی خاموشی میں چھپا طوفان وہ اب جان پائی تھی۔ انہوں نے پہلے باقاعدہ منصوبے کے تحت شاہ میر اور ابیشا کا نکاح کروایا تھا اور اب کل اس کی شادی شاہ زر سے کروا دیں گے۔ ساری اسکیم ایک دم اس پر کھلتی گئی تھی۔ اسے اپنا آپ ایک گہری دلدل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاہ زر کا وجود ایک گندگی ہے اور اب اس کے ماں باپ اسے بھی اس گندگی کے ڈھیر میں داخل کر دیں گے پھر وہ... مزید سوچتے اس کی سانسیں بند ہونے لگیں۔

ساری عمر اس سفاک انسان کے لئے تختہ مشق بنی رہے گی۔

ساری عمر اس ناپسندیدہ بندے سے وابستہ رہے گی۔

جس کے ساتھ زندگی گزارنے کی کبھی اس نے چاہ نہیں کی تھی' اب کھلا کہ وہ اسی سے رشتے ناطے جوڑنے پر مجبور تھی۔ یہ کیسی چاہ تھی' کیسی بے بسی تھی' یا کیسا جنون تھا؟ اسے ایک ایک کر کے شاہ زر کے سارے رویے یاد آتے گئے۔ پہلے دن سے لے کر اب تک کے سارے رویے۔ نس نس میں چنگاریاں بھرنے لگیں ان کی بات پر تن تنا کر کمرے میں چکر لگانے لگی۔

' 'نہیں... نہیں بھابی... یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں یہ کبھی بھی نہیں ہونے دوں گی۔'' بھابی اس کے ارادے دیکھ کر دہل گئیں۔ جذبات میں بہہ کر ان کے منہ سے سچ نکل گیا تھا لیکن مشعال کاری ایکشن دیکھ کر پچھتانے لگیں۔ اپنی جلد بازی اور کم صبری پر ہاتھ ملنے لگیں۔ سب نے کس قدر سختی سے اسے کچھ بھی بتانے سے منع کیا ہوا تھا۔ وہ اس کا اسقدر شدید ردعمل دیکھ کر ڈر گئیں۔

' 'سن لیں بھابی! اور سب کو جا کر کہہ دیں یہ کبھی بھی نہیں ہو گا۔ میں اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ سب ختم کر دوں گی اگر کسی نے یہ سوچا بھی۔ میں مار ڈالوں گی خود کو لیکن اس کمینے رذیل انسان کے ناپاک ارادوں کو پورا نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ کھا جانے والی نظروں سے انہیں دیکھتی کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ اپنے کمرے میں واپس آئی تو وہاں سوائے ابیشا اور ماما کے اور کوئی نہیں تھا۔

ہو گیا تمہارا نکاح؟" وہ چبا چبا کر کہتی چبھتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ابیشا نے سر جھکا لیا۔

ابیشا، ماما اور پاپا آپ سب لوگ کتنے. بڑے ایکٹرز ہیں لیکن افسوس میں جو خود کو بہت عقل مند تصور کرتی تھی آپ لوگوں کو نہ سمجھ سکی۔ اتنا بڑا دھوکا دیا تم لوگوں نے مجھے، کتنی حیرت کی بات ہے نا... جنہیں میں آج تک دھوکہ نہ دے پائی انہوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ جنکی خاطر میں اتنی دور یہاں آگئی انہوں نے ہی میرے ساتھ دغا بازی کی۔ جن کو میں آج تک اپنا محافظ سمجھتی رہی وہ لٹیرے بن گئے میرے احساسات کے میرے اعتماد کے، جنکی ذات پر مجھے ساری دنیا سے. بڑھ کر یقین تھا انہوں نے میری ذات کا فخر اور اعتماد مجھ سے چھین لیا۔ ذروں سے بھی حقیر کر دیا ہے آپ لوگوں نے مجھے، ماما، ابیشا، دیکھیں میں ذروں سے بھی حقیر ہو گئی ہوں۔ اتنا سستا سمجھ لیا تھا مجھے جو یوں دو ٹکے کے انسان کو سونپ رہے ہیں۔ اتنی بے مایا وارزاں تھی جو آپ لوگ یوں تنکوں کی طرح فضا میں بکھیرنے کی دھن میں مست ہیں؟ آخر کیا ہوں میں؟ اور کیا ہیں آپ؟" وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔ "لیکن ماما یہ جان لیں اچھی طرح میں ابیشا نہیں ہوں میں مشعال ہوں۔ ابیشا نے آپ کے فیصلے پر برضا و رغبت گردن جھکائی لیکن مشعال نہیں جھکائے گی اور نہ ہی مجھے آپ میں سے کوئی اس رذیل انسان سے شادی پر مجبور کر سکتا ہے۔" اس کی آخری بات پر ماما نے بہت حیران ہو کر ابیشا کو دیکھا۔ اس کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔

کیوں... ؟ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں آپ دونوں۔ آپ کا خیال تھا کہ جس طرح عین وقت پر ابیشا کے سلسلے میں مجھے چپ کروا دیا ہے اسی طرح اس کمینے انسان کے لئے بھی پریشرائز کر لیں گے لیکن ماما! آئی سے ٹو سوری۔ آپ کی اسکیم الٹ گئی۔ ساری پلاننگ اور منصوبہ بندی غارت گئی۔ کیونکہ مجھے سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔ وہی بات جو آپ سب لوگ مجھ سے چھپاتے رہے ہیں انجانے میں ہی مجھے پتا چل گئی۔ کاش آپ کے یہ چہرے دیکھنے سے پہلے میں مر جاتی، کاش آپ کے ساتھ یہاں آنے سے پہلے مر جاتی۔ کاش یہ رشتہ کبھی نہ ہوا ہوتا، کاش میں کبھی پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی، میں مر تو سکتی ہوں ماما! لیکن یہ شادی کبھی نہیں کروں گی اور سن لیں یہ صرف آپ کا فیصلہ ہے۔ اور آپ جانیں میں بہت پہلے اس رشتے کو ختم کر چکی تھی۔ اب میرا اس شخص سے کوئی تعلق نہیں ہے آپ میری پسند اور مرضی کے بغیر میری شادی نہیں کر سکتے۔ جب میرے اسلام نے مجھے پسند ناپسند کا حق دیا ہے تو پھر آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے یہ حق چھیننے والے۔”

اس کا دل پاتال میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ روتی رہی تھی، اعصاب تو جیسے ٹوٹنے بکھرنے کے صبر آزما مراحل سے گزر رہے تھے۔ وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی چٹان کی طرح سخت رہی تھی کبھی کسی کے سامنے آنکھ سے آنسو ٹپکنے نہیں دیا تھا۔ کبھی کسی کے سامنے کمزور نہیں پڑی تھی۔ سب سمجھتے تھے یہ اونچی کھڑی ناک والی مغرور مشعال کبھی بھی نہیں رو سکتی لیکن اسے آج علم ہوا کہ وہ برسوں سے رو رہی ہے قطرہ

قطرہ' دل ختم ہوتا جارہا ہے۔ وہ برسوں کسی کی تلاش میں رہی تھی لیکن آج بالکل بے بس ہوگئی تھی۔ ساری جستجو ایک نقطے پر جم کر اپنا مرکز کھو بیٹھی تھی۔ وہ برسوں خود کو تنکا تنکا کر کے اکٹھے رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی آج صرف اپنے ماں باپ کی ناقدری کے سبب اندر تلک ٹوٹ گئی تھی۔ کرچی کرچی ہو کر لہولہان ہوگئی تھی۔ کوئی سمیٹنے والا نہیں تھا۔ کوئی درد کا درماں نہیں تھا۔ کوئی آنسو جو نہیں تھا' کوئی رفوگر نہیں تھا۔ وہ اس بھیڑ میں اپنے لوگوں کے ہجوم میں کہاں جاتی یہاں تو اسے اپنا کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے سب نقاب اوڑھے ہوئے ہیں اگر اس نے نقاب اٹھانے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو اندر سے بھیانک چہرے نکلتے چلے آئیں گے۔ وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

اتنے دنوں کی تیاریاں اور سرپرائز وہ اب سمجھ پائی تھی۔ جب صرف ایک رات کا وقت بچا تھا۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ سامنے زہریلا ناگ اسے نگلنے کو پھن پھیلائے کھڑا تھا اور پیچھے کھائی تھی؟ اسے بچاؤ کا راستہ نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ دائیں بائیں دیواریں ہی دیواریں تھیں۔
رشتوں کی دیواروں نے اس کے پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔ ان دیکھی زنجیروں میں' وہ کیسے بھاگتی؟ کیسے بچتی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک سب نے اس کے سامنے ایک بھرپور ایکٹنگ کی تھی۔ کتنی قابل سراہ ومداح تھی کہ اسے شبہ تک نہ ہونے دیا۔ وہ بری تو ڈنکے کی چوٹ پر تھی۔ نہ کبھی غلط کیا تھا اور نہ سوچا تھا۔ نہ لگی لپٹی رکھی تھی۔ جو دل میں ہوتا وہی نوک زباں پر سجاتی تھی۔ ہمیشہ اپنا

خیال رکھا تھا۔ چاہتی تو جولف سے شادی کر کے ماما پاپا کو خبر کر دیتی، یہ سب کرنا اس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اس معاشرے میں ہر کوئی اسی طرح شادیاں رچاتا ہے لیکن اس نے یہ سب نہیں کیا تھا۔ وہ ہر کام بہت فیئر ہو کر کرتی تھی۔ اپنے ہر معاملے میں ان کی رضا ملحوظ خاطر رکھتی تھی۔ ان کی دعاؤں میں ہی اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ ان کی رضا کی خاطر ہی تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ماما پاپا کے ساتھ آنا پڑا تھا۔ اور یہاں آ کر وہ موڑ موڑ پر زخمی ہوئی تھی۔ ابیشا اس کو یوں پھوٹ پھوٹ کر بکھرتے روتے دیکھ کر سنبھالنے لگی۔ اسے تو جو چوٹ لگی تھی وہ ناقابل مرہم تھی۔ پھر بھلا درد میں کیسے کمی آتی وہ پتھر بنی روتی رہی، ابیشا کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

کتنا تضاد ہوتا ہے لوگوں کے ظاہر و باطن میں، جن کے ساتھ وہ.برسوں رہی، انہوں نے اسے یوں.بری طرح توڑ پھوڑ دیا تھا۔ وہ کس سے شکوہ کرتی؟ اس شاہ زر سے جو بارہا اس پر ہاتھ اٹھا چکا تھا۔ جس نے کئی دفعہ اپنے غلیظ خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے شکوہ کرتی جن کی حویلی میں وہ اس وقت موجود رو رہی تھی لیکن کس بنیاد پر اسے دکھ تو اس کے اپنے والدین نے دیا تھا۔ اسے تنکوں سے بھی ہلکا کرنے والے اس کے ماں باپ تھے۔ بے بس ولاچار اور تنہا کرنے والے کوئی اور نہیں تھے اسے اپنے جنم دینے والے تھے۔ اس کا اعتماد ریزہ ریزہ کرنے والا کون تھا، کوئی بھی نہیں سوائے اس کے اپنوں کے جنہیں وہ ایک مدت چاہتی آئی

تھی۔ کبھی کھل کر اظہار نہیں کیا تھا۔ محبت کے لئے لفاظی نہیں کی تھی لیکن کبھی بے خبر بھی نہیں رہی تھی۔

وہ لاکھ نادان، بری اور قابل سزا تھی لیکن اس قدر بھی نہیں کہ اس گھٹیا سزا کی حقدار ٹھہرتی۔ اسے کمرے کے ماحول میں شدید گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ سانس لینا دشوار تھا وہ یہاں سے کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ بہت دور، سات سمندر پار، انہی غیروں کے دیس میں جہاں وہ کم از کم ہرٹ تو نہیں ہوتی تھی۔ جہاں وہ اپنی مرضی سے جو چاہتی تھی کر دکھاتی تھی۔ کوئی اسے چیلنج بنا کر ہرانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ ایشا اور ماما کی طرف دیکھے بغیر فوراً اٹھی تھی اور بھاگتی ہوئی زینہ طے کر کے نیچے آگئی۔ سارا سولہ سنگھار بہہ چکا تھا۔ ہاتھوں میں موجود گجرے نوچ کر فرش پر پھینک دیئے۔ سرخ گلاب جو اس کے آنسوؤں کی شدت کے گواہ تھے اس کے اپنے ہی پیروں کے نیچے آکر کچل گئے۔ اپنی بے قدری پر وہ بھی چیخے تھے لیکن اوروں کی طرح اس نے بھی اپنے اوپر بے حسی و سفاکی کا خول چڑھالیا تھا۔ راستے میں آنے والے کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر وہ باہر صحن میں آگئی۔ پاپا مردوں میں کھڑے تھے۔ ایک لمحہ کو رکی تھی پھر سر جھٹک کر وہ ان تک پہنچی ان کے ارد گرد مختلف لوگوں کے علاوہ آذر بھائی، شاہ زر اور شاہ میر بھی تھے۔ وہ باقی سب کو نظر انداز کئے پاپا سے مخاطب ہو گئی۔ کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر بالکل اٹل لہجے میں۔

پاپا! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے؟” وہ چند لمحے اس کے فیصلہ کن دوٹوک لہجے پر غور کرتے اس کی سپاٹ نگاہوں میں دیکھتے رہے پھر گردن ہلا کر اس کے ساتھ چلے آئے۔ ’ ’ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے وہ پھٹ پڑی۔

پاپا! مجھے شاہ زر سے شادی نہیں کرنی ہے۔ آپ اپنا وعدہ یاد کریں' آپ نے کہا تھا کہ ’ ’ ”آپ مجھے واپس بھجوادیں گے تو پھر اب آپ اپنے وعدے سے کیوں پھر رہے ہیں۔

اوہ... تو تمہیں علم ہو گیا ہے۔ تم سے تو وعدہ میں نے اب کیا ہے لیکن آج سے پچیس ’ ’ سال پہلے جب تم پیدا ہوئی تھیں تب ایک وعدہ میں نے جہانزیب بھائی' اماں جی اور آغا جی سے بھی کیا تھا۔ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی میں اپنے وعدے سے کسی بھی صورت منکر نہیں ہو سکتا۔ ہر حال میں مجھے ایک وعدہ نبھانا ہے اور میں یہ وعدہ نبھاؤں گا۔ تم کو ہر حال میں شاہ زر سے شادی کرنا ہو گی اور یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔” پاپا کو اس کا یوں دوٹوک انداز بہت ناگوار گزرا تھا۔ تحمل سے مگر سخت لہجے میں اسے باور کرانے لگے وہ چیخ گئی۔

نہیں پاپا! آپ اتنی بڑی زیادتی نہیں کر سکتے۔ میری پسند کے بغیر زبردستی نہیں ’ ’ کر سکتے۔ میں اپنے فیصلے کے سوا کسی کے بھی فیصلے کو نہیں مانتی۔” وہ نفی میں سر ہلاتے کہہ رہی تھی۔

حیرت ہے پاپا! آپ کو قبروں میں موجود مردہ لوگوں سے کیے گئے وعدوں کا اتنا پاس ’ ’ ہے اور جو زندہ ہیں ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں آپ کی نظر میں۔” وہ ترشی سے کہہ رہی تھی۔

مشعال ! بات کرتے وقت ادب و آداب کو مت بھولا کرو۔ یاد رکھو میں تمہارا باپ ’ ’ ہوں تم سے کچھ بھی منوانے کا حق رکھتا ہوں۔ اور اس وقت تم برطانیہ میں نہیں پاکستان میں ہو۔“ انہوں نے سخت لہجے میں کہہ کر اپنی اصلیت دکھادی تھی۔ وہ تاسف سے سر ہلانے لگی۔

☆...☆...☆...☆...☆...☆...☆

یہی یاد رکھ کر تو میں اذیت سہہ رہی ہوں پاپا! کاش مجھے یہاں آنے سے قبل نقاب کی ’ ’ لپیٹ میں چھپا آپ کا یہ دوغلا چہرہ نظر آ جاتا تو یہاں آنے کا میں کبھی نہ سوچتی۔ مر جاتی لیکن آپ کی بیٹی کہلوانا گوارا نہ کرتی۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں اس خاندان میں اور بھی بہت ساری لڑکیاں ہیں جس سے مرضی اس اپنے بد تہذیب یتیم بھتیجے کی شادی کر دیں لیکن مجھ سے نہیں' آپ کو اگر مردہ قبروں میں موجود لوگوں سے کئے گئے وعدوں کا اتنا پاس ہے تو ایک زندہ جیتے جاگتے وجود سے ایک وعدہ میں بھی کر آئی ہوں۔ میں وہ وعدہ ہر حال میں نبھاؤں گی' چاہے مجھے اپنی جان بھی گنوانی پڑے تو دریغ نہیں کروں گی۔“

وہ ان ہی کی بیٹی تھی۔ اسی خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کی رگوں میں اسی خاندان کا خون دوڑ رہا تھا۔ وہ کسی سے ڈرتی نہیں تھی' پھر یہ بولڈنیس تو ان کی اپنی عطا کردہ تھی وہ کیونکر مانتی۔

صاف کہہ کر ان کو سوچتا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ کمرے میں آکر بستر پر گر گئی۔ ماما کمرے میں موجود نہیں تھیں اور ابیشا نے اس سے ایک دو دفعہ بات کرنا چاہی تو اس نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ وہ بے چاری دل مسوس کر رہ گئی۔

‘‘میرا کیا قصور ہے؟... مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟’’ وہ رونے لگی تھی وہ تلخی سے اسے دیکھنے لگی۔

‘‘تمہارا یہ قصور ہے کہ تم اس سازش میں برابر کی شریک تھیں۔ میں تمہاری آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تمہاری ہر بات مان لیتی تھی صرف اور صرف تمہاری خاطر یہاں تک چلی آئی اور تم نے بھی اوروں کی طرح ہی مجھے دھوکا دیا۔ کاش میں تمہیں سمجھ سکتی۔’’

‘‘نہیں مشعال آپی! خدا گواہ ہے میں نے کبھی آپ کے لئے برا نہیں چاہا تھا۔ میں تو خود کچھ نہیں جانتی تھی۔ مجھے بھی یہیں آکر حویلی میں ہی پتا چلا کہ مما پاپا آپ کی شادی وہیں شاہ زر بھائی کے ساتھ طے کر کے آئے ہیں۔’’

‘‘ہونہہ... بہت اچھی طرح جھوٹ بول لیتی ہو' اتنی صفائی سے کہ اوروں کو تمہاری اصلیت دکھائی ہی نہیں دیتی۔ تم تو اتنی بے خبر ہو کہ یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ تمہارا آج شاہ میر سے نکاح ہو رہا ہے۔ ہے نا! بلکہ مما پاپا نے زبردستی تمہیں اس کی بیوی بنا دیا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ کتنی صفائی سے تم بول گئی ہو۔’’ وہ حقارت سے طنز کرنے لگی۔

‘‘ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی اور شاہ میر سے نکاح کے متعلق مجھے صبح ہی مما پاپا سے پتا چلا ہے۔’’ وہ صفائی پیش نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مجبور ہو گئی تھی۔

“اچھا... واقعی... کچھ علم نہ تھا... میں اب تمہاری کسی بھی بات پر یقین نہیں کروں گی... جھوٹ ہے... اور سب دھوکا ہے...” وہ واقعی ابیشا کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔

“سنو، تمہیں علم تو ہوگا کہ میرا پاسپورٹ کہاں ہے؟” ابیشا کے مسلسل بہتے آنسوئوں نے اسے اپنا غصہ کم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

“ہاں علم تو ہے لیکن...” وہ مشعال کے ارادے کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔

“تو پلیز ابیشا! میری اچھی سسٹر! مجھے وہ لا دو۔ میں یہاں سے چلی جانا چاہتی ہوں۔ ایک منٹ بھی اس جہنم میں نہیں رک سکتی۔ دم گھٹ رہا ہے میرا اس قید خانے میں۔ پلیز میرا یہ کام کر دو۔ میں ساری عمر تمہاری مشکور رہوں گی۔ پلیز ابیشا!...” وہ جو کسی کے سامنے کبھی جھکی نہیں تھی اس وقت منت سماجت کر رہی تھی۔ رو رہی تھی۔

“لیکن...” وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

“پلیز انکار مت کرو۔ نہیں تو میں مر جائوں گی۔ یا پھر اس شخص سے شادی رچانے سے پہلے خود کو ہی مار ڈالوں گی اور تم جانتی ہو میں جو ایک دفعہ کہتی ہوں کر دکھاتی ہوں۔” وہ اسے دھمکی دینے لگی۔ وہ مشعال کی دھمکی اور خاص طور پر سنجیدگی دیکھ کر ڈر گئی۔

تم صرف ایک دفعہ میرا پاسپورٹ لادو۔ بس میں اس گاؤں سے نکل جانا چاہتی ’ ’ ہوں۔ آگے مجھے کیا کرنا ہے وہ میں اچھی طرح سوچ چکی ہوں۔" وہ عاجزی پر اتر آئی تھی۔ ابیشا کے لئے اسے انکار کرنا مشکل ہو گیا۔

یہ...جو شادی ہو رہی ہے۔ اس کا کیا ہو گا؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ زہر خند ہنسی۔ ’ ’

میں نے بارہا انکار کیا ہے پھر بھی میری مرضی اور پسند کے بغیر یہ سب کیا جا رہا ہے۔ ’ ’ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید کہیں گنجائش نکل آتی۔ اب یہ ناممکن ہے۔ میں اس شخص سے ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گی۔" اس نے صاف جواب دیا۔

او کے... فی الحال میں کوشش کرتی ہوں کہ آپ کا پاسپورٹ آپ کو لادوں۔ آپ ’ ’ "ریلیکس ہو جائیں۔

نہیں ابیشا کوشش نہیں تمہیں ہر حال میں میرا یہ کام کرنا ہو گا کسی کو بغیر بتائے اور ’ ’ خبر کئے۔ نہیں تو تم مجھ سے اچھی طرح باخبر ہو کہ میں کس حد تک جا سکتی ہوں۔" اس کا سرد مہر انداز حتمی اور سنجیدہ تھا۔ وہ اس میں چھپی دھمکی اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ برسوں کا ساتھ تھا۔

دھیان سے ’اگر کسی کو علم ہو گیا تو..." ابیشا کی متفکر آواز پر اس نے سر ہلایا۔ ’ ’

ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح چھٹا نہیں تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں ستارے ابھی بھی موجود تھے۔ اذان ہوتے ہی وہ منہ اندھیرے اپنے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ احتیاطاً اس نے ابیشا کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ شولڈر بیگ میں دو شرٹس اور جینز ٹھونس رکھی تھیں۔ ابیشا نے اسے اس کا پاسپورٹ اور ساتھ میں تھوڑی بہت رقم بھی لادی تھی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنے گلے میں موجود بھاری طلائی چین' انگلیوں سے انگوٹھیاں اور کانوں سے ٹاپس اتار کر اس کو پہنا دیئے تھے۔ بظاہر یہ ہلکا پھلکا زیور تھا لیکن کس قدر قیمتی اور بیش بہا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے سفر میں ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ رکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے ابیشا کے اصرار کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ پھر اس نے آخری تحفہ سمجھ کر سب چیزیں پہن لی تھیں۔ ابیشا اس کے لئے بہت بڑا رسک لے رہی تھی۔ وہ دل سے اس کی مشکور تھی۔ بڑی سی چادر لپیٹ کر وہ جیسے ہی گیٹ کے پاس پہنچی پیچھے سے آتی آواز سن کر رک گئی۔ درخت کے عقب میں جائزہ لیتی ابیشا کا دل بھی بند ہونے والا تھا۔ آواز سن کر۔

’’کون ہو تم؟‘‘ آواز پر پلٹ کر اس نے دیکھا تو چوکیدار تھا۔ اس نے پرسکون سانس لی۔ دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

’’میں ہوں خان بابا! بس یہ نزدیکی کھیتوں تک جا رہی ہوں۔‘‘ اپنا چہرہ اس نے اس کی طرف سے چھپاتے ہوئے بہت آہستہ آواز میں جواب دیا۔

اتنی صبح... نہیں چھوٹی بی بی صاحب! بڑے سرکار نے اتنی صبح کسی کو بھی کہیں جانے ’ ’ سے منع کر رکھا ہے۔ آپ اندر چلی جائیں۔" چوکیدار نے اسے صاف لال جھنڈی دکھا دی تھی۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی واپس لان کی جانب آ گئی۔ درخت کے پیچھے کھڑی ابیشا فوراً نکل کر اس کے سامنے آئی۔

اب کیا ہو گا؟" وہ بہت ہراساں ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی اچانک ایک خیال ذہن میں ’ ’ آیا۔

آئو میرے ساتھ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر حویلی کے عقب میں آ گئی۔ "میں ادھر سے ’ ’ چلی جائوں گی۔ بس تم اپنا خیال رکھنا اور پلیز کسی کو ہرگز مت بتانا۔" چادر کو احتیاط سے لپیٹ کر وہ اسے گلے لگا کر کہنے لگی تو وہ رو دی۔

‘ ‘ لیکن آپ یہاں سے جا کر آگے کیا کریں گی؟ ’ ’

اللہ مالک ہے' کچھ نہ کچھ تو کر ہی لوں گی جب قدم باہر نکالنے کا سوچ ہی لیا ہے تو پھر ’ ’ مصیبتوں سے کیا ڈرنا' بس اس منحوس گائوں سے ایک دفعہ نکل جائوں۔" اسے تسلی دے کر وہ احتیاط سے بیگ کندھے پر ڈال کر درخت پر چڑھنے لگی۔ درخت اتنا بڑا نہیں تھا' صبح کے اندھیرے میں وہ فوراً چڑھ گئی تھی۔ پھر درخت سے دیوار پر پائوں رکھ کر ابیشا کو آخری نظر دیکھا وہ ہاتھ ہلا رہی تھی۔ وہ بھری آنکھوں سے "خدا حافظ" کہہ رہی تھی۔ اس کی اپنی آنکھیں

بھی بھرنے لگیں۔ چند سیکنڈز اسے کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر الوداعی نظر ڈال کر دیوار کی دوسری جانب چھلانگ لگادی۔

کافی اونچی دیوار تھی۔ فوراً زمین پر گرنے سے اسے دو جھٹکے لگے تھے اس کی ساری چولیں ہل گئی تھیں۔ پھر فوراً اپنے حواس بحال کر کے ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند منٹ سوچتی رہی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دور دور تک وسیع و عریض کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آج کل تو فصل بھی کٹی ہوئی تھی۔ نہیں تو وہ اوٹ میں آرام سے نکل جاتی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے راستے کا تعین کیا۔ بچپن کا راستہ تو کھیتوں میں سے ہوتا ہوا پکی سڑک تک جاتا تھا۔ اب وہ راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر شش وپنج میں مبتلا رہی' پھر بسم اللہ کہتی ہوئی ایک کچے راستے پر ہولی۔

بہت ہی احتیاط سے چلتے ہوئے بھی کھیتوں میں پانی بھری جگہوں پر گرتے گرتے بچی تھی۔ اس نے فرار کا کافی مشکل راستہ منتخب کیا تھا۔ اندھیرے کی کالی سیاہ چادر ہٹی تو سورج کی روشنی ہر سو پھیلنے لگی۔ مرد اپنے جانوروں کو ہانکتے کھیتوں میں آنے لگے تھے۔ بعض عورتیں بھی کھیتوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ کچے راستوں پر بہت تیز نہیں چل سکتی تھی جبکہ وہ یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ حویلی والے اس کو موجود نہ پا کر اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ کافی دیر تک چلتے چلتے اس کے پائوں تھکنے لگے تھے۔ بھوک سے پیٹ الگ فریاد کر رہا تھا۔ رات کو بھی ضد اور غصے میں اس نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اب تو بات ہی دوسری تھی۔

کافی دور جا کر اسے احساس ہوا کہ جیسے وہ راستہ بھٹک گئی ہو۔ آدھے گھنٹے پہلے وہ اس کھیت میں سے گزری تھی اور اب آدھے گھنٹے بعد بھی وہ اسی کھیت کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ تیزی سے ماتھا مسلتی ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ کھیت میں ایک مرد ٹوکے پر چارہ کاٹ رہا تھا۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر بھینسیں بندھی ہوئی تھیں اور دوسری طرف ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ پانی دیکھتے ہی پیاس کا احساس دوچند ہونے لگا۔ قدم خود بخود ٹیوب ویل کی طرف اٹھنے لگے تھے۔

’ ’ میں پانی پی لوں؟'' چارہ کاٹتا مرد رک گیا تھا۔ اتنی حسین و جوان لڑکی اس کے سامنے اکیلی تن تنہا کھڑی پانی پینے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ گہری سوچتی نظروں سے اس کو دیکھتے وہ سر ہلانے لگا۔ وہ اسے نظر انداز کر کے پانی پینے لگی۔ کافی ٹھنڈا اور میٹھا پانی تھا' پی کر دو چار چھینٹے منہ پر مارے۔

’ ’ شکریہ ! ویسے بھائی پکی سڑک تک کھیتوں میں سے کونسا راستہ جاتا ہے؟'' وہ کافی مشکل میں تھی۔ کچھ سوچ کر اس سے راستہ پوچھنے لگی۔ اس آدمی نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔ بڑی کھوجتی ہوئی نظریں تھیں اس کی۔ مشعل نے محسوس نہ کیا۔

’ ’ ادھر سے جائیں تو یہ راستہ پکی سڑک تک چلا جائے گا۔'' اس نے اپنے دائیں طرف واقع کھیت کی طرف اشارہ کیا تو وہ فوراً قدم بڑھانے لگی۔

’’آپ اس گاؤں کی تو نہیں لگتیں۔ کہیں باہر سے آئی ہیں؟‘‘ اس کی آواز پر اس نے اس دفعہ کچھ چونک کر اسے دیکھا۔ پھر تیزی سے گردن ہلا کر وہ مڑ گئی۔ اسے وہ شخص کچھ مشکوک سا لگ رہا تھا۔ لیکن اب وہ کیا کر سکتی تھی اس نے راستہ بھی پوچھا تھا اور پانی بھی پیا تھا۔ اس شخص کے بتائے گئے راستے پر پورا ایک گھنٹہ چلنے کے باوجود وہ کھیتوں میں بھٹک رہی تھی۔ اسے اس آدمی کی غلط بیانی پر بے انتہا غصہ آیا۔ اوپر سے پریشانی الگ تھی وہ جتنی جلدی یہاں سے نکلنا چاہتی تھی اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ ڈر، خوف سراسیمگی اور مایوسی ایک نیا جال بُن رہی تھی۔ اسے تو یونہی لگ رہا تھا جیسے وہ غلط سمت چلے جا رہی ہو۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد اس کی ٹانگوں نے بالکل جواب دے دیا تھا۔ دو کھیتوں کے درمیان کافی چوڑا کچا راستہ تھا۔ وہ پگڈنڈی سے اتر کر اس کچے راستے پر ہو لی۔ راستے کے دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد چند منٹ آرام کی غرض سے وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ وہ رات کی تاریکی میں گھر سے نکلی تھی اور اب دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

’’اب کیا کروں؟‘‘ آنکھیں بند کر کے اپنی کنپٹیاں مسلتے ہوئے سوچنے لگی۔

’’رُک کیوں گئیں... چلتی کیوں نہیں؟‘‘ اپنے اتنے قریب اتنی شناسا آواز سن کر اس نے جھٹ پلکیں نیم وا کیں۔ آنکھیں پھٹنے کی حد تک کھلی رہ گئیں... یہ کیا تھا؟ اس نے آنکھیں بند کرنا چاہیں لیکن کر نہ پائی۔ اس کے سامنے تو وہی تھا۔ وہی شاہ زر جس سے بچ کر وہ اس قدر خوار ہو رہی تھی۔ جس کی دسترس سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ جس کی پہنچ سے خود کو دور

کرلینا چاہتی تھی۔ لیکن ساری محنت اکارت گئی۔ جس کے خوف سے بھاگ کر وہ حویلی سے نکلی تھی ساری مشقت کے بعد بھی وہ اسی کے شکنجے میں تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سانس لینا بھول گئی ہو۔

’’ت...ت... تم!‘‘ وہ خود کو سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

’’ہاں میں... کیا بھوت دیکھ لیا ہے؟‘‘ اس کا رنگ بالکل زرد ہو چکا تھا۔ وہ اس کے اڑے اڑے حواسوں پر چوٹ کر گیا۔ وہ اپنی شکست سے اندر ہی اندر تلملانے لگی۔ وہ اس شخص سے بولنا کیا' اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ نفرت سے دیکھتے ہوئے چہرہ موڑ کر دوسری جانب متوجہ ہو گئی۔ آنکھوں میں بے بسی سے آنسو جمع ہونے لگے تھے جنہیں وہ بمشکل پینے لگی۔

’’سرفراز!‘‘ اس سے چند قدم دور کھڑے ہی اس نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔ وہ چہرہ موڑ کر آواز کے رخ دیکھنے لگی۔ اس کے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جس سے اس نے راستہ پوچھا تھا۔ اور اب وہ گھوڑے کی لگام تھامے چلا آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا' شاہ زر نے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ ’’اب تم جاؤ اور جو کہا ہے وہ کرو۔‘‘ اس نے اسے چلتا کیا' جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا تھا دوبارہ اس کو دیکھنے لگا۔

’’اب کیا ارادہ ہے؟ بھاگنے کا انجام تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ مشعال بی بی! یہ ہمارا گاؤں ہے۔ اس کے ذرے ذرے میں وفا پوشیدہ ہے۔ اس کی مٹی تک ہمیں دشمن کی خبر کر دیتی ہے۔ سو تم نے اندازہ بھی لگا لیا ہے جو ایک دفعہ ان کھیتوں میں قدم رکھ لے وہ کبھی بھی

بھاگ نہیں سکتا۔ چلو گھوڑے پر بیٹھو۔" ہمہ وقت شاہ زر کی فراخ پیشانی کا احاطہ کئے رکھنے والے ماتھے کی شکن اس وقت بھی اس کے حاکمانہ مزاج' سخت دلی' جابریت اور آتش فشاں موڈ کی واضح عکاس تھی۔ ہمیشہ کی طرح اسے ان آنکھوں میں دیکھ کر اب بھی یہی لگا کہ جیسے اس پر خون سوار ہو۔ وہ نخوت سے سر جھٹک کر رخ ہی موڑ گئی۔ یہ شاہ زر اور اس کے حکم کو نظر انداز کرنے کا واضح اظہار تھا۔ یوں سن کر ظاہر کیا جیسے شاہ زر اس سے نہیں ان درختوں سے مخاطب ہے۔

سنا نہیں تم نے... بیٹھو گھوڑے پر۔" اس کی توجہ حاصل کرنے کو اس نے جیسے ہی ’ ’ مشعال کا بازو تھاما وہ خونخوار انداز میں اس کی طرف گھومی۔

مجھے چھت چھوئو۔" اس کی آنکھوں سے آگ. برس رہی تھی' لہجے کی لڑکھڑاہٹ. بہت ’ ’ واضح تھی جسے شاہ زر محسوس کر کے کچھ دھیما پڑ گیا۔

ٹھیک ہے آرام سے چلو' پہلے ہی بہت ٹائم گزر چکا ہے۔ حویلی میں سب فکر مند ہیں۔" ’ ’

وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے وہ واقعی آرام سے چلنے کو تیار ہو۔ چند منٹ اس کی طرف سے پیش رفت کا منتظر رہا۔ جب مشعال نے کوئی حرکت نہ کی تو اس کا پارہ ہائی ہونے لگا۔ اس کے لئے اس جیسی دھان پان لڑکی کو بے بس کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ لیکن وہ اس وقت طاقت کا کوئی مظاہرہ کرنے کی بجائے صلح جوئی پر آمادہ تھا۔

‘‘مشعال! میرا دماغ خراب مت کرو۔ چلو بیٹھو۔’’ وہ اپنی عادت کے برعکس اپنے غصے کو برداشت کر رہا تھا۔ وہ کھول گئی۔

‘‘نہیں جاؤں گی میں۔ تمہاری اس حویلی کو میں آگ لگا دوں گی‘ اگر تم نے میرا نام تک بھی لیا۔’’ وہ دانتوں کو کچکچا کر چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایک دم پاگل ہو کر چیخی تھی۔ اس سے زیادہ شازر بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک پل میں وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے قریب ہوا۔ پھر اگلا لمحہ مشعال کے لئے حیرت و استعجاب انگیز تھا۔ وہ چیخ مار کر اپنا دفاع کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹ کر بھاگتی اس نے جھک کر اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے یوں اپنے آگے گھوڑے پر سوار کیا تھا جیسے وہ ایک ننھی سی بچی ہو۔ چھوٹی سی گڑیا ہو۔ پھر اس کی تمام تر کوشش ‘تڑپنا‘ چیخنا‘ چلانا‘ احتجاج کرنا‘ نوچنا‘ رونا دھونا سب بے کار گیا تھا۔ وہ اسے لے کر جس جگہ آیا تھا وہ ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ تھا۔ کچی مٹی کا فرش تھا۔ پکی اینٹوں سے بنی دیواریں تھیں جہاں کوئی روزن اور کھڑکی نہ تھی۔ ایک واحد دروازہ تھا جو ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی باہر سے کسی نے بند کر دیا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ جس میں صرف ایک ساٹھ واٹ کا بلب تھا جسے شاہ زر نے دروازہ بند ہوتے ہی جلا لیا تھا کمرے میں موجود تاریکی ایک دم ختم ہو گئی۔ اس کی نظروں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو وہاں کمرے میں موجود وہ واحد بان کی چارپائی تھی جس کے سرہانے تکیہ رکھا ہوا تھا اور بائیں طرف نکڑ میں پانی کا مٹکا

رکھا تھا۔ کمرے کا جائزہ لیتے لیتے اس کی نظریں شاہ زر پر جا ٹھہری تھیں۔ جو کوئی بھی لحاظ مروت رکھے بغیر اسے گھور رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر وہ بے بسی سے رونے لگی۔

یہ شخص جس کی تعریفیں کرتے کرتے ساری حویلی والوں کے منہ خشک نہیں ہوتے تھے۔ تائی امی سے لے کر اسامہ تک سب نے اس کی تعریفوں میں زمین و آسمان ایک کر دیا تھا۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے بھابی نے کہا تھا۔ ”شاہ میں کئی خوبیاں ہیں، بظاہر بہت کرخت ہے۔ لیکن بہت خوددار اور غیرت مند ہے۔ بہت نرم دل بھی ہے۔ کبھی بھی بلاوجہ ناراض نہیں ہوا۔ ہاں البتہ خاندانی روایات کو اگر کوئی توڑنے کی کوشش کرے تو پھر برداشت نہیں کر پاتا۔ کسی لڑکی کے سر سے دوپٹہ بھی اترے تو بہت ناراض ہوتا ہے۔ یہ صرف تم ہو مشعال! جس کو اس نے رعایت دے رکھی ہے۔“ اور اس وقت اس کی آنکھوں میں کوئی بھی رعایت نہ تھی۔ انتہائی کرخت اور ہتک آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سہم گئی تھی۔ خوف نے اس کے سارے حواس مختل کر دیئے تھے۔

یہ اس قدر سفاک، ظالم اور منتقمانہ مزاج و سوچ کا حامل شخص ہے۔ مجھ جیسی لڑکی تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ زبان کا مقابلہ ہو تو شاید میں بچ بھی جاؤں اور اس وقت تو اس پر غیرت و مردانگی کا عفریت سوار ہے۔ کیونکر مجھے بخشے گا۔ آخر کو اس کے آباؤ اجداد کی روایتوں کو حویلی کی دہلیز پار کر کے میں آئی ہوں اور بھابی کہتی تھیں کہ یہ روایتوں کو توڑنے والے کو برداشت نہیں کرتا، یہ وہ خود بھی کہہ چکا ہے تو پھر اس وقت یہ مجھ کیسی لڑکی کو

منٹوں میں بے بس کر کے رکھ دے گا۔" اسے اپنی تمام تر جبلی و سفلی جارحانہ مزاحمتیں راکھ کا ڈھیر بنتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مٹی کے ڈھیر کی طرح زمین پر ڈھے گئی۔

خدا کے واسطے شاہ زر! پلیز مجھے جانے دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارے قابل نہیں ' ' ہوں۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ کبھی بھی نہیں۔ تمہیں مجھ سے شادی کر کے کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔" چند لمحے وہ شاہ زر کی طرف سے پیش قدمی کی منتظر رہی لیکن وہ اپنی جگہ کھڑا رہا تو وہ اس کے سامنے رو دی۔ ایک طرف عزت تھی تو دوسری طرف انا۔ اسے عزت ہر حال میں انا کے مقابلے میں پیاری تھی۔ اس کے سامنے رونے بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئی جسے کبھی وہ در خور اعتنانہ سمجھتی تھی۔ اس کی بات پر بھی اس کی طرف سے مسلسل خاموشی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ چارپائی پر نیم دراز ہو چکا تھا۔ اس کی طرف دیکھنے کی بجائے اس کی نظریں چھت کو گھور رہی تھیں۔

شاہو! خدا کے لئے مجھے جانے دو۔ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ میں تمہارے ' ' ساتھ نہیں رہ سکتی۔ پلیز میری بات مان لو۔ پلیز شاہو...!" اس کے ہونٹوں پر ایک ہی نام کی گردان تھی۔

' ' ...شاہو ' '

شٹ اپ" وہ یوں چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے مشعال نے اس پر کھولتا پانی ڈال دیا ہو۔ پھر ' ' اس کو بازوؤں سے دبوچ کر وہ اپنے آپ میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کے وجود کو

اپنی انگلیوں اور آنکھوں سے لپکتے شعلوں سے جھلسا دے گا... مسل دے گا۔ اس کا یوں "بھڑک جانا" دیکھ کر وہ بے دم ہونے کو تھی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ اوپر سے اس کی قربت مزاحمت کرنے کی ساری صلاحیتیں ایک دم خوف کی لپیٹ میں آ گئیں۔

خبر دار تم نے اپنی غلیظ زبان سے میرا نام بھی لیا۔ کاٹ دوں گا تمہاری یہ زبان۔ ’ ’ کون ہو تم؟ کیا حق حاصل ہے تمہیں یہ نام لینے کا؟ یہ نام لینے کا حق تو صرف میں نے اسے دیا تھا جس سے مجھے محبت تھی اور وہ مشعال مر گئی آج سے پندرہ.برس پہلے۔ یہ پندرہ سال تو صرف میں نے اس کی یادوں کی قبر پر دیئے جلاتے گزارے ہیں۔ پھر وہ میرے دل سے اتر گئی۔ اور تم تو میری نظروں سے اسی دن گر گئی تھیں جب تم سے مجھے ہر تعلق ٹوٹ جانے کی نوید ملی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں میں سے تمہارے نام پر رکھے گئے پاگل خوابوں کو اسی دن نوچ پھینکا تھا جس دن تم نے کسی اور شخص کو اپنی آنکھوں میں بسانے کا مژدہ سنایا تھا۔ میرے ہونٹوں نے تمہارا یہ نام اسی دن بھلا دیا تھا جب میرے کانوں نے تمہارے لبوں سے کسی غیر کا نام سنا تھا۔ میری مشعال تو مر گئی جسے مجھ سے ٹوٹ کر محبت نہیں تھی تو نفرت بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ تو مر گئی اسی دن جب اس نے یہ دیس چھوڑا تھا۔ اور تم..." وہ مشعال کی پھیلی پھیلی آنکھوں میں دیکھتے بہت جنونی ہو رہا تھا۔ "اور تم... تم تو صرف اس کی فقط ایک پرچھائیں ہو۔ اس نام نہاد بندھن کی اصل گرہ ہو جسے تھامے رکھنے کا وعدہ میں اپنے.بڑوں سے کر چکا ہوں۔ تم مشعال بیگم! فقط میرے لئے تمہاری اپنی جانب سے دیا گیا ایک چیلنج ہو اور اس کے

سوا کچھ نہیں۔ میرے دل میں تمہارے لئے کچھ نہیں سوائے ڈھیر ساری نفرت اور انتقام کے..."

شاہ زر کا تپش زدہ، الجھا ہوا، نہایت حدت و گرماہٹ سے لبریز تنفس مشعال کے چہرے پر بھاپ کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کی قربت اسے جھلسا رہی تھی۔ اس کے دونوں آہنی ہاتھ اس کے نرم سے بازوئوں کو جکڑے ہوئے تھے۔ اس مردانہ پرکشش وجاہت و حسن سے لبریز چہرہ جو ہر وقت غصے میں ہی ہوتا تھا مزید سرخ ہو کر اسے دہلائے دے رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سارے بدن کا خون اس کے چہرے پر گردش کرنے لگا ہو۔ اس نے اس کے بازوئوں کو یوں اپنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر گر گئے تھے۔ قربت کی یہ آنچ اور اوپر سے یہ سب سن کر وہ ہکا بکا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے لئے اپنے دل میں محبت جیسی فیلنگز رکھتا ہے۔ لیکن یہ نفرت، یہ انتقام، یہ غرور یہ انداز، یہ لب و لہجہ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ جھٹکا دے کر اپنے نرم بازوئوں کو اس کی آہنی گرفت سے آزاد کروایا۔

"جب میں تمہارے لئے سوائے نفرت و انتقام کے کچھ نہیں ہوں تو پھر کیوں مجھ سے شادی کر رہے ہو جب سب کچھ جانتے ہو تو پھر کیوں میری زندگی برباد کر رہے ہو۔" وہ اس کے سامنے جھکی تھی۔ لیکن اس کے یہ آخری الفاظ سن کر انا پرست اور ضدی مشعال پھر سے سر اٹھانے لگی تھی۔ غرور اور طنزیہ نظروں کی کاٹ لئے پوچھ رہی تھی۔

اس سوال کا جواب مجھ سے نہیں مشعال بی بی اپنے والدین سے پوچھو جن کی عزت تم دو کوڑی کی کرنے چلی تھی۔ انہوں نے بہت منتیں کی تھیں میری۔ بہت واسطے دیئے تھے مجھے۔ بڑی امی نے روایتوں کا پاس رکھنے کا وعدہ لیا تھا۔ آغا جی دادی جان اور بڑے ابا جی مرتے مرتے بھی تم سے شادی کرنے کا عہد لے گئے تھے مجھ سے۔ پھر بتاؤ میں کیا کرتا۔ میں تمہاری طرح بے غیرت نہیں ہوں لیکن آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا پڑ رہی ہے۔ میں خود غرض نہیں کہ ان کی بات نہ مانتا۔ صرف اور صرف اتنے لوگوں کی وجہ سے تمہارے والدین کے آنسوئوں کی وجہ سے اپنی عزت ٹھکرائے جانے اور تمہارے انکار کے باوجود تمہیں اپنانے کی حامی بھر لی تھی۔ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔ نہ تمہارے حسن کی اور نہ ان ادائوں کی۔ ہاں البتہ تم صرف میرے لئے ایک چیلنج ہو۔ ایک ایسا جواء جسے میں نے ہر حال میں جیتنے کا وعدہ کیا ہے خود سے اور میں ہارنے والوں میں سے نہیں۔ جو چاہتا ہوں حاصل کرتا ہوں، جس پر ہاتھ رکھتا ہوں پا لیتا ہوں اور تم تو دو کوڑی کی بھی نہیں ہو لیکن میں مجبور ہوں۔" وہ آج اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال دینا چاہتا تھا۔ ڈر، خوف اور سراسیمگی کے کھنچے گئے حصار سے باہر نکل کر بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ شاہ زر سے اسے پہلے کب اچھی توقعات تھیں۔ لیکن اس کا بت یوں بری طرح اس کی اپنی نظروں میں پاش پاش ہو گا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے اس "بے غیرت" کہنے والے کو لمحوں میں شوٹ کر دے۔

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ ماما پاپا کبھی تمہاری منتیں کریں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔" اپنے متزلزل ہوتے یقین کو اس نے قائم کرنا چاہا۔

"کیوں... اتنی بے یقین کیوں ہو۔ وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ آخر کو تم میری منگ ہو۔ وہ بھی بچپن کی۔ ہمارے یہاں تو عزت کی خاطر جانیں تک دے دی جاتی ہیں۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ یہ سب نہیں کر سکتے۔ تم اس آزاد معاشرے میں جو گل کھلا رہی تھی اس کے لئے کسی کی منتیں کرنا تو چھوٹی سی بات ہے۔" وہ صاف اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ وہ گل کھلانے والی بات پر تلملا اٹھی۔

"اپنی زبان کو لگام دو شاہ زر! میں تمہارا بہت لحاظ کر رہی ہوں۔ اب اگر تم نے ایک لفظ بھی میرے کردار پر کہا تھا تو میں منہ نوچ لوں گی تمہارا۔"

"تو پھر دیر کیوں کر رہی ہو۔ میں تو منتظر ہوں۔ آؤ نوچو منہ' لیکن یاد رکھو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ پھر تم اتنی تکلیف میں کیوں ہو۔ جب تم ان کی عزت کو بٹہ لگانے لگی تھی تو انہوں نے بھی تمہیں لگام ڈالنے کو یہی طریقہ اپنانا تھا اور تمہاری وہ والدہ صاحبہ کتنا غرور تھا انہیں اپنے برٹش ہونے پر۔ کس حقارت اور طنطنے سے سب چھوڑ چھاڑ کر اپنے رشتہ داروں کے پاس گئی تھیں۔ لیکن افسوس کسی نے بھی ان کی بگڑی ہوئی صاحبزادی کو گھاس تک نہ ڈالی اور پھر انہیں میں یاد آیا' میرے لوگ یاد آئے' جنہیں اولڈ دقیانوسی کہہ کر پاؤں تلے روند گئی تھیں۔ افسوس بھیک مانگنے کے لئے بھی انہیں ہمارا ہی در ملا۔ پھر روز چلی تھیں فون پر میرے

کان کھانے۔ میرے ضبط کو آزمانے کہ میری بیٹی سے شادی پر راضی ہو جائو۔ بتائو پھر میں کیا کرتا۔ اور مجھے بڑی امی کے کہنے کا مان رکھنا پڑا اور مجھے تیار ہونا پڑا۔ وہ بھی تم جیسی بے غیرت لڑکی کے لئے۔" بے غیرت کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں استہزاء تھا۔

شاہ زر بکواس بند کرو۔" وہ چیخ اٹھی۔ ’ ’

اچھا تو پھر کیا ہو۔" وہ طنزیہ ہنسا۔ مشعال نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں جیسے اٹھتے ہاتھ پر ’ ’ کنٹرول کر رہی ہو۔

میں بے غیرت نہیں ہوں۔ ہاں میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں اسی لئے میں نے ’ ’ انکار کیا تھا لیکن تم اسے غلط رنگ نہیں دے سکتے۔ کس قدر گھٹیا سوچ ہے تمہاری' کس قدر گندی شخصیت کے مالک ہو تم۔ میں بے غیرت ہوں۔ لیکن میں بتاتی ہوں تم کتنے بے غیرت ہو۔ کبھی اندازہ کیا ہے اپنی نظروں کی غلاظت دیکھی ہے' اپنے اندر چھپی ہوس ناپی ہے' مگر تمہارے نزدیک یہ باتیں تو مردانگی' فخر و غرور اور حاکمیت کی علامت ہیں۔ تاج سمجھ کر سر پر فخر و مان سے سجائے پھرتے ہو۔ آخر کو ہو نا اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے' اسی ماں کے بیٹے جس کا تعلق ہوس پرست خاندان سے تھا۔ جس کے لئے صرف عورت ہی عورت ہے۔ چاہے وہ جیسی بھی ہو کیسے ہی طریقے سے حاصل کی ہو۔ یہی اوقات ہے تمہاری بھی۔ میں چیلنج ہوں تمہارے لئے' تم مجھے ہرانے کا مقصد کئے ہوئے ہو۔ جواء سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے۔ یہی مردانگی ہے نا تمہاری۔ تم تو مجھے اسی دن نیچا دکھا دیتے جس دن میں پہلی دفعہ روبرو

تمہارے سامنے کھڑی ہو کر تمہارے وجود سے انکاری ہوئی تھی۔ تم کو ہر ایک نے سراہا تم حاکم ہو کبھی کسی نے تمہاری حکم عدولی نہیں کی۔ کبھی تمہاری شخصیت سے منکر نہیں ہوا اور میں نے تمہارے سامنے انکار کیا تھا۔ تم بھلا کیسے برداشت کر لیتے ایک لڑکی کے منہ سے یہ سننا۔ تمہارا بس چلتا تو تم مجھے اسی دن مسل دیتے، یہی کہا تھا نا تم نے۔ میرے ماں باپ کے کہے کا الزام مجھے مت دو۔ یہ تو صرف تمہارے اندر کی گھٹیا سوچ ہے جو تمہاری زبان سے ادا ہو رہی ہے۔ تم سے تو بھلائی کی توقع رکھنا عبث ہے اور میں نے یہ حماقت کبھی نہیں کی۔ تم کتنے پاکباز ہو آج ظاہر ہو گیا ہے۔ کھل کر تمہاری شخصیت میرے سامنے آ گئی ہے۔ تم بھی یقینا اپنی خوبیاں سننا چاہو گے تو تمہیں میں بتاتی ہوں مسٹر شاہ زر جہانزیب! تم ذلیل ہو، بے غیرت ہو، کمینے ہو، بے حیاء ہو۔ آئندہ مجھے بے غیرت کہنے سے پہلے تم اپنی غیرت بھی ناپ لینا۔" وہ جو اپنی غرض کے لئے اس کی منت کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اس کے خیالات سن کر ادھار رکھنے کی قائل نہ تھی۔ دوبدو، چیلنج کرنا، وقار و عزت کی دھجیاں بکھیرنے والا، دل کو جلانے والا، اتنا زہریلا، مردانگی کو للکارنے ابھارنے والا کٹیلا لب و لہجہ تھا۔ جس طرح وہ دوبدو و بے خوفی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دے رہی تھی اس نے شاہ زر کے دل و دماغ پر آرے چلا دیئے تھے۔ وہ کچھ لمحے حیرانگی اور غصے سے ساکت رہ گیا اور پھر جو اس کا ہاتھ اٹھا تھا تو وہ لڑکھڑائی تھی۔ بازو سے پکڑ کر اس نے اسے چارپائی پر دھکا دیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بعض اوقات خاموشی باعث آزار بن جاتی ہے اور بعض اوقات باعث رحمت۔ وہ

خاموش نہیں رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ وہ اب کچھ بھی کر سکتا تھا بس یہی سوچ اسے رلا رہی تھی۔

تم بہت غلط کر رہے ہو شاہ زر! تم میرے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی برباد کرو گے۔ ’ ’ میں سکون سے نہیں بیٹھوں گی۔ نہ تمہیں چین سے رہنے دوں گی۔ میں تمہارے نام نہاد وقار و عزت کی دھجیاں بکھیر دوں گی۔ تمہیں عزت کی زندگی نہیں گزارنے دوں گی۔" وہ رو رو کر بری طرح اسے دھمکیاں بھی دے رہی تھی۔ وہ ہونٹوں پر قفل لگائے اس کی طرف سے دیکھنے کی بجائے کمرے میں چکر لگانے لگا۔ ابھی وہ کچھ سوچ رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ فوراً دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کون ہے؟" دروازہ اندر کی بجائے باہر سے بند تھا۔ لکڑی کا بنا یہ دروازہ بہت مضبوط ’ ’ تھا۔ وہ بھی روتے روتے چپ ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے لگا جیسے اللہ نے اس کے آنسوؤں کی لاج رکھ لی ہو۔

"میں ہوں شاہ جی! سرفراز۔ ’ ’

اچھا... دروازہ کھول دو سرفراز!" آواز پہچان کر وہ ایک طرف کھڑا ہو کر دروازہ کھلنے کا ’ ’ انتظار کرنے لگا۔ دو تین منٹ بعد دروازہ کھل گیا تھا۔ سرفراز کے ساتھ شاہ کمال تھے۔

پاپا..." وہ فوراً اٹھ کر ان کی طرف بھاگی تھی۔ ’ ’

رک جاؤ مشعال !" اس سے پہلے کہ وہ ان تک پہنچتی انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے ’ ’ درمیان ہی میں روک لیا۔

شاہ زر ! تم جاؤ بارات ساری بالکل تیار ہے' بس تمہارا ہی انتظار ہو رہا ہے۔" انہوں ’ ’ نے اسے بالکل نظر انداز کر کے شاہ زر سے کہا تو وہ چارپائی پر رکھا اس کا بیگ اٹھا کر فوراً کمرے سے باہر نکل گیا تھا جیسے اسے صرف شاہ کمال کے آنے کا ہی انتظار تھا۔

مجھے شرم آ رہی ہے تمہیں اپنی بیٹی کہتے ہوئے۔ ساری عمر سنتا رہا کہ بیٹیاں اور بہنیں ’ ’ بوجھ ہوتی ہیں۔ قابل شرم بن جاتی ہیں لیکن میں ساری عمر اس حقیقت کو جھٹلاتا رہا۔ وہ لوگ جو بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی انہیں دفن کر دیتے تھے اچھا ہی کرتے تھے۔ تم جیسی بیٹیاں باعث شرم ہوتی ہیں' تم جیسیوں کا مر جانا ہی بہتر ہے۔" ان کی سپاٹ آواز پر اسے شاہ زر کے الفاظ اپنے کانوں میں گونجتے محسوس ہوئے۔ کچھ لمحے پہلے اس نے شاہ زر کے الفاظ کی پرزور نفی کی تھی۔ سب کچھ محسوس کرتے ہوئے بھی اس نے سارا بوجھ شاہ زر پر ڈالا تھا۔ اور اس وقت شاہ کمال نے شاہ زر کے کہے گئے لفظوں کی تصدیق کر کے اس کی سوچ کی تردید کر دی تھی۔ وہ بھونچکا ہو کر دیکھتی گئی۔

تمہارا جرم ناقابل معافی ہے۔ آج تک ہماری عورتوں نے ہماری مرضی کے بغیر حویلی ’ ’ کی دہلیز سے باہر قدم تک نہیں رکھا۔ غلط مقصد کے لئے کبھی دہلیز پار نہیں کی اور تم نے ہمارے وقار' عزت اور اعتماد کا بھرم توڑ دیا ہے۔ میرا سر جھکا دیا ہے۔ کاش میں تمہارے پیدا

ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتا۔ شادی والے دن بھاگ جانے والی لڑکیاں کبھی ساری زندگی سرخرو نہیں ہوتیں۔ تمہارے اس شرمناک فعل پر تو تمہاری سزا گولی ہونی چاہیئے تھی لیکن میں بہت کم حوصلہ ہوں۔ دنیا پرست ہوں لوگ پوچھیں گے کہ کیوں مار دیا تمہیں اور میں کیا بتاؤں گا میری بیٹی بھاگ جانے کے جرم میں ماری گئی ہے۔ لیکن نہیں مجھے اپنی عزت بہت پیاری ہے۔ تمہیں ہر حال میں شاہ زر سے ہی شادی کرنا ہے۔ شکر کرو وہ اس حالت میں بھی تمہیں اپنا رہا ہے جبکہ سوائے مار دینے کے اور کوئی راستہ نہیں۔ اب تو وہی تمہاری سزا ہے اور تمہیں یہ بات ماننا بھی پڑے گی۔ وہ اس وقت ایک ظالم و سفاک جابر' حاکم و جاگیر دار لگ رہے تھے۔ وہ برسوں سے انہیں رحیم و شفیق طبیعت میں دیکھ رہی تھی۔ آج ان کا یہ روپ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ان کا اٹل اور حاکمانہ لہجہ 'سفاکیت' بربریت والا فیصلہ۔ وہ کئی لمحے بے یقینی سے دیکھے گئی

کیا رشتے یوں بھی بے اعتبار ہوتے ہیں؟

کیا مان یوں بھی ٹوٹتے ہیں؟

کسی کو چوراہے پر برہنہ کر دیا جائے تو ایک عالم کو کہنے سننے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہر کوئی آتا جاتا دیکھتا ہے رکتا ہے۔ بولتا ہے رائے کا اظہار کرتا ہے اور پھر اپنی راہ لیتا ہے۔ ایک عرصے سے وہ بھی اشتہار بنی ہوئی تھی۔ صرف اتنا قصور تھا کہ اس نے زندگی گزارنے کے لئے اپنے فیصلے کو مقدم جانا تھا۔ کیا اتنے سے قصور کی اتنی بڑی سزا جائز تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے

اپنے باپ نے اسے بیچ چوراہے پر برہنہ کر دیا ہے۔ اور لوگوں کو دعوت دی کہ وہ آکر اس پر پتھراؤ کریں۔

اپنے باپ کی باتیں سن کر اسے خود سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اسے دلاسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے اندر ہمت جیسے دم توڑ چکی تھی۔ کل سے لے کر آج تک پاپا کی ذات کے کئی در اس پر وا ہوئے تھے اور سب ہی انتہائی اذیت ناک تھے۔ ریزہ ریزہ کر دینے والے۔

’’ پاپا! کیا کہہ رہے ہیں آپ! میں نے آپ کا بھرم توڑا ہے یا آپ نے میرا؟ ’’

کافی دیر بعد ساکت و جامد پتلیوں میں جنبش ہوئی تو وہ کہے بنا نہ رہی۔ اس سے اسے لگا جیسے وہ واقعی بے غیرت ہو۔ اتنی تکلیف تو شاہ زر کے الفاظ کی بھی نہیں ہوئی تھی جتنی پاپا کی باتوں سے ہو رہی تھی۔ اسے لگا جیسے آج کے بعد وہ کبھی بھی اپنی ذات کے سامنے پورے اعتماد سے کھڑی نہ ہو سکے گی۔ کبھی سر اٹھا نہ سکے گی' اسے لگا پاپا کے لفظوں نے اسے ہرا دیا ہے۔ اس کے اندر کی کبھی نہ ٹوٹنے والی مشعال کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

’’ حویلی میں کوئی بھی تمہاری غیر موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ سب کو صرف یہ بتایا ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے۔ یہ بات بھی صرف حویلی کی خواتین کو بتائی گئی ہے۔ باقی مہمان عورتیں اس بات سے بھی قطعی لاعلم ہیں۔ تمہارے اس فرار کے بارے میں سوائے چند افراد کے اور کوئی کچھ نہیں

جانتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم واپس چلو۔ لیکن حویلی میں قدم رکھنے کے بعد تمہیں اپنی ہر بد تہذیبی والی زبان کاٹ کر حویلی کے باہر ہی پھینک دینا ہو گی۔ ورنہ...“ وہ چپ ہو گئے۔ وہ مزید کچھ کہہ لیتے تو تب بھی وہ کیا کر سکتی تھی۔ روتی چیختی احتجاج کرتی۔ آخر کب تک۔ جب سب مل کر اسے ٹریپ کر رہے تھے تو اس اکیلی کی کوشش کہاں تک کامیاب رہتی۔ وہ چپ ہو گئے تھے باہر نکلتے نکلتے رک گئے تھے۔

حویلی میں کوئی بھی تمہاری غیر موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ سب کو ’ ’ صرف یہ بتایا ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے۔ یہ بات بھی صرف حویلی کی خواتین کو بتائی گئی ہے۔ باقی مہمان عورتیں اس بات سے بھی قطعی لاعلم ہیں۔ تمہارے اس فرار کے بارے میں سوائے چند افراد کے اور کوئی کچھ نہیں

جانتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم واپس چلو۔ لیکن حویلی میں قدم رکھنے کے بعد تمہیں اپنی ہر بد تہذیبی والی زبان کاٹ کر حویلی کے باہر ہی پھینک دینا ہو گی۔ ورنہ...“ وہ چپ ہو گئے۔ وہ مزید کچھ کہہ لیتے تو تب بھی وہ کیا کر سکتی تھی۔ روتی چیختی احتجاج کرتی۔ آخر کب تک۔ جب سب مل کر اسے ٹریپ کر رہے تھے تو اس اکیلی کی کوشش کہاں تک کامیاب رہتی۔ وہ چپ ہو گئے تھے باہر نکلتے نکلتے رک گئے تھے۔

سرفراز...!“ دروازے پر ہی رک کر وہ پکارنے لگے۔ پتا نہیں کہاں سے وہ آدمی ’ ’ آموجود ہوا تھا۔

بی بی کو عزت کے ساتھ گاڑی میں بٹھاؤ۔" وہ مؤدب کھڑا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ’ ’

"! جی شاہ جی ’ ’

آئیں بی بی صاحب!" وہ حکم دے کر چلے گئے تو وہ اسے چلنے کو کہنے لگا۔ پورے عزت ’ ’ واحترام کے ساتھ۔ وہ حیرت کے سمندر میں ابھی تک غرق تھی۔ شاہ زر کے لفظوں کا پاپا کے الفاظ سے موازنہ کرتے اسے اپنی ذات بہت ہی بے مایہ و حقیر لگ رہی تھی۔ گندی نالی کے کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر۔ بہتی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ اسے لگا جیسے وہ ہوش میں نہیں ہے۔ وہ اس کے سامنے مؤدب کھڑا تھا وہ مرے مرے قدم اٹھاتی گاڑی تک پہنچی تھی۔ سرفراز نے جیپ کا دروازہ کھولا تو وہ اندر بیٹھ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر آذر بھیا تھے۔ وہ خاموشی سے پاپا کے ساتھ والی سیٹ پر جمی رہی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ یوں بے بس وہار جائے گی۔ بہتی آنکھیں، بے بسی ولاچاری کے گہرے احساس سے مجبور ہو کر بند کیں تو کئی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے چہرے کو چومتے گریباں میں جذب ہوتے چلے گئے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اسے غلامی کے پروانے پر دستخط کرنے پڑے تھے۔ حویلی پہنچ کر اپنے کمرے میں داخل ہو کر وہ بالکل بے بس ہو گئی تھی۔ ابیشا کے گلے لگ کر جتنے بھی سمندر بہا سکتی تھی اس نے بہالئے تھے حتیٰ کہ آنکھوں کا پانی بھی خشک ہو گیا۔ "نکاح نامے" پر دستخط کرتے ہوئے بھی اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ کوئی خیال، کوئی احساس اور جذبہ باقی نہ تھا۔ وہ اپنا سب کچھ گنوا آئی تھی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ یوں گمان ہوتا جیسے وہ بالکل پتھر کی بن گئی

ہو۔ اس نے نظر اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھا تھا، جیسے واقعی سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔ چاروں طرف طوفان کے بعد نظر آنے والی تباہی بچی ہو۔ لیکن پتھر میں جنبش اس وقت ہوئی جب تیار ہونے کے لئے بھابی اور ابیشا نے اسے کپڑے پہننے کو کہا تھا۔ وہ یکدم ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔ لمحوں میں ہوش میں آئی تھی۔ ان کی بات پر وہ مان نہیں رہی تھی۔ یہاں آکر کسی کی منت سماجت بھی کچھ کام نہ آئی تھی وہ ٹھس بنی بیٹھی رہی۔ سب پریشان ہو گئیں۔

دوسری طرف لمحہ بہ لمحہ دیر ہوتی رخصتی کو دیکھتے مہمانوں کو جانے کی جلدی سوار ہو گئی۔ ماما نے بڑی امی نے کہہ سن کر دیکھ لیا۔ پاپا کو بھی بلوایا اس نے ان کی کوئی بات سننا تو در کنار سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے اب کس بات کی دیر ہے؟" شاہ زر کے کئی دوست احباب اور جاننے والے گاؤں میں صرف شادی میں شہر سے شرکت کے لئے آئے تھے۔ انہیں واپس بھی جانا تھا۔ رخصتی میں جوں جوں دیر ہو رہی تھی ان کی واپسی کی ضد توں توں بڑھتی جا رہی تھی۔ شاہ زر اصل صورتحال سے لاعلم تھا۔ آخر کار اس نے اکتا کر آذر بھیا سے پوچھا تو انہوں نے اسے ساری بات کہہ سنائی مشعال کی ضد سمیت۔

"ایک تو یہ لڑکی بھی..." ساری بات سن کر وہ طیش میں آگیا۔ "بہر حال رخصتی تو لازماً ہو گی۔ آپ چلیں میں دیکھتا ہوں وہ کیا چاہتی ہے۔" اپنے غصے پر کنٹرول کرتے وہ ان سے کہنے

لگا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پاپا کو بھی شاہ زر کی بات مناسب لگی تھی۔ اس ساری صورتحال کو اب صرف شاہ زر ہی ہینڈل کر سکتا تھا۔ سو انہوں نے بات کرنے کی اجازت دے دی۔

’’بات کرتے ہوئے خیال رکھنا حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی ہے۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بھی بن سکتا ہے۔ اب تک تو ہم صورتحال کو سمیٹتے آئے ہیں لیکن مزید آگے کیا ہو گا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔‘‘

اس کے کمرے تک آذر بھائی نے نصیحت کی تو اس نے صرف سر ہلا دیا جبکہ دل و دماغ اس سر پھری لڑکی کے پر نخچے اڑا دینا چاہتا تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پاس بیٹھیں ابیشا اور بھابی فوراً کمرے سے نکل گئی تھیں۔ مشعال نے ایک لحظہ کو شاہ رز کے خطرناک حد تک بگڑے تیوروں کو دیکھا اور گردن جھکا لی۔ آنکھیں شدت گریہ سے لال ہو گئی تھیں۔ شاہ رز نے دونوں کے نکلنے کے بعد زور سے دروازہ بند کر کے لاک کیا۔ مشعال کا سینے میں موجود دل بھی ایک لمحہ کو بند ہوا تھا۔

’’یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔ تم تیار کیوں نہیں ہو رہیں؟‘‘ اس کا بازو دبوچ کر اپنے مقابل کھڑا کرتے چبا چبا کر پوچھنے لگا۔ جبکہ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ کر رہ گئی۔

’’اٹھاؤ یہ کپڑے اور جا کر چینج کرو۔‘‘ بیڈ پر عروسی لباس زیورات اور نہ جانے کیا الم غلم بکھرا پڑا تھا اس نے اشارہ کیا تو وہ چیخ اٹھی۔

’’چھوڑو وحشی، جنگلی، درندے میرا بازو۔ نہیں میں کچھ پہنوں گی۔‘‘

وہ کمزور سی لڑکی تھی بہت کوشش کی' اپنا بازو چھڑا لینے کی لیکن مقابل آہنی اعصاب کا مالک تھا خود تو پاش پاش ہو سکتی تھی لیکن اسے نہیں توڑ سکتی تھی۔ ساری مزاحمت بے کار گئی۔ منٹوں میں اس وحشی شیطان کے آگے بے بس ہو گئی۔ وہ اس کی بات اور مزاحمت پر کھولتا ہوا اسے باتھ روم میں دھکیل کر لے گیا پھر کپڑے تھما کر اسے گھورنے لگا۔

“تم پیار کی زبان نہیں سمجھتی۔ ویسے بھی لاتوں کے بھوت بھلا باتوں سے کہاں مانتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کرنے پر مجبور ہو جاؤں تمہارے حق میں صرف یہی بہتر ہے کہ تم فوراً کپڑے چینج کر کے باہر نکلو۔”

“تمہارا حکم میں مان لوں گی۔ جب تمہیں مجھ سے کوئی غرض نہیں تو پھر اپنے لئے یہ اہتمام کیوں چاہتے ہو۔” وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

“شٹ اپ۔” اس نے اسے گھورا۔ جیسے اس کے جسم سے روح ہی تو نکال لے گا۔ وہ اس کی پھنکار پر سہم سی گئی۔ “ہم عورت کی عزت کرنے والے لوگ ہیں لیکن تم نے اپنی عزت خود گنوائی ہے۔ مجھے تمہارے اس وجود و جسم سے کوئی لگاؤ نہیں لیکن دنیا داری کا بھرم بھی ہمیں رکھنا پڑتا ہے۔ جی تو میرا چاہ رہا ہے کہ تمہارا یہ جسم بوٹی بوٹی میں تبدیل کر دوں۔ مار مار کر بھرکس نکال دوں۔ تم مجھے مجبور کر رہی ہو کہ میں اپنی اصلیت پر اتر آؤں لیکن فی الحال میرے یہ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ تمہارا یہ شوق بھی پورا کروں گا۔ بہت مان و غرور ہے تمہیں اپنے اس حسن و جوانی پر۔ دل کھول کر نذرانہ پیش کروں گا۔ فی الحال آرام سے کپڑے

چینج کر کے باہر نکلو۔" جس طرح اس نے اسے باتھ روم میں دھکیلا تھا جس طرح وہ کہہ رہا تھا اس کے کچھ کرنے اور کہنے کی ساری جبلی طاقتیں سرد پڑ گئیں۔ شاہ زر کے انداز' لب و لہجے اور آنکھوں سے چھلکتی وعیاں ہوتی وحشت.بر.بریت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے عمل کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائے گا۔ پھر جس طرح اس نے آگے بڑھ کر نل کھولا وہ سمجھ کر سہم گئی کہ یہ شخص کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ جیسے ہی مشعال کی آنکھوں میں موجود سرکشی مدھم پڑی تھی ویسے ہی وہ باتھ روم کا دروازہ بند کر کے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

شاہ زر کے سارے اعصاب پر ایک ایسی وحشت.بر پا تھی جیسے وہ ان لمحوں میں اس پارہ صفت لڑکی کو مسل کر رکھ دے گا۔ اپنے کھولتے دماغ کو قابو میں کرتے ہوئے پنکھا تیز کر کے وہ اس کے بستر پر گر کے اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ دماغ کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔

جیسے ہی وہ کمرے کے وسط میں پہنچی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بالکل قریب آ کر شہادت کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔

تم اس قابل نہیں کہ تمہیں مزید رعایت دوں لیکن پھر بھی زبان سے کہہ رہا ہوں ' ' آرام سے باقی تیاری بھی مکمل کروا لینا اور چچی جان جو کہیں ان کی بات بھی مان لینا۔ نہیں تو... بصورت دیگر میں دوبارہ بھی آ سکتا ہوں۔ سمجھ رہی ہو نا۔" ایک آخری حقارت بھری نظر اس کے چہرے پر ڈال کر وہ باہر چلا گیا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی وہ بری طرح سسک اٹھی تھی۔

خدا کرے شاہو! تم مر جاؤ۔ تمہیں میرے وجود سے کھیلنے کا موقع ہی نہ ملے۔ خدا تمہیں ایک لمحہ بھی نصیب نہ کرے۔ اللہ کرے تم مر جاؤ... مر جاؤ تم..." وہ بڑی شدت سے اسے بددعائیں دینے لگی۔ اس جیسی لڑکی جو اپنے بچاؤ کا ہر ہتھیار گنوا بیٹھی تھی جو بالکل نہتی تھی جس کے بدن میں مزید لڑنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ جو ہر طرف سے مایوس ہو چکی تھی لیکن وہ یوں بزدلوں کی طرح مرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آخری حد تک کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ماں باپ نے اسے ہرا دیا تھا لیکن وہ خود کو ہارنے سے بچانا چاہتی تھی اور اس وقت جبکہ اس کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں بچا تھا تو وہ اپنی نفرت سے کام چلانے لگی تھی۔ عورت جب نفرت پر اترتی ہے تو سب جذبے کہیں سو جاتے ہیں۔ اس کے اندر موجود سارے جذبے ایک ایک کر کے سو گئے تھے۔ اب ان سب سوئے ہوئے جذبوں پر صرف ایک جذبہ حاوی تھا۔ وہ جذبہ تھا نفرت و انتقام کا جذبہ۔

☆☆☆

وہ چہار سو پھولوں سے آراستہ کمرے میں نظریں دوڑا کر دیکھنے لگی۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ در و دیوار فرش‘ بستر‘ چھت‘ پھولوں سے آراستہ و پیراستہ تھی۔ سارے کمرے میں ایک مخصوص سی مہک رچی بسی تھی۔ بھاری دوپٹے کے بوجھ سے اس کا سر جھکا چلا جا رہا تھا۔

زیورات کی چھنکار اور پرفیوم کی مہک اسے بہت اجنبی لگ رہی تھی۔ وہ اس وقت جس کمرے میں براجمان تھی وہ پرکدہ باغ کے بائیں جانب بنے تین چار کمروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے

شاندار گھر کا تھا جس کا ایک راستہ باغ میں کھلتا تھا تو دوسرا راستہ سڑک کی جانب تھا۔ یہاں شاہ زر اکثر اپنے دوست احباب کے ساتھ آتا تو قیام کرتا تھا۔ اس وقت کمرے کے بائیں جانب نکڑ میں صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ دائیں جانب وارڈروب بنی ہوئی تھی۔ وارڈروب کے ساتھ ہی ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ ٹیبل کی دوسری طرف بیڈ تھا جس پر وہ خود بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک اٹیچڈ باتھ روم تھا۔ مختصر سے سازوسامان کے ساتھ کمرے کو "برائیڈل روم" کے طور پر سجا کر ہر چیز نکھار کر رکھ دی تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا جس پر پھولوں کی پتیاں بکھری پڑی تھیں۔ اس کے پورے وجود میں اب تھکن پوری طرح سرائیت کر چکی تھی۔ ایک عام سی لڑکی بھی دلہن بن کر کس قدر مجبور و بے بس اور لاچار ہو جاتی ہے وہ ایک لمحہ اس بات کا تجربہ کر چکی تھی۔ بے دلی سے بستر سے اتر کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی۔ آئینے میں چھائے ہوئے اپنے عکس پر نظریں جمائیں تو بے بسی کا ایک اور ریلا اس کے وجود میں چٹکیاں کاٹنے لگا۔ روح تلک گھائل ہو گئی جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ اندر سے سر ابھارنے والی لاتعداد آوازوں سے گھبرا کر اس نے ٹیبل پر رکھی بہت سی شیشیوں کو ہاتھ مار کر قالین پر گرا دیا تھا۔

’’ نہیں یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟‘‘ وہ بے بسی کی انتہا کو چھو کر رونا چاہتی تھی لیکن خشک آنکھیں ساتھ نبھانے سے قاصر تھیں وہ دکھ سے کٹ کر رہ گئی۔

وہ دلہن بنی اس قدر حسین لگ رہی تھی وہ خود بھی حیران تھی۔ یہ روپ اور جوبن' یہ سنگھار یہ ل فریب موہ لینے والا حسن اس وحشی درندے انسان کے لئے تھا اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر دلہا دلہن کے لئے تعریف ہی تعریف تھی۔

"چاند سورج کی جوڑی ہے۔ ''

"دلہن تو بہت خوب صورت ہے۔ ''

"بھئی! دلہا بھی کسی سے کم نہیں۔ ''

واقعی! ایک چندے آفتاب ہے تو چندے ماہتاب۔" اس کے کانوں میں اس طرح '' کے لاتعداد جملے پڑے تھے لیکن دل کے نہاں خانوں میں کسی ہلچل نہیں مچی تھی کوئی بھولی بسری یاد نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ ایک من چاہا گدگدی کرنے والا جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ آسودگی عطا کرنے والی سوچ نہیں ابھری تھی۔ ہر طرف تو صرف اور صرف تباہی مچی ہوئی تھی۔

اور اب اس بنے سنورے کمرے میں تنہا بیٹھی اپنے بے بس وجود کا جائزہ لے رہی تھی۔ نگاہیں مہندی سے سجے ہاتھوں' انگلیوں میں پھنسی انگوٹھیوں' ہاتھوں کی پشت پر ڈالا گیا زیور' کلائیوں میں پڑی سونے کی چوڑیوں اور کہنی تک جاتے زیورات پر اٹک گئیں۔ اندر باہر وحشت سی اتر آئی تھی۔ تیزی سے انگلیوں سے انگوٹھیاں اتار کر ڈریسنگ پر پٹخ دیں۔ ابھی صرف بائیں بازو سے چند چوڑیاں اتاری تھیں اور ابھی کچھ اتار رہی تھی جب کمرے کا دروازہ کھول کر وہ داخل

ہوا تھا۔ اسے بیڈ کی بجائے ڈریسنگ کے سامنے دیکھ کر وہ بالکل نہیں ٹھٹکا تھا۔ متانت و تفخر بھری چال چلتے اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ہلکی گہری سیاہ آنکھوں سے چھلکتی طنزیہ و استہزائیہ فتح مند مسکراہٹ دیکھ کر مشعال نے نگاہیں پھیر لیں۔

اتنی جلدی بھی کیا تھی یہ سب اتارنے کی۔ آخر کو مجھے یہیں آنا تھا۔ اتنی ہی بے ’ ’ قراری تھی کہ چند منٹ بھی انتظار نہ کر سکیں۔” وہ طنزیہ مسکراہٹ سجائے کہہ رہا تھا۔ مشعال نے بری طرح ہونٹ کاٹے۔ وہ ایک بندھے ہوئے جانور کی طرح بے بس تھی۔ نہیں تو اب تک نہ جانے کیا کر چکی ہوتی۔ زندگی اور موت اس کا مسئلہ نہیں تھا لیکن ماں باپ کی اصلیت کھل جانے کے بعد یہ دونوں ہی لفظ اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ جو اس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ وہ اس سے شادی سے پہلے موت کو گلے لگا لے گی لیکن لگا نہ پائی کیونکہ شاہ زر سے شادی کسی موت سے کم نہ تھی۔

آخر کو جناب! ہم ٹھہرے ہوس پرست لوگ اور تم نازک اندام حسن جہاں سوز کی ’ ’ مالک۔ تمہارے اس روپ بہروپ کا تھوڑا بہت خراج آخر کو ہماری طرف نکلتا ہی ہے نا اور خراج وصول کئے بغیر ہی یہ کیل کانٹے‘ یہ اپنے ہتھیار اتار پھینکو گی۔ بھئی زیادتی ہے نا۔” وہ کہہ کر ڈریسنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کی اس گل افشانی پر بل کھا کر رہ گئی۔ اندر ہی اندر لاوا پکنے لگا۔ وہ ایک دفعہ پھر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ تیزی سے اسٹول سے

اٹھ کھڑی ہوئی۔ رخ موڑ کر اس کے پاس سے ہٹنے کو تھی جب بالکل اچانک اس کا نازک بازو شاہ زر کی فولادی گرفت میں تھا۔ وہ تو صرف کسمسا کر رہ گئی۔ آنکھوں میں یک دم خوف آ گیا۔

‘‘چھوڑو مجھے۔’’ اس کے لوہے جیسے ہاتھ اس کا بازو کاٹ دینے کو تھے۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگی جبکہ شاہ زر پر اس کے چہرے پر دم بدم گہری ہوتی زردی کا بھی بالکل اثر نہ ہوا تھا۔ اسی طرح پتھریلے تاثرات چہرے پر سجائے بے حس کھڑا تھا۔ وہ پتا نہیں کیا سوچ کر آیا تھا وہ اس کے ارادے دیکھ کر دہل گئی۔

‘‘یہ جو کچھ بھی اتارا ہے پہلے اسے پہنو۔’’ اس کے اس نئے حکم پر وہ ٹھس بنی کھڑی رہی۔ اس کی ساری توجہ اپنے بازو کی طرف تھی جو شاہ زر کی مضبوط گرفت میں مسلا جا رہا تھا۔

‘‘نہیں پہنوں گی میں کچھ بھی' چھوڑو جنگلی' درندے میرا بازو۔’’ وہ اس دم بدم شدت اختیار کرتی تکلیف سے پھٹ پڑی۔

‘‘شٹ اپ مشعال بیگم... ! اپنی زبان کو لگام دو۔ مت بھولو اب میں تمہارا شوہر ہوں۔’’ شاہ زر کے ہونٹ سخت طیش' غصے' اضطراب اور مالکانہ حقوق کے نشے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وہ ساری چوکڑی بھول بھال گئی۔ بازو کی تکلیف ایک دم بھولی تو اسے شاہ زر کے وجود نے ایک دم ڈرا دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھیں جھکا کر نظریں زمین پر گاڑھ گئی۔ اس کی زندگی میں یہ لاچاری والا مقام کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی مقابل کے ہاتھ نہیں روک سکتی تھی۔ شاہ زر آرام سے خود چوڑیاں اور رنگز اس کے ہاتھ میں پھنسانے لگا۔ دوسرا بازو اس کی کمر میں حمائل

کر کے اسے بستر تک لایا تھا۔ لیکن بیڈ پر بٹھانے کی بجائے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔ وہ منہ کے بل بستر پر گری تھی۔ دوسرا لمحہ اس کے لئے اور زیادہ ناقابل یقین اور حیرت انگیز تھا۔ سیدھی ہو کر کہنیوں کے بل آنکھیں پھاڑے شاہ رز کو دیکھ رہی تھی۔

’’اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔ تمہاری معلومات تو اتنی اپ ٹو ڈیٹ تھیں تو پھر میری جان! اب کیوں بھول رہی ہو۔ بھئی میں اسی علاقے سے تعلق رکھتا ہوں اسی ماں کا بیٹا ہوں جس کا خاندان ہوس پرستی میں پیش پیش ہے۔ انہیں تو عورت حاصل کرنا ہوتی ہے چاہے وہ جیسے بھی حاصل ہو اور آخر کو میں بھی ٹھہرا ایک انا کا مارا نفس پرست انسان۔ یہی کہا تھا نا تم نے۔

وہ بے یقین نظروں سے دیکھتی پیچھے سرکنے لگی تھی لیکن شاہ رز نے اس کا کندھا تھام کر اسے کوئی مزاحمت نہیں کرنے دی تھی۔

’’تمہارا کیا خیال تھا میں تمہارے قرب کے لئے مر رہا ہوں‘ لعنت بھیجتا ہوں تم پر‘ تمہارے اس حسن پر‘ تمہارے اس وجود پر۔ اسے بازوؤں میں بھینچ کر وہ کہہ رہا تھا وہ آنسو جو بہنے سے انکاری تھے ایک دم رستہ پا گئے۔ وہ سسک اٹھی۔

’’نہ... نہیں... مشعال بیگم رونا نہیں۔ مجھے روتی ہوئی عورت بہت اٹریکٹ کرتی ہے اور عورت بھی تم جیسی ہو پھر تو کیا ہی بات ہے۔ روتی‘ بلکتی فریاد کرتی عورت ایک مرد کو بہت

اپیل کرتی ہے۔ جتنا بھی روئو گی اتنا ہی میرے اندر کے وحشی انسان کو انتقام کے لئے ابھارو گی۔“ وہ مزید نفرت سے کہہ رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

تم نے اپنی راہیں خود کھوٹی کی ہیں۔ اپنے راستوں میں کانٹے خود بوئے ہیں تم نے۔ ’ ’ ایک مرد کو للکارا تھا تم نے ’اب دیکھنا یہ مرد تمہارے ساتھ کیا کرتا ہے۔“ اس نے اس کے سر سے دوپٹہ کھینچ کر اتار پھینکا تھا۔ سیفٹی پنوں کی وجہ سے اس کے بال.بری طرح نوچے گئے تھے۔ لیکن دوسری طرف پرواہ ہی کسے تھی۔ وہ مکمل درندگی پر اترا ہوا تھا۔ اس کا زیور بھی نوچنے لگا۔

شاہ زر! یوں نہیں کرو... دیکھو مجھے چھوڑ دو پلیز...“ گھٹی گھٹی آنسوئوں سے تر آواز ’ ’ بمشکل اس کے حلق سے.برآمد ہوئی تھی۔ شاہ زر نے اسے دیکھا۔ عجیب طرح کا سکون رگ و پے میں سرائیت کرتا گیا۔

بھول گئی تم! تم نے ہی تو کہا تھا کہ خوب صورت لوگوں کی آفر کو ٹھکرایا نہیں ’ ’ “کرتے۔ دیکھنا آج بالکل نہیں ٹھکرائوں گا۔

شاہ زر! پلیز...“ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے وہ اور شدت سے رونے لگی۔ اس ’ ’ نے نخوت سے سر جھٹکا۔

اتنی جلدی ڈر گئیں مشعال بیگم! چیلنج تم نے کیا تھا اور میں عمل کروں گا۔ مردانگی کو ’ ’ تم نے للکارا تھا۔ اب مظاہرہ بھی دیکھ لو۔ یہی آنکھیں تھیں ناں جن کے لئے تم نے.بڑی امی

سے بدتمیزی کی تھی۔ اب ان آنکھوں کو بند کر سکتی ہو تو بند کرنا۔ ان ہاتھوں کو روک سکتی ہو تو روکنا۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہاں تک تم جیتتی ہو۔ شکر کرو نکاح کر لیا تم سے۔" نفرت و حقارت سے وہ کہہ رہا تھا وہ اپنے کانوں کو بند کرنا چاہتی تھی۔ وہ پورا درندہ بنا ہوا تھا۔ شیطان کیسا ہوتا ہے وہ مجسم دیکھ رہی تھی۔ اس قدر شکست سے دوچار وہ زندگی میں پہلی بار ہوئی تھی۔ اگر تین لفظ کسی کی زندگی کو بدل دیتے ہیں تو وہ انہی تین لفظوں کے عوض ایک "درندہ صفت" انسان کے شکنجے میں گرفتار تھی۔ ستم یہ تھا کہ وہ لب کشائی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ رو بھی نہیں سکتی اور نہ ہی احتجاج کرنے کی اجازت تھی۔

گزشتہ رات اس کے لئے بہت ہی بھیانک تھی۔ کہنے کو تو وہ ایک رات تھی لیکن کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ اس نے ڈاکوئوں' لٹیروں کے بارے میں سن اور دیکھ رکھا تھا لیکن رات اس کی ذات پر جو ڈاکہ پڑا تھا وہ کسی ڈاکو لٹیرے کا کام نہ تھا بلکہ وہ اس شخص کا کام تھا جس نے ڈاکہ ڈالنے کا باضابطہ' باقاعدہ پرامن و منظّم طریقہ اپنایا تھا۔ لوٹا بھی تھا تو کس قدر صفائی سے کہ مطلب بھی پورا ہو گیا اور الزام بھی نہ آیا۔ وہ زندگی بھر کبھی اتنا نہیں روئی تھی جتنا وہ اس ایک رات میں رو چکی تھی۔

کمرے کے دروازے پر کوئی چوتھی مرتبہ دستک ہوئی تو وہ اپنے دکھتے سر پر ہاتھ رکھ کر چادر سر تک تان کر سیدھی لیٹی رہی۔

ر کو بھی آتا ہوں۔" جب دروازے پر پانچویں مرتبہ دستک ہوئی تو شاہ زر باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا۔ سر کے بالوں سے ٹپکنے والا پانی اور کندھے پر پڑا ٹاول اس بات کا واضح ثبوت تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا تو بڑی امی کے ساتھ سارہ اماں دروازے پر موجود تھیں۔ اسے دیکھ کر دونوں مسکرائیں۔

ساڑھے نو بج رہے ہیں اور تم دونوں کے کمرے سے باہر نکلنے کے آثار ہی دکھائی نہیں دے رہے۔" شاہ زر کے نکھرے نکھرے تازہ دم چہرے کو دیکھ کر بڑی امی کہنے لگیں۔ وہ ایک دم ایک طرف ہو کر انہیں اندر آنے کا راستہ دے گیا۔ "آپ اندر آئیں ناں..."

وہ دونوں اندر آ گئی تھیں۔ سارے کمرے کا بغور جائزہ لیتے ان کی نظریں مشعل کے چت لیٹے وجود پر پڑیں تو دونوں نے سوالیہ نظروں سے شاہ زر کا جائزہ لیا۔ مشعل کا شادی کے متعلق جو بھی رویہ رہا تھا وہ سب اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے شاہ زر کے لئے انکار سے گریز اور نفرت کسی سے چھپی نہیں تھی۔ کچھ ایسے ہی سوال ان کی آنکھوں میں بھی رقم تھے جنہیں محسوس کر کے شاہ زر ایک دم مسکرا دیا۔ بڑی بھرپور جاندار مسکراہٹ تھی اس کے ہونٹوں پر۔ آپ بیٹھیں۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

نہیں۔ ہم صرف دیکھنے آئی تھیں۔ تم بہو کو اٹھا دو۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔"

سارہ اماں کی بات پر اس نے فوراً سر ہلایا۔ دونوں باہر نکلیں تو اس نے جلدی سے دروازہ بند

کیا۔ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر ایک سکون بھری سانس لی۔ پھر اچانک مشعال کا خیال آیا تو فوراً بستر کی طرف آ گیا۔

''ارے اب اٹھ بھی جاؤ۔'' باتھ روم میں گھسنے سے پہلے وہ اسے ایک دفعہ اٹھا چکا تھا۔ لیکن اب پھر اس کا کندھا ہلانے لگا۔ دوسری طرف سے اٹھنے کے بالکل بھی آثار نہ دیکھ کر اس نے اس کے وجود سے چادر ہی کھینچ لی۔

اس کے سامنے مشعال کا بکھرا بکھرا وجود، سرخ چہرہ، متورم، سوچتی ہوئی آنکھیں آ گئی تھیں۔ وہ چہرے پر بازو رکھ کر دوسرے ہاتھ سے چادر پکڑ کر ایک دم کروٹ بدل گئی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اسے یوں دیکھ کر بہت سکون ملا۔ ڈریسنگ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے وجود کا جائزہ لینے لگا۔

''اس سے پہلے کہ سارہ اماں دوبارہ آ کر اٹھائیں۔ آرام سے اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔'' وہ تحکم بھرے لہجے میں حکم دینے لگا۔ وہ تاسف سے سوچنے لگی۔ اس کی آنکھوں، چہرے، لہجے حتی کہ پورے وجود میں گزری رات کی بدسلوکی کا ذرا بھی شائبہ تک نہ تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر سارے عالم میں اس باحیاء، باعزت، پاکباز شخص کے کالے کرتوتوں کی تشہیر کر دے۔ بے دلی سے خود کو اٹھنے پر مجبور کر کے وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ اپنے وجود پر چھائی تھکن اتارنے کو وہ کتنی دیر تک نل کھول کر اپنے وجود کے مسام مسام میں ٹھنڈک اتارنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن اندر جو ایک آگ دہکی تھی۔ رات کے اندھیرے میں سلگائی گئی یہ

آگ پانی سے بجھنے والی نہ تھی۔ وہ باتھ روم میں ٹنگی باتھ گاؤن پہن کر باہر نکل آئی۔ وہ اخبار میں بری طرح مگن تھا۔ اس کے باہر نکلنے کو اس نے سرسری سے انداز میں دیکھا۔ وہ برش لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

شاہ زر نے اخبار لپیٹ کر مشعال کے چپ چپ اور سوجی بند آنکھوں والے وجود کو دیکھا اور پھر اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا۔

’’اسی حلیے میں رہنے کا ارادہ ہے کیا؟‘‘ اس کی آواز پر اس نے لمحہ بھر کو آنکھیں کھول کر اپنے وجود پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس وقت خود سے بھی لڑ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس سجے سجائے کمرے کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ اپنے وجود سے کھیلنے والے کو نذر آتش کر دے۔

’’اے! سنا نہیں تم نے۔ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں!‘‘ وہ عام حالات میں بھی غصے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر مخاطب تھا۔ وہ اس کے ہاتھ مارنے پر طیش سے اسے دیکھ کر فوراً صوفے سے اٹھ کر اس کی دسترس سے دور ہو گئی۔ منٹوں میں وارڈروب میں لٹکے لباس کو کھینچ کر دوبارہ غسل خانے میں گھس گئی تھی۔ جب باہر آئی تو سارہ اماں کھانا لئے موجود تھیں اور شاہ زر ناشتے کے ساتھ پورا پورا انصاف کر رہا تھا۔ وہ انہیں کمرے میں دیکھ کر جھجک گئی۔

السلام علیکم اماں!" مجبوراً انہیں سلام بھی کر ڈالا۔ وہ مسکرا کر دعائیں دینے لگیں۔ پھر ’ ’ اسے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ جلتے بدن میں بھوک کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ کل سارا دن اس نے ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔ وہ خاموشی سے لقمہ لقمہ حلق میں اتارنے لگی۔ پیٹ کی بھوک مٹی تو اسے بھی اپنے سوا کچھ اور دکھائی دیا۔ وہ جیسے ہی کھانے سے فارغ ہوئی تو ابیشا عائشہ کے ہمراہ چلی آئی۔

کیا مشکل ہے؟ دلہن صاحبہ کو سلام کرنے اتنی دور ہمیں آنا پڑا ہے ایک تو مجھے یہ شاہ ’ ’ بھائی! آپ کی سمجھ نہیں آئی۔ جب حویلی موجود تھی تو اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ تپی ہوئی تھی آتے ہی سلام دعا کے بعد اسٹارٹ ہو گئی جبکہ ابیشا چپ سی تھی شاہ زر اس کے غصے پر مسکرا دیا۔

ایڈونچر... ڈیزیسٹر! دس از ایڈونچر۔" وہ چہکا۔ وہ بل کھا کر رہ گئی۔ اسے اتنا خوش دیکھ ’ ’ کر۔

اسے اپنی سفاکیت کو چھپانا بھی تو تھا۔ بے چارہ اگر حویلی کا انتخاب کرتا تو ساری پول ’ ’ کھل جاتی اور تمام پاک بازی‘ عزت و غیرت مٹی میں مل جاتی۔" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

شاہ بھائی! اب آئندہ کی کیا پلاننگ ہے۔ یہیں ڈیرہ جمائے رکھنا ہے یا پھر حویلی میں ’ ’ جانا ہے۔" وہ براہ راست شاہ زر سے پوچھنے لگی۔

بھئی! آگے کی تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ جب تک میں گاؤں میں ہوں۔ یہیں ’ ’ رہوں گا۔” وہ بہت واضح انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اسے غصہ آنے لگا۔ ”دوغلا‘ کمینہ‘ بہروپیا۔ میری تو دعا ہے کہ اللہ تمہارے یہ دن ہی گن لے۔” اس نے پوری شدت سے اس کے لئے بددعا کی۔

کیا بات ہے مشعال۔ میرا مطلب ہے بھابھی! بہت خاموش ہیں۔” اس کے رویے ’ ’ سے آگاہ تھی پھر بھی مخاطب کر گئی صرف اس کی چپ توڑنے کو ساتھ شاہ زر کو بھی دیکھنے لگی۔

میں کیا کہہ سکتا ہوں یہ تو تم اسی سے پوچھو۔ ویسے بھی ہم جیسے لوگ اس کی نظر میں ’ ’ کم تر ہیں اور یہ کم تر لوگوں سے کلام کرنا پسند نہیں کرتیں۔” اس کے تپے چہرے کو دیکھتے چوٹ کر کے باہر نکل گیا وہ اندر ہی اندر تلملاتی رہی۔

خدا تمہیں سمجھے شاہ زر! زندہ انسانوں سے کھیلنا کس قدر آسان سمجھ رکھا ہے تم ’ ’ ” نے۔

میں ذرا باہر کا ایک چکر لگا آؤں۔” بہت جلدی علیشہ بھی مشعال کی مسلسل چپ سے ’ ’ اکتا کر باہر نکل گی۔ ابیشا اس کے پاس رہ گئی تھی۔ وہ چپ سی تھی۔ علیشہ کے چلے جانے کے بعد اس کا ہاتھ تھام کر چہرے کا بغور جائزہ لینے لگی۔ مشعال اس سے نظریں نہیں چرا پائی تھی لیکن سر جھکا گئی۔

مجھے معاف کر دیں مشعال آپی! میں چاہتے ہوئے بھی آپ کے لئے کچھ نہ کر پائی۔"

وہ رونے لگی تھی۔ مشعال کی آنکھوں میں جو اتنی دیر سے خشک و ساکت تھیں نہ جانے کہاں سے دھند آئی وہ خاموشی سے اس کے کندھے سے سر ٹکا گئی۔

ابیشا! وہ بالکل اچھا نہیں ہے۔ وہ بہت بُرا انسان ہے۔ اسے انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ وہ شیطان سے زیادہ بد عمل و بد کردار ہے۔ وہ ڈاکوؤں و لٹیروں سے بڑھ کر ظالم و سفاک ہے۔ میں اسے جانتی تھی لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ ماما پاپا نے مجھے اس کے ہاتھوں مرنے کے لئے دے دیا۔ دکھ تو مجھے اس بات کا ہے کہ میرے ساتھ یہ سلوک کروانے میں میرے ماں باپ شامل ہیں۔ ابیشا وہ بہت گھٹیا شخص ہے۔ میں مر جاؤں گی ابیشا! وہ مجھے مار دے گا اس نے مجھ سے نکاح بھی صرف انتقاماً کیا ہے صرف میرا غرور توڑنے کے لئے۔ میں ان لاکھوں لڑکیوں میں شامل نہیں ہوئی جو اس کے لئے دل ہتھیلی پر رکھے اپنی انسلٹ کروانے کو بے تاب رہتی تھیں۔ میں نے اس کی ذات پر بھروسہ نہ کیا اور اس نے مجھ سے نکاح کر لیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی نفی کی اس سے تعلق خاطر سے انکار کیا۔ اس کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے تو سزا کے طور پر اس نے مجھ سے نکاح کر لیا۔ اور ابیشا وہ میرا وجود چھلنی چھلنی کر دے گا۔ وہ مجھے مار دے گا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ابیشا اسے یوں بلک بلک کر روتے دیکھ کر' اپنے کانوں سے سب سن کر' آنکھوں سے اس کے چھلنی جلے وجود کو دیکھ کر ساکت بیٹھی رہ گئی۔ جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

وہ ایسے لگتے تو نہیں؟" کافی دیر بعد اس نے لب کشائی کی۔ ’ ’

نہیں ابیشا وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ یہ درندگی تو اس کے خون میں شامل ہے۔ وراثت ’ ’ میں ملی ہے اسے۔ اس نے ظاہری نیک نامی اور عزت کا خول چڑھا رکھا ہے لیکن وہ اندر سے اتنا گھٹیا اور سفاک ہے کسی درندہ صفت انسان سے بھی بدتر و خون آشام۔" وہ نفرت و حقارت سے بتاتی گئی۔ "اس کا مقصد صرف مجھے ہرانا تھا۔ وہ یہی کہتا ہے۔ اس نے میری انا و خودداری کو اپنے قدموں تلے روند ڈالنے کے لئے یہ بندھن باندھا تھا۔ میں نے واضح انداز میں اس کی نفی کی تھی اور اس نے سب کو تین حرفوں کی ضمانت دے کر مجھ سے برائی کا وہ غلط کھیل کھیلا ہے جو انسانیت کے زمرے میں داخل نہیں ہوتا۔ میں اس کے لئے چیلنج بنی ہوئی تھی۔ وہ یہی کہتا ہے اور یہی سچ ہے۔ ماما پاپا نے مجھے اس کے آگے بے توقیر کر دیا۔" وہ اور شدت سے رو رہی تھی۔ ابیشا ہولے ہولے آنسو بہاتی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

ابیشا! میں کبھی بھی نہ ہارتی۔ اور نہ ہی کبھی اس پر تھوکتی اگر ماما پاپا نے مجھے اس کے ’ ’ سامنے یوں دو ٹکے کا نہ کر دیا ہوتا۔ میں اب بھی کمزور نہیں ہوئی، میں وقتی طور پر ضرور دب گئی ہوں لیکن میں اب بھی اس کے لئے وہی گونجتا ہوا اشگاف چیلنج بنی رہوں گی جسے وہ روز ہرائے گا اور شاید اپنے عمل اور اپنی کوشش میں فتح مند بھی ٹھہرے گا لیکن میں نہیں جھکوں گی۔ میں اسے کبھی بھی قبول نہیں کروں گی۔ چاہے وہ مجھے مار ہی ڈالے۔ جسم کی بوٹی بوٹی کر دے حلق سے سانس تک کھینچ لے۔" وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھی۔ وہ ذہنی لحاظ سے بہت

اپ سیٹ تھی۔ ابیشا سن کر اور ہولنے لگی۔ دونوں ہی سخت تھے۔ دونوں ہی انا بلند کئے ہوئے تھے اور دونوں ہی جھکنے پر تیار نہیں تھے۔ دونوں کا المیہ یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی ایک ایک بات سے باخبر ہونے کے باوجود بے خبر تھے۔ اپنے اپنے انا و خودداری کے خول میں بند و قید۔ اور ہر حد تک گزر جانے کے لئے تیار تھے۔ وہ کیا کر سکتی تھی' رو سکتی تھی' دعا کر سکتی تھی۔ اس کا تو بس دونوں پر ہی نہیں چلتا تھا۔

ابیشا! وہ میرے والدین نہیں ہیں۔ میں انہیں اس زیادتی پر کبھی بھی معاف نہیں ' ' کروں گی۔ کیوں کیا انہوں نے ایسا؟ جب آج تک میں نے ان کا کبھی برا نہیں سوچا. برا نہیں کیا تو پھر میرے ساتھ یہ دھوکہ دہی کرنا کیا ضروری تھا۔ وہ شدت سے روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ابیشا کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

ابیشا! وہ میرے والدین نہیں ہیں۔ میں انہیں اس زیادتی پر کبھی بھی معاف نہیں ' ' کروں گی۔ کیوں کیا انہوں نے ایسا؟ جب آج تک میں نے ان کا کبھی برا نہیں سوچا. برا نہیں کیا تو پھر میرے ساتھ یہ دھوکہ دہی کرنا کیا ضروری تھا۔ وہ شدت سے روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ابیشا کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

ولیمے کی تقریب حویلی میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد دعوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شاہ رز کے پاس صرف ایک ہفتے کی چھٹیاں باقی تھیں۔ رشتہ داروں اور جاننے والوں میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ ان آٹھ دنوں میں دلہا دلہن کی دعوت کریں۔ ہر روز کبھی وہ دونوں یا

پھر کبھی سب حویلی والے کہیں نہ کہیں مدعو ہوتے تھے۔ جیسے ہی تین چار دن گزرے وہ اس روٹین سے اکتا گئی۔ اس کا "لائف شیڈول" اس اسٹائل سے بالکل بھی میچ نہیں کرتا تھا۔ ہر جگہ، ہر موقع اور ہر بات پر اعتراض کا پہلو نکل آتا تھا۔ اسے یوں ڈھیروں ڈھیر زیور پہن کر بھاری کپڑے زیب تن کئے ایک جاگیردارنی کا بہروپ بھرنا کافی برا لگتا تھا لیکن اس کی شاہ رز کے سامنے ایک بھی نہیں چل رہی تھی۔ وہ ہر وقت ہر موقعے پر اس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتی تھی۔ وہ جس طرح اسے ٹریپ کرتا وہ رہائی کا راستہ تلاش کرتے کرتے تھک جاتی لیکن ابھی تک صرف ناکام ہی ہو رہی تھی۔ وہ اسے اذیت میں مبتلا کرنے کا ایک لمحہ بھی فراموش نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت اس پر طنز و تمسخر کے تیر برسانے کو تیار۔ وہ دل ہی دل میں اس کی جلد از جلد چھٹیاں ختم ہو جانے کی دعا کرنے لگی۔

"بیٹا! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" تھوڑی دیر پہلے شاہ رز خود اسے تیار ہونے کا کہہ کر گیا تھا۔ آج دونوں کی دعوت شاہ رز کے ایک دوست کے ہاں تھی جو ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ ایک طرح سے وہ ان کی برادری سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اوپر سے اس کے پاس اس وقت کھانے کو کوئی ٹیبلٹ بھی نہ تھی۔ اس کے حکم کی پرواہ کئے بغیر لیٹی رہی۔ اب اماں دوبارہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"اماں میں نہیں جاؤں گی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"
وہ بے بسی سے رونے کو تھی۔ اماں محسوس کر کے اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

“میں صدقے جاؤں۔ ضرور میری بیٹی کو نظر لگ گئی ہوگی۔ ہو بھی تو اتنی پیاری۔ پھر تم اس گاؤں کی زندگی کی عادی ہی کب ہو۔ آہستہ آہستہ ہی عادی ہو گی۔” اماں اس کے جذبات سمجھ کر دلگیری کرنے لگیں وہ ہمدردی پا کر رو پڑی۔ اس نے ماما پاپا اور باقی حویلی والوں سے قطع تعلق کیا ہوا تھا صرف ابیشا اور سارہ اماں سے بات کر لیتی تھی۔ ابیشا ہر روز صبح صبح آ جاتی تھی۔ سارا دن اس کے ساتھ گزار کر شام کو چلی جاتی تھی۔ وہ خود بھی حویلی میں جب بھی جاتی تو چپ بیٹھی رہتی۔ کوئی بلاتا، مخاطب کرتا چپ سادھے رہتی۔ اگر وہاں سے کوئی آتا تو پھر بھی یہی کرتی تھی۔ حویلی میں جا کر تو کسی کا بھی خیال نہیں کرتی تھی۔ ماما اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتیں پیار کرتیں لیکن وہ پتھر بنی رہتی کسی بھی قسم کا رسپانس نہ دیتی تھی۔ بعد میں گھر واپس آ کر شاہ زر اس کی جو شامت بلاتا تھا وہ بھی کسی سے کم نہ تھی۔ اماں اسے روتا دیکھ کر چپ کرانے لگیں سر درد تو ایک بہانہ تھا البتہ اپنی بے بسی نے رلا دیا تھا۔

“اماں شاہ زر کو منع کر دیں میں نہیں جاؤں گی۔” وہ شاہ زر کے رویے سے خائف ہو کر اماں کو اپنا ہم نوا بنانے لگی۔ اس کے بہتے آنسو دیکھ کو وہ فوراً مان بھی گئیں۔

“وہاں جانا بہت ضروری نہیں ہے جب تمہاری طبیعت ہی ٹھیک نہیں تو پھر کیا فائدہ۔ میں کہتی ہوں شازر سے وہ اکیلا ہی چلا جائے۔” اماں تسلی دیتی چلی گئیں وہ لیٹ کر ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگی لیکن ان کی بجائے شاہ زر کو کمرے میں آتا دیکھ کر اس کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہاری طبیعت کو؟" آتے ہی وہ پتھر پھوڑنے لگا وہ چپ رہی۔ "تھوڑی دیر پہلے تو تم اچھی بھلی ابیشا سے باتیں بگاڑ رہی تھیں اور یہ اچانک اس کے جاتے ہی تمہیں کہاں سے بہانہ سوجھ گیا ہے۔" وہ اس حیلہ جو کی ہر ادا سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے انکار کو بہانہ قرار دینے لگا۔ وہ آنکھیں کھول کر تحیر سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے واقعی سر درد ہو رہا تھا بس فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اماں کے سامنے رو پڑی تھی۔

"مجھے واقعی سر میں درد ہو رہا ہے۔ اس میں بھلا بہانے بازی کی کیا بات ہے؟" وہ غصے سے پوچھنے لگی۔

"تمہیں وہاں جا کر کوئی پہاڑ نہیں ڈھانا اور جگہوں پر بھی جا کر تم خاموش رہتی ہو۔ کوئی سو سو مرتبہ بلاتا ہے تو میڈم صاحبہ یوں جواب دیتی ہیں جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کر رہی ہوں۔ اب بھی وہی احسان کر لینا لیکن میں انکار نہیں سنوں گا۔ صرف سر میں درد ہو رہا ہے مر نہیں گئیں تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ جانا ہے۔ میں اماں کے ہاتھ گولیاں بھجوا دیتا ہوں سر درد کی کھا لینا اور ہاں جلدی تیار ہو جائو صرف پندرہ منٹ ہیں تمہارے پاس۔ سمجھ رہی ہو نا۔" وہ ان گزرے چند دنوں میں اس کے اس تحکم بھرے اسٹائل سے بہت عاجز آ چکی تھی۔ اب بھی بات کہہ کر اس کی سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا وہ سر تھامے بیٹھی رہ گئی۔

"ہونہہ... گولیاں بھجوائے گا۔ زہر بھجوا دو۔ جان چھوٹے میری اس روز روز کے عذاب سے۔" وہ حکم سنا کر گیا تھا اب تو انکار کی گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی۔ وہ خاموشی سے تیار ہو گئی

سارہ اماں نے گولیاں لا دی تھیں وہ بھی کھا لیں پھر خاموشی سے باہر نکل آئی ویسے بھی وہ اس خود سر انسان کو باتیں بنانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ جتنا بھی وقت گزرتا بہتر تھا۔ اس کے دوست کا گھر بہت ہی عام سا تھا لیکن اصل بات تو خلوص اور محبت کی تھی۔ جو ان لوگوں میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ دونوں کو بہت خاص پروٹوکول دیا گیا تھا۔ باقی دعوتوں کی طرح وہ وہاں بھی خاموش مہر بہ لب رہی۔ سب نے محسوس کیا اور کہا بھی لیکن شاہ زر اس کی طبیعت کی ناسازی کا کہہ کر ٹال گیا۔

بڑی مشکلوں سے اس نے وہاں وقت گزارا تھا۔ گھر واپس لوٹتے ہی کمرے کی تنہائیوں میں پناہ ملتے ہی وہ پھوٹ کر رو دی۔ وہ شاہ زر کے شکنجے میں قید ہو کر بالکل بے بس و لاچار ہو گئی تھی۔ بالکل ایک اپاہج شخص کی طرح۔ ہر کام، ہر بات ہر جگہ وہ اس کی ہتک، بے عزتی اور توہین کر جاتا تھا۔ وہ اس کی دسترس سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ کہیں ایسی جگہ جہاں شاہ زر کا سایہ تک نہ ہو لیکن یہ اتنا آسان نہ تھا۔ یہی سوچ بے بسی کی انتہا اور ستم ظریفی اسے مزید رلا رہی تھی۔ سارا سارا دن وہ اس کی نظروں اور باتوں سے چھلنی ہوتی رہتی تھی اور ساری ساری رات اس کے جملوں سے سلگتی رہتی۔ وہ پناہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتی لیکن اسے کوئی خبر، کوئی روزن پناہ کے لیئے نہ ملتی تھی۔ پتا نہیں شاہ زر کی سائیکی کیا تھی۔ وہ جوں جوں سوچتی جاتی الجھتی جاتی۔

ایک طرف اس کے وجود کو زخمی زخمی کرتا تو دوسری طرف زخموں پر مسکراہٹوں کے پھاہے بھی رکھتا تھا۔ اس کی بے بسی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتا۔

’’میں بہت رحم دل ہوں، کسی کو تکلیف میں تڑپتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے مرہم جوئی بھی کرنے پر مجبور ہوں۔ زخموں کی رفوگری کرنے سے بڑی شانتی ملتی ہے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں۔‘‘

اور وہ اتنی اس کے دیئے گئے زخموں سے چھلنی نہیں ہو رہی تھی جس قدر اس کا سلوک اسے کر رہا تھا۔ وہ تنہا، چپ چاپ اس کا وحشیانہ سلوک برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ بہت جلد ہی ہار جائے گی۔ وہ اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ ختم ہو رہی تھی۔ وہ آزاد فضاؤں میں پل بڑھ کر جوان ہونے والی آزاد پنچھی تھی۔ اب جو ایک دم پنجرے میں قید ہو گئی تھی تو برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ماما پاپا کو تو اس نے کہنے سننے کا کوئی بھی حق نہیں دیا تھا۔ البتہ ابیشا ہر روز آتی رہتی تھی اور پھر شام کو جب لوٹتی تھی تو وہ خود کو ایک دم تنہا محسوس کرنے لگتی تھی۔

’’میں اور سارہ اماں شہر جا رہے ہیں پرسوں چلے جائیں گے۔‘‘ وہ بستر پر لیٹ چکی تھی۔ جب وہ تیار ہو رہا تھا وہ جو سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی ہوئی تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ خالی خالی نظروں سے بے دھیانی میں دیکھے گئی وہ ہاتھ میں اردو میگزین تھامے ورق گردانی میں مشغول تھا۔ عام سے انداز ولب و لہجے میں اس نے اطلاع دی تھی۔ سپاٹ چہرے پر

سوچ کی ایک گہری لکیر رقم تھی۔ فراخ پیشانی جو ہر وقت غصے کی لکیروں سے سجی رہتی تھی۔ اس سمے بالکل صاف شفاف جارحانہ لب و لہجے کا استعمال کرنے والا اس وقت میگزین کے اوراق میں غرق تھا۔ اس کی مغرور کھڑی ناک، اٹل ارادوں کا پتا دے رہی تھی۔ انابی بھرے بھرے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا ہوا تھا۔ جس سے اس کی سفاک شخصیت کی اچھی خاصی نشاندہی ہو رہی تھی۔

’’یہ بلاشبہ ایک مکمل مرد اور چھا جانے والی شخصیت کا مالک ہے۔‘‘ وہ دل میں اعتراف کرنے لگی۔ نظر اس کے چہرے سے پھسل کر اس کے چوڑے وجود کا طواف کرنے لگی۔ کمرے میں چھایا شاہ زر کی شخصیت کا فسوں بہت زیادہ سحر انگیز تھا۔ فراخ سینہ جو اس وقت قمیض کے بٹن کھلے ہونے کی بدولت صاف نظر آ رہا تھا۔ کہنیوں تک فولڈ کی گئی آستینیں مضبوط و توانا بازو جنہوں نے اسے کئی مرتبہ زیر بار کیا تھا وہ ایک نظر ڈال کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

’’اتنے بھرپور و توانا مرد کے ساتھ بھلا میری اوقات ہو بھی کیا سکتی ہے۔‘‘ وہ دلگر فتگی سے سوچنے لگی۔

’’اگر اسے اپنی شخصیت کا زعم اور غرور و فخر ہے تو غلط بھی نہیں ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ اپنی ظاہری شخصیت پر فخر کر سکے۔‘‘ دل نے دماغ کی تردید کر دی۔ ساتھ ہی نفرت کا ایک منہ زور ریلا بھی سرائیت کرتا دماغ میں گھس گیا۔ اس کی نظریں ایک دفعہ پھر اس مغرور، منتقم

مزاج، بے پرواہ انسان کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ نظریں بار بار بھٹک کر اس کی کالی سیاہ آنکھوں پر جم گئیں۔

’’یہ آنکھیں... اف اللہ...‘‘ وہ لرز کر رہ گئی۔ ان آنکھوں میں اس نے باہر آنکھیں گاڑھ کر مقابلہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت آنکھوں میں ہر وقت رہنے والی سفاکیت، وحشت، بربریت کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ سیاہ چمکیلی آنکھیں میگزین کے اوراق پر منجمد تھیں۔ اٹل پن صاف عیاں تھا۔ اس سے اسے یہ آنکھیں بہت اجنبی لگیں جن میں بچپن کا کوئی بھی عکس نہ تھا۔ وہ ایک عکس اس کی آنکھوں میں ڈھونڈنے لگی۔

’’ان اجنبی آنکھوں والا مرد کبھی بھی کسی کے ساتھ لحاظ و مروت کے ساتھ پیش نہیں آسکتا۔‘‘ وہ دکھ سے سوچ کر رہ گئی۔ اس نے اس کی آواز سنی تھی الفاظ پر غور نہیں کیا تھا۔ متوجہ رہی شاید حضرت دوبارہ کچھ فرمادیں۔ شاید اس کی خود پر مسلسل جمی نظروں کا ہی ارتکاز تھا کہ شاہ زر نے میگزین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر میگزین ایک طرف رکھ کر بستر پر چلا آیا۔ پھر اس کے پاس بستر پر بیٹھ کر بولا۔

’’میں اور اماں شہر جارہے ہیں اور تم حویلی میں رہو گی۔‘‘ وہ پھر بتانے لگا وہ سن کر ایک دم خوش ہو گئی۔

اچھا... کیا واقعی ؟" وہ ہمہ وقت اس کی خود پر مرکوز نظروں' اس کے ظلم اور رویے سے تنگ آگئی تھی۔ ابھی شاہ زر کی تین چھٹیاں باقی تھیں لیکن یہ مژدہ جاں فزاء سن کر بے اختیار اس کے منہ نکل گیا۔ جواباً اس نے جن نظروں سے دیکھا وہ چپ ہو گئی۔

شہر میں مجھے بنگلہ مل گیا ہے۔ ابھی اس کی کچھ سیٹنگ باقی ہے اسی لئے میں اور اماں جا رہے ہیں۔" وضاحت پیش کرنا مسٹر شاہ زر جہانزیب کا خاصہ نہ تھا لیکن مشعال کے ایک دم چپ ہو جانے پر بتانے لگا۔ وہ ایک کان سن کر دوسرے سے نکالنے لگی۔ اسے کیا فرق پڑتا تھا وہ جہاں بھی رہے اور جہاں بھی جائے اس کی بلا سے۔ اس کے لئے تو یہ خوشی کا مقام تھا کہ اس ناپسندیدہ بندے سے اس کی جان چھوٹ رہی ہے۔

یہ رات اس کے لئے گزشتہ تمام راتوں سے مختلف تھی' شاہ زر نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ وہ بہت مطمئن ہو کر سوئی تھی' کتنے دنوں بعد اس نے ایسی بھرپور مطمئن نیند لی تھی۔ صبح اٹھی تو بہت فریش تھی۔ وہ قید سے رہا ہونے والی تھی اس بات پر دل کھول کر خوش ہو رہی تھی۔

سارہ اماں' دونوں کے لئے کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں وہ بھی ان کے پاس آگئی۔ وہ جب بھی اندر سے خوش ہوتی تھی گنگنا کر' چہک کر' بہک کر' خوش ہو کر اپنے ہر انداز سے خوشی کا اظہار کرتی تھی۔ اس وقت بھی خوشی کی لہریں اس کی ہر ہر ادا سے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھیں۔ ہونٹ کوئی انگلش سونگ گنگنا رہے تھے۔

’ ’ کیا بات ہے آج ہماری بیٹی بہت خوش ہے اور جلدی بھی اٹھ گئی ہو۔" اماں نے حیرت کا مظاہرہ کیا تو وہ کھل کر مسکرائی۔ یہ حسین پل اس کی دسترس میں تھے وہ بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ کسی تاریک لمحے کی گرفت میں آکر اپنی خوشی ملیامیٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ ساری رات کس خوفناک آسیب کی دسترس سے محفوظ رہی ہے اور اسی لئے وہ آج انہیں جلدی دکھائی دے گئی ہے۔

’ ’ لائیں میں پراٹھا بناتی ہوں۔" انہیں پیڑا بناتے دیکھ کر وہ آفر کرنے لگی۔ یا شاید ان کے سوال کے جواب سے بچنا چاہتی تھی۔

’ ’ تمہیں بنانا آتا ہے؟" وہ حیران ہو رہی تھی۔ اسی طرح جس طرح بھابی ہوتی تھیں۔

وہ مسکرا کر سر ہلا گئی پھر پراٹھے بنانے لگی۔ بہت نفاست سے وہ بنا رہی تھی' اماں کے لئے یہ سب ناقابل یقین تھا۔ وہ برملا اپنی حیرت کا بھی اظہار کر رہی تھیں وہ مسکراتے ہوئے ان کی تعریف وصول کرتی رہی۔ وہ جیسے ہی پراٹھے بنا کر فارغ ہوئی اماں اتنی دیر میں ٹیبل پر کھانا سجا چکی تھیں۔ وہ صرف ایک دودھ کا گلاس اور دو توس لے کر کچن سے باہر آنے لگی تو اماں نے ٹوک دیا۔

’ ’ ناشتہ نہیں کرو گی؟ ’ ’

’ ’ نہیں... میں نے کر لیا ہے۔ ویسے بھی اتنا ہیوی ناشتہ دولت و جاگیر کے نشے میں چور لوگ ہی کر سکتے ہیں' جن کے نزدیک انسانی احساسات اور جسموں کی وقعت کتوں اور کیڑے

مکوڑوں سے زیادہ نہیں۔ مجھ جیسے نہیں کر سکتے۔" کچن میں داخل ہوتے شاہ زر کو دیکھ کر براہ راست آنکھوں میں جھانکتے چوٹ کرتے ہوئے باغ میں آگئی۔ وہ مالی بابا کو غور سے دیکھنے لگی۔ جو نئے پودوں کے ارد گرد سے مٹی کھود کر کھاد ڈال رہا تھا۔ وہ جھولے پر بیٹھ کر دیکھتی رہی وہاں بیٹھے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب ملازمہ نے آکر اسے شاہ زر کا بلاوا دیا وہ بے دلی سے اٹھ کر اندر چلی آئی۔

تیار ہو جاؤ میں تمہیں حویلی میں چھوڑ آئوں۔" وہ وارڈروب کھولے اپنے کپڑے نکال ’ ’
کر بیڈ پر پھینکتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف بریف کیس پڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ شہر جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

حویلی کس لئے؟" سوال کرتے ہوئے کافی تیکھا انداز تھا۔ کپڑے ہینگرز سے اتارتے ’ ’
اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔

تمہیں رات میں نے بتایا تو تھا کہ میں اور سارہ اماں شہر جا رہے ہیں اور تم حویلی میں ’ ’
رہو گی۔ یہ جگہ حویلی سے کافی دور ہے اسی لئے میرے جانے کے بعد تمہیں حویلی میں ہی سب کے ساتھ رہنا ہو گا۔" نارمل انداز میں بتا کر وہ سوٹ کیس میں کپڑے رکھنے لگا۔ اس نے اسے پہلی دفعہ اپنا کوئی کام کرتے دیکھا تھا۔ نہیں تو ملازمائیں ہی ہر حکم کی تعمیل کو آموجود ہوتی تھیں۔ شاہ زر کے اس نئے حکم پر وہ خاموشی سے تیار ہونے لگی۔

حویلی میں قدم رکھتے ہی بغیر کسی کی طرف دیکھے اور سلام دعا کئے وہ سیدھی ابیشا کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

“ابھی میں آپ کی طرف آنے کا سوچ ہی رہی تھی۔ ’ ’

تم سوچ رہی تھی اور میں خود چلی آئی۔” وہ ہنس کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ’

کیا بات ہے؟ بہت خوش نظر آرہی ہیں؟” ابیشا محسوس تو پہلی نظر میں ہی کر گئی تھی ’ ’ لیکن اب پوچھا کافی دیر بعد وہ ہنس ہنس کر اسے اپنے خوش ہونے کی وجہ بتانے لگی۔

مجھ جیسے لوگ جن کے لئے بڑی سے بڑی بات بھی کوئی خوشی نہیں لاتی تھی۔ ’ ’ اب ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوشیاں تلاش کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔” وہ خود ہی ہنس کر اپنا مذاق اڑانے لگی تو ابیشا کو بڑا عجیب لگا۔ وہ سارا دن ابیشا کے ساتھ اس کے کمرے میں ہی رہی تھی۔ رات بھی اسی کے ساتھ سونے کا ارادہ تھا لیکن جس وقت وہ سونے کے لئے لیٹی تھی علیشہ چلی آئی۔

“شاہ بھائی آپ کو بلا رہے ہیں۔ ’ ’

تو کیا وہ ابھی تک شہر نہیں گیا؟” وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔ سارا دن سامنا نہیں ہوا تھا ’ ’ تو یہی نتیجہ اخذ کئے ہوئے تھی کہ وہ شہر چلا گیا ہوگا۔

نہیں‘ وہ صبح جائیں گے۔” وہ سوائے ابیشا کے کسی سے بات بھی نہیں کرتی تھی اس ’ ’ وقت بھی علیشہ مختصر جواب دے رہی تھی۔ اس کے چہرے اور لہجے پر ایک دم واضح ناگواری چھا گئی۔

کہاں ہے وہ؟” بستر سے اترتے روکھے پن سے پوچھا۔ ’ ’

اپنے کمرے میں۔” مختصر جواب دے کر وہ رکی نہیں تھی چلی گئی وہ دل ہی دل میں ’ ’ خون کے گھونٹ پیتی اسے صلواتیں سنانے لگی۔

’ ’ نہ جانے اس مصیبت‘ جان کے آزار سے کب جان چھوٹے گی؟ ’ ’

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ انتہائی کوفت زدہ تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے جس انداز میں زور سے دروازہ بند کیا تھا شاہ زر نے اس کے غصے کا اچھی طرح اندازہ لگایا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کا انتہائی برا رویہ بھی اسے سدھرنے پر مجبور نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک سیر تھا تو وہ سوا سیر تھی‘ پھر سدھرنے کا سوال فضول ہی تھا۔ شادی کے بعد وہ بارہا شاہ زر کے ہمراہ اس کمرے میں آچکی تھی لیکن رات دونوں باغ والے گھر میں ہی گزارتے تھے۔ آج رات کے اس پہر وہ اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ عجیب ملگجا خوابیدہ سا ماحول تھا۔ وہ سانس روکے ناگواری سے شاہ زر کو گھور کر سختی سے لب بھی بھینچ گئی۔ مبادا اس کے منہ سے کوئی سخت سست نہ نکل جائے۔

کیوں بلوایا ہے تم نے مجھے؟'' غصے کو کنٹرول کرتی وہ کافی رکھائی سے مخاطب تھی۔ شاہ ’ ’ زر نے بھی تیکھے چتونوں سے دیکھا۔

آرام سے بیٹھو اور تمیز سے بات کرو۔'' وہ غصے کو ضبط کرتا اسے ہاتھ کھینچ کر اپنے ’ ’ قریب بٹھا کر خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگا اس پر خاک اثر ہونا تھا رخ موڑ کر بیٹھ گئی اور وہ ایسا شخص تو نہیں تھا جو اس کی توجہ حاصل کرنے کو اس کا موڈ ٹھیک ہونے یا اس کا غصہ ختم ہونے کا انتظار کرتا۔ ہمیشہ والی دھونس کا مظاہرہ کرتے وہ اسے زچ کرنے کو تھا۔

میں صبح واپس جا رہا ہوں لیکن میں تمہیں بتا دوں یہاں تم صرف میرے نام کی وجہ ’ ’ سے معتبر ہو اور اسی نام کی وجہ سے تم یہاں رہو گی۔ مجھے تمہاری طرف سے کوئی شکایت نہ ملے اور یہ بھی سن لو حویلی میں آج تک عورتیں تہذیب کے ساتھ رہتی آ رہی ہیں اور تم بھی تہذیب کے ساتھ رہنا۔ کوئی اوٹ پٹانگ حرکت یا پھر کوئی بدتمیزی میں ہرگز برداشت نہیں ''کروں گا اور حویلی سے باہر آنے جانے کی بھی ضرورت نہیں۔

ہوں... کچھ اور یا بس؟'' تیکھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ’ ’

اور یہ چچا جان کے ساتھ تم نے کیسا رویہ اپنا رکھا ہے ان سے ملتی کیوں نہیں؟'' وہ اس ’ ’ کے غصے، بے رخی اور غصیلی تیکھی نظروں کی پرواہ کئے بغیر پوچھ رہا تھا۔ وہ اس معاملے پر چیخ ہی تو گئی۔

’’اسے ذہن میں رکھیں جناب! یہ میرا بالکل ذاتی معاملہ ہے، تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو اور میری ذات میں ٹانگیں مت اڑاؤ۔‘‘ وہ ابھی تک اس کی حیثیت تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی۔ بدتمیزی سے جواب دیا۔ شاہ زر نے خود کو کسی بھی قسم کی سخت زبان استعمال کرنے سے بمشکل روکا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس لڑکی کو مسل ڈالے۔

’’شرم کرو، وہ والدین ہیں تمہارے۔ کبھی سوچا ہے تمہارے اس رویے سے انہیں کس قدر تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اور کون سے والدین ہیں جو اولاد کی بہتری نہیں چاہتے۔ آج تک میں نے کسی بیٹی کو اپنے والدین کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے نہیں دیکھا۔‘‘

’’کیوں؟ تم کون ہوتے ہو مجھے شرم دلانے والے؟ اور کون سی بہتری کی بات کرتے ہو تم؟ یہ... یہ والی بہتری؟‘‘ غصہ حد سے بڑھا تھا یا پھر شاہ زر کی ’’بہتری‘‘ والی والی بات پر بے بس ہو گئی تھی۔

’’والدین جیسے بھی ہوں۔ اولاد جیسی بھی بری ہو کوئی بھی ماں باپ اسے اپنے ہاتھوں جہنم میں نہیں دھکیل دیتے۔ تم جن کو میرے والدین کہہ رہے ہو۔ وہ دراصل میرے والدین نہیں ہیں۔ میرے والدین مر گئے۔ میں انہیں اسی دن رو چکی تھی جب تم جیسے گھٹیا انسان کے سر تھوپی گئی تھی، پھر مجھ جیسی بے غیرت لڑکی جو والدین کی عزت دو ٹکے کی کرنے چلی ہو اس کے کوئی والدین نہیں ہوتے۔ اس کا کسی حسب نسب سے کوئی تعلق نہیں

ہوتا اور تم نہ جانے کن لوگوں کو میرے والدین بنا رہے ہو۔" وہ سفاکی کی حد تک ظالم تھی یا پھر مظاہرہ کر رہی تھی۔

وہ کتنی دیر تک ملامتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ جو اپنی بات مکمل کر کے شاہ زر کی پرواہ کئے بغیر لیٹ کر آنکھیں بند کر چکی تھی۔ جیسے وہ اسی کام کے لئے یہاں آئی ہو۔

'' کیوں؟ تمہارے والدین کیوں نہیں ہیں؟ تم آسمان سے ٹپک پڑی تھی یا زمین سے اگ آئی تھی؟ اونہہ... چلی ہو والدین کو مارنے والی۔ اچھی طرح سن لو تم نے اگر ان لوگوں کے ساتھ اپنا رویہ نہ بدلا تو میں کہہ دیتا ہوں مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

'' ہونہہ... کس خوش فہمی میں ہو میری فکر مت کرو۔ میری نظر میں تم سے زیادہ برا اور حیوان خصلت انسان کوئی نہیں۔ میں ایسی ہی ہوں اور ایسی ہی رہوں گی' تم جو کرنا چاہتے ہو کر لو' نہ تو مجھے موت کا ڈر ہے اور نہ ہی زندگی کی کوئی چاہ ہے اور تمہارے ساتھ رہتے ہوئے' تمہارے وحشی پن کے ہوتے ہوئے تو یہ دونوں چیزیں بھی بے معنی ہیں۔ اور تم مجھے اس معاملے میں مجبور نہیں کر پاؤ گے۔ چاہے مار ہی ڈالو۔" وہ اسے ایک دفعہ پھر چیلنجنگ انداز میں کہہ کر ہنسنے لگی۔ شاہ زر تلملا اٹھا۔ مشعال کو آزادی کا نشہ جو چڑھا ہوا تھا۔ اسی لئے جواب دینے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔

'' چلو ٹھیک ہے یہ تمہارے والدین کا مسئلہ ہے میں کچھ نہیں کہتا لیکن باقی لوگوں کے ساتھ تم ایسا سلوک کیوں کر رہی ہو؟" وہ جانے سے پہلے اس مسئلے کا حل چاہتا تھا۔ وہ نہیں

چاہتا تھا کہ حویلی میں کسی بھی قسم کی کشیدگی ہو جبکہ مشعال کی طرف سے اسے پوری توقع تھی۔ اسی لئے بہت تحمل سے ساری کڑوی کسیلی سن کر آرام سے مخاطب تھا۔ ورنہ مقابل اسے ان الفاظ سے مخاطب کرے اور وہ جواباً پر سکون رہے۔ یہ اس کی طبیعت کا خاصہ نہ تھا۔

حیرت ہے مسٹر شاہ زر جہانزیب یہ سوال تم مجھ سے کر رہے ہو۔ مشعال کمال سے۔” ’ ’ وہ استہزائیہ ہنس پڑی تھی۔ ”بہتر ہے کہ تم یہ سوال اپنے آپ سے کرو۔” وہ نفرت سے کہہ کر کروٹ بھی بدل گئی تھی۔ شاہ زر نے انتہائی غصے میں اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیا۔

کیا مطلب ہے تمہارا؟” اس کی آواز کسی درندہ صفت انسان کی طرح پھٹی تھی وہ ’ ’ استہزائیہ دیکھ کر رہ گئی۔

سن لو گے میرا مطلب؟ برداشت کر لو گے میرا جواب؟” اس کی آنکھیں ’ ’ گاڑھے وہ سراپا سوال تھی۔

مشعال! میں کچھ پوچھ رہا ہوں؟” وہ غصے سے چیخ اٹھا۔ وہ جانے سے پہلے مشعال کے ’ ’ ساتھ برا سلوک نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی برداشت ختم ہو رہی ہے۔

زیادہ غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے کیا پرواہ ہے۔ بتائے دیتی ’ ’ ہوں۔ مسٹر شاہ زر جہانزیب! دنیا کمینے لوگوں سے بھری پڑی ہے اور سارے کے سارے کمینے

اس حویلی میں جمع ہیں اور میری ایک عادت ہے کہ میں کمینے لوگوں سے کلام کرنا پسند نہیں کرتی۔ یہ جواب تھا کہ غیرت پر تازیانہ تھا۔ وہ اس کی بات پر غضبناک ہو کر چیخ پڑا تھا۔

’’شٹ اپ... جسٹ شٹ اپ۔‘‘ مشعال نے اس کے غصے کو ہوا دی تھی۔ غصے کی زیادتی اور برہمی سے دماغ کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ تنفر کے سبب سانس پھولنے لگا تھا۔ وہ اسے اس قدر اشتعال انگیز روپ میں دیکھ کر گردن نفی میں ہلانے لگی۔

’’نہیں سہہ سکے نا... کہا تھا ناں تم برداشت نہیں کر پاؤ گے۔‘‘ بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی مشعال کے ہونٹوں پر۔ شاہ زر نے بمشکل اپنا ہوا میں معلق ہاتھ روکا۔

’’تم... تم...‘‘ وہ صرف یہی کہہ سکا تھا۔ مشعال بے اختیار ہنستی چلی گئی۔ جیسے شاہ زر کی حالت اسے لطف اندوز کر گئی ہو۔ جسم پر موجود سلگتے' جلاتے' تڑپاتے نشان یک دم مٹنے لگے ہوں۔

’’اس قدر غصے میں آنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تمہارے اندر یہ سب خامیاں ہیں تو کہہ رہی ہوں۔ کسی پر جان بوجھ کر الزام تراشی کرنا' میری عادت نہیں۔ وہی کہتی ہوں جو سچ ہوتا ہے۔ تم نے مطلب پوچھا تھا اور میں نے بتا دیا لیکن شاہ زر! تم ان سب بے ضمیر کمینوں سے بڑھ کر کمینے ہو۔ انتہائی گھٹیا' نیچ اور شیطان صفت انسان ہو۔ گوشت خور جانور سے بڑھ کر بدتر ہو اور تم تو انسانیت کے...‘‘

آج اسے موقع ملا تھا بولنے کا۔ اپنی نفرت شاہ زر پر انڈیلنے کا۔ شاہ زر کی بے بسی اسے ہمت دلا رہی تھی وہ دل کی ساری کدورت، ساری نفرت و بے قراری نکال دینا چاہتی تھی لیکن شاہ زر نے اسے درمیان میں ہی روک دیا تھا۔

بس... بہت کر لی تم نے اپنی بکواس۔ اب زبان ہلائی تو گدی سے کھینچ کر ہاتھ میں پکڑا ’ ’ دوں گا۔" سفاکیت سے کہتے ہوئے اس نے آخر کار ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ ڈال کی طرح نرم و نازک و لچک دار وجود اس کی سفاک گرفت میں پھڑ پھڑا بھی نہیں سکا تھا۔ وہ واقعی چپ ہو گئی تھی۔ شاہ زر جیسا شخص اپنی برائیاں نہیں سن سکتا تھا جبکہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھ کر بلا خوفی سے سب کہہ رہی تھی وہ بھلا کیونکر سن سکتا تھا۔ اس ایک عورت کے منہ سے یہ سب سننا اس کی مردانگی پر ایک گہرا تازیانہ تھا جسے وہ ہمیشہ اپنے زیر بار دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی مٹھی میں بند تڑپتا ہوا۔ بلکتا ہوا۔ سسک سسک کر رحم کی بھیک مانگتا ہوا۔

میں حیران تھی شاہ زر! تم نے ایک رات مجھے کیسے سکون سے سونے دیا اور وہ ایک ’ ’ رات تمہیں برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ تم آئینے میں اپنی اصل صورت بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔" وہ اس کے شکنجے میں گرفتار دل ہی دل میں ہنس اور رو رہی تھی۔

رات پوری سفاکی کے ساتھ آ کر گزر بھی گئی۔ وہ دن چڑھے تک عالم بے خودی میں پڑی رہی۔ جب کافی دیر بعد آنکھ کھلی تو شاہ زر تیار ہو رہا تھا۔

وہ لیٹے لیٹے ہی اس کی تیاری کا جائزہ لینے لگی۔ شلوار قمیض میں وہ اس وقت بھی ایک ظالم و جابر جاگیر دار ہی دکھائی دے رہا تھا یا پھر اس کی اپنی ہی نظر کا دھوکا تھا۔ وہ اپنے بکھرے سلکی آبشار ایسے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دے کر بستر سے اتر گئی۔ شاہ رز نے اسے ایک لحظہ کو بستر سے اترتے دیکھا اور پھر اپنی تیاری میں مگن ہو گیا۔ وہ.برش کر کے ہاتھ منہ دھو کر واپس آئی تو وہ بستر پر بیٹھا شوز پہن رہا تھا۔

’’بس جا رہا ہوں لیکن پھر یاد دہانی کروائے دیتا ہوں مسز شاہ زر! مجھے تمہاری شکایت نہ ملے اور بلاوجہ حویلی سے باہر مت جانا۔‘‘ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتے کہہ رہا تھا۔ وہ نفرت سے سر جھٹکتے ڈریسنگ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ برش لے کر اپنے بالوں میں پھیرنے لگی۔

’’تم ایک کام کرتے جائو۔ ویسے تو میں تمہاری بات بالکل نہیں مانوں گی۔ تم لوہے کا ایک پنجرہ بنوائو اور مجھے اس میں قید کر دو تاکہ تمہاری یہ کمینوں والی مردانگی بھی سلامت رہے اور تمہاری نام نہاد مردانہ انا کو بھی تسکین ملتی رہے جبکہ میرے اس حویلی میں آزاد پھرنے سے تمہارے یہ دونوں کام نہیں ہوں گے۔‘‘ بے حد تلملاتی نفرت سے جواب ملا تھا۔ وہ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے اس کے عقب میں آ گیا۔ دونوں ہاتھ دائیں بائیں سے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر وہ اس پر جھک گیا۔

’’بہت خوب ڈیئر مسز! پھر تو میرا یہ کمرہ بھی کسی پنجرے سے کم نہیں۔ کیا لگژری شاندار آرام دہ پنجرہ ہے۔ یقینا تم یہاں بہت خوش رہو گی۔ اس قدر پر سکون ماڈرن آسائشوں

سے مزین قید خانہ تو جیلوں میں بھی نہیں ملتا۔" وہ کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہونٹ سکیڑتے کہہ رہا تھا۔ زہریلی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر ناچ رہی تھی۔ بڑا دل جلا دینے والا انداز تھا۔ وہ سلگتی رہی۔ اس کے اس طنز پر۔ کچھ کہنے سے پھر بھی اجتناب برتا۔ وہ کیا کر لیتی اس مرد کا سوائے کڑھنے اور اپنا خون جلانے کے اس کے پاس فی الحال کوئی حل نہیں تھا۔

اچھا میں جا رہا ہوں۔ تم نیک اچھی بیویوں کی طرح فی امان اللہ نہیں کہو گی؟" وہ سفر پر ’ ’ نکلنے والا تھا لیکن جاتے جاتے بھی اسے اذیت دینے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے نظر اٹھا کر اس بھرپور توانا مرد کو دیکھنے لگی۔

میں نیک اور اچھی بیوی کے زمرے میں نہیں آتی اور کیا گارنٹی ہے تم میرے فی امان ’ ’ اللہ کہنے سے بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے۔" عجیب سے انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

اچھا میں جا رہا ہوں۔ تم نیک اچھی بیویوں کی طرح فی امان اللہ نہیں کہو گی؟" وہ سفر پر ’ ’ نکلنے والا تھا لیکن جاتے جاتے بھی اسے اذیت دینے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے نظر اٹھا کر اس بھرپور توانا مرد کو دیکھنے لگی۔

میں نیک اور اچھی بیوی کے زمرے میں نہیں آتی اور کیا گارنٹی ہے تم میرے فی امان ’ ’ اللہ کہنے سے بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے۔" عجیب سے انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

’’تم کہہ کر تو دیکھو شاید پہنچ ہی جائوں، بشر طیکہ پورے خلوص سے کہو۔‘‘ وہ اسے زچ کر رہا تھا۔ اس نے چہرے کا رخ انتہائی غصے سے موڑ لیا تو اس نے فوراً اپنی طرف دوبارہ گھما لیا۔

’’تم واقعی قدرت کا حسین شاہکار ہو، حسن کا مجسمہ، نزاکت کا پیکر لیکن تمہارا چہرہ...‘‘

مشعال کی سانسیں اٹکنے لگیں، حیران ہو کر پھیلی پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ دل مزید کچھ سننے کا منتظر تھا۔ بہت بے چینی سے وہ اسے دیکھ رہی تھی لیکن وہ ایک دم ہونٹوں کو بھینچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ چہرے پر رقصاں زہریلی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ دیکھ رہا تھا۔ سیدھا اس کی آنکھوں میں۔ وہ مزید بے چین ہو گئی۔ وہ ہمیشہ ایسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ ہمیشہ یہی انداز اپناتا تھا لیکن آج وہ اس کی آنکھوں کی بہت سی چمک برداشت نہیں کر سکی تھی جس کی آنکھوں میں ہمیشہ آنکھیں گاڑھ کر بات کی تھی۔ مگر آج کچھ خاص تھا ان آنکھوں میں۔ وہ چہرے کا رخ ایک دم بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ دست و نگاہ کی پر تپش حدت و چاہ یا طلب کچھ خاص تھی آج۔ لیکن کیا تھی وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

لیکن اگلا پل دونوں کے لئے بہت حیرت انگیز تھا۔ جب شاہ رزا چانک جھکا تھا اس کے ہاتھ کی پشت پر اس نے اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے۔ یہ جسارت بھی کچھ خاص معنی لئے ہوئے تھی۔ کچھ نئی اور الگ سی تھی۔ وہ ساکت آنکھوں سمیت اسے دیکھنے لگی جو اس کی طرف دیکھنے کی بجائے اس کے ہاتھ کی پشت کو گھور رہا تھا۔ نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔

شاہو۔“ اس کے لب ہلکی سی پکار کے ساتھ نیم وا ہوئے اور پھر ایک دوسرے میں مدغم ہوگئے۔ شاہ زر نے اس پکار پر اس کے ہاتھ کی بجائے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ پھر مسکرا دیا۔ اس دفعہ مسکراہٹ بھی زہریلی نہیں تھی کچھ خاص تھی۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اس کے رخسار کو چھو کر باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ اس خاص تاثر کو اپنے پیچھے چھوڑتا وہ حیران تھی۔ وہ کئی لمحے اپنے ہاتھ کی پشت کو اور کبھی ہلتے پردے کو دیکھتی رہی۔ ایک عجیب سا لمس تھا جو اسے شاہ زر کی قربت میں محسوس ہوا تھا۔

یہ وہی لمس تھا جو اسے پندرہ سالوں سے سخت بے چین کر رہا تھا۔ جسے وہ ادھر ادھر ڈھونڈ رہی تھی اور وہ اس وقت اسی لمس کے گھیراؤ میں گھری حیران و ششدر تھی۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز پر وہ بھاگ کر کھڑکی کے پاس آئی۔ پردہ ہٹا کر دیکھا تو پورٹیکو میں موجود گاڑی میں وہ بیٹھ رہا تھا۔ ارد گرد سب لوگ جمع تھے۔ ایک نظر ڈال کر وہ پردہ گرا کر واپس بستر پر گئی۔

مسٹر شاہ زر جہانزیب! میرے ایک فی امان اللہ کہہ دینے سے تم بچ تو نہیں جاؤ گے میں بے وقوف نہیں ہوں۔ ابھی میرے بہت سے حساب ہیں جو تمہاری جانب نکلتے ہیں۔ “زبردستی فی امان اللہ کہلوا کر تم بری الذمہ تو نہیں ہو جاؤ گے۔

کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے وہ اسے مخاطب تھی پھر ارد گرد کا جائزہ لیتے اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑی تو شاہ زر کا موبائل نظر آیا۔ وہ شاید یہیں بھول گیا تھا۔ ساتھ میں والٹ بھی

تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے تھام لیا۔ والٹ میں اچھی خاصی رقم کے علاوہ چند وزیٹنگ کارڈز بھی تھے۔ ایک فون بک تھی جس پر کافی سارے نمبرز درج تھے۔ والٹ واپس رکھ اس نے موبائل تھام لیا۔ ساتھ میں کارڈ بھی تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں جولف کا خیال آگیا۔ پاکستان آنے کے بعد وہ اسے صرف تین دفعہ کال کر پائی تھی۔ بعد میں وہ شادی کے سلسلے میں الجھ کر اسے کال کرنا بھول گئی تھی۔ اس وقت یہ موبائل بہت غنیمت لگا۔ جولف کا خیال آتے ہی وہ اس کے نمبر زپُش کرنے لگی۔ تقریباً پندرہ منٹ تک اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے جولف کو یہاں پاکستان میں پیش آنے والی ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ سب سن کر بہت دکھی ہوا اور پریشان بھی پھر اسے تسلیاں دیتا رہا۔

جولف سے بات کرنے کے بعد وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اسے اس کی طرف سے فکر مندی تھی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ ابھی تک باقاعدگی سے اسلامی تبلیغی سینٹر جا رہا تھا۔

وہ اس کی طرف سے بالکل پرسکون ہو کر بستر پر لیٹ گئی۔ پچھلے آٹھ دس دنوں سے وہ شاہ زر کی وجہ سے ٹھیک سے سو نہیں پا رہی تھی۔ سوائے ایک رات کے۔ عجیب الجھی الجھی سی تھکن سے بھرپور اور ڈراؤنی نیند ہوتی تھی۔ اس وقت تو اس کے سر پر شاہ زر جیسا آسیب مسلط تھا اور نہ ہی کوئی بھیانک سوچ۔ سو لیٹتے ہی دوبارہ نیند نے اس پر غلبہ پا لیا۔

☆...☆...☆...☆...☆...☆...☆

اس نے سائیڈ کی پاکٹ بھی چیک کی تو اس کو بھی خالی پا کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ والٹ اور اپنا موبائل کمرے میں ہی بھول آیا ہے۔ موبائل کے بغیر تو اس کا گزارا ہو جاتا لیکن والٹ کے بغیر مشکل تھا۔ اس نے استعمال کی ساری رقم والٹ میں رکھ دی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے پیچھے بیٹھی اماں کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے تھیں۔ اس نے بیک ٹرن کر کے گاڑی واپس موڑ لی۔ اس نے تیزی سے حویلی تک کا فاصلہ طے کیا تھا۔ حویلی کے مین گیٹ پر پہنچتے ہی اس نے گاڑی وہیں کھڑی کی اور اماں کو آنے کا کہہ کر اندر چلا آیا۔ صحن اور کاریڈور میں کوئی موجود نہ تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

مشعال دوبارہ سوچکی تھی۔ اس نے کمرے میں آ کر ارد گرد دیکھا تو جلد ہی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر موجود والٹ اور موبائل پڑا مل گیا تھا۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر اٹھا لیا۔ پھر واپس پلٹتے بلاارادہ اس کی نظر سوئی ہوئی مشعال کے سراپے پر پڑی تھی۔ وہ بالکل نیند کی وادیوں میں غرق تھی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے وجود سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پایا تھا۔ وہ خود بخود کسی احساس کے زیر اثر اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔

مشعال کے چہرے پر آج بھی وہی تاثر تھا۔ بے ریا روشن چمکتا ہوا اس نے ہاتھ بڑھا کر انگلیوں کی پوروں سے اس کے چہرے کی نرماہٹ کو محسوس کیا۔ چھن چھن کر آتے بہت سے سرکش خیالات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے چلے آئے تھے۔

وہ بچپن سے اس کے نام سے منسوب تھی۔ بڑوں نے یہ کبھی بچوں سے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ہر کوئی جانتا تھا۔ مشعال کو علم ہے یا نہیں وہ بے خبر تھا لیکن وہ اپنے اور اس کے رشتے سے آگاہ تھا۔ مشعال عمر میں اس سے چار پانچ سال چھوٹی تھی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے کزنز ہونے کے ناطے ایک دوسرے سے اچھی خاصی انسیت اور لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ وہ شروع سے ہی کافی سنجیدہ اور حساس تھا اسی لئے اس رشتے کی بدولت اسے ہمیشہ ہی آسودگی ملتی تھی۔ کسی اور طرف دھیان جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سوئی ہوئی عورت ایک کھلی کتاب کی طرح ہوتی ہے۔ اس وقت اسے مشعال بھی کچھ ایسی ہی کھلی کتاب لگ رہی تھی جسے وہ بآسانی پڑھ سکتا تھا۔ وہ مسلسل اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ حویلی سے نکلنے سے پہلے بھی وہ اس کے چہرے کے اس تاثر میں کھو گیا تھا لیکن کسی نازک لمحے کی گرفت میں آئے بغیر وہ خود کو چھڑا لے گیا تھا لیکن اب اسے اپنا یہاں بچ نکلنا مشکل لگ رہا تھا۔ اسے واپس بھی جانا تھا مگر خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ اٹھ کر باہر جاتا۔

مشعال نے کروٹ بدلی تو اس کا سحر بھی ٹوٹا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس سوئے ہوئے وجود کو جھنجوڑ کر اٹھا دے۔ اسے کہے کہ وہ پھر سے پہلے جیسی ہو جائے یا پھر جب وہ سر سے لے کر پائوں تک بدل گئی تھی تو پھر اپنے اس چہرے کو بھی بدل لیتی۔ اسے کیوں وہی رہنے دیا تھا۔ کیوں اس کا چہرہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ابھی بھی اسی طرح معصوم ہے کیوں اسے سوچنے پر اکساتا ہے کہ اس کے اندر اب بھی اس کے بچپن کی مشعال چھپی بیٹھی ہے جسے شاہ رز سے محبت تھی

جو یہاں سے جانے پر ہی بے تحاشا روئی تھی لیکن وہ کہہ نہ پایا اس کے لبوں سے کچھ بھی تو نہیں نکلا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے بھی اس نے ہاتھ لگا کر اس کے چہرے کو ضرور چھوا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے ہاتھ کی پوریں نرم گرم میٹھی سفید سی روشنی سے نہا گئی ہوں۔ اس نے مٹھی بند کر لی۔ وہ اس لمس کو کچھ دیر تک محسوس کرنا چاہتا تھا۔ دروازے پر رُک کر اس نے ایک دفعہ پھر روشنی میں نہایا ہوا وہ روشن و دلکش خوب صورت چہرہ دیکھا تھا پھر فوراً لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔ جس طرح کسی کو اس کے آنے کا علم نہیں ہوا تھا۔ اس طرح کسی نے اس کے جانے پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔ اماں پچھلی سیٹ پر لیٹی اونگ رہی تھیں۔ اس نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

کافی دور آنے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر لی۔ مشعال کا خیال بار بار اس کے ذہن میں آ رہا تھا۔ عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ اس کا دل بن رہا تھا۔ احساسات بھی بڑے عجیب ہو رہے تھے۔ وہ ڈبل مائنڈڈ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر دل میں تکرار کرتے خیالات کو باہر دھکیلنا چاہا مگر ہر کوشش ناکام ہوتی جا رہی تھی جذبات کی شوریدہ سری کے آگے بند باندھنا ناممکن ہو گیا۔ وہ جس عورت کو دیکھ کر آیا تھا اسے سوچنے اور محسوس کرنے کے اس کے پاس سارے اختیارات تھے مگر وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا کچھ بھی تو نہیں۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ کسی نازک لمحے کی زد میں آگیا تو وہ بدل جائے گا۔ اگر اس نے خود کو بدل لیا تو وہ مشعال کے سامنے جھک جائے گا اور وہ مشعال کے سامنے جھکنا نہیں چاہتا تھا جس کا بے پرواسحر اسے چاروں شانے چت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہش... کیا ہو گیا ہے مجھے؟ کیوں گیا تھا میں وہاں؟'' اسے اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ' ' خود پر غصہ آنے لگا۔ اپنے وہاں جانے پر افسوس ہونے لگا۔ اس نے گاڑی میں ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ ساری گاڑی میں گائیک کی آواز گونجنے لگی تھی۔ اس ڈوبتی ابھرتی پر جوش خوب صورت خوش گلو آواز کے جلو میں اس کے دل میں ابھرتا' پیدا ہوتا' ڈوبتا ہر احساس ماند پڑنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے وہ چاندنی سے پُر... روشنی سے مزین' موتیوں کی طرح چمکتا دمکتا' صاف شفاف سورج کی کرنوں کی طرح کانچ سے بنا وہ چہرہ بھی محو ہونے لگا تھا۔ آواز کے ارتعاش نے اس کے دل و دماغ کی ہر سوچ بھی بدل ڈالی تھی وہ جلد نارمل ہو چکا تھا۔

ؤؤؤ

شاہ رز کے چلے جانے کے بعد اس کی روٹین میں بھی فرق پڑا تھا اور مزاج میں بھی۔ البتہ وہ حویلی میں ابیشا کے علاوہ کسی اور سے مخاطب نہیں ہوتی تھی۔ سب نے بہت کوشش کی تھی کہ اسے اپنی طرف متوجہ کر لیں خاص طور پر ماما پاپا نے۔ مگر وہ پلٹ کر دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔

ساری رات پر سکون سونے کے بعد صبح جلد اٹھ جاتی۔ حویلی کے احاطے میں ایکسر سائز کرتی' کبھی کبھار باہر کھیتوں کی جانب نکل جاتی۔ کچن میں جا کر سب کی موجودگی کے باوجود اپنا ناشتہ تیار کرتی اور پھر کمرے میں آ کر کھا لیتی تھی۔ باقی سارا دن وہ ابیشا کے ساتھ باتیں کرتے اور کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹی وی دیکھنے میں گزار دیتی۔ اس کے لباس میں صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ جو شاہ رز کی موجودگی میں وہ شلوار قمیض اور دوپٹہ اوڑھنے لگی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں وہی شرٹس' جینز اور ٹراؤزرز کا استعمال کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی ابیشا کے ساتھ شام کے وقت ہوا خوری کے لئے باہر بھی چلی جاتی تھی۔ شاہ رز کا کتنی دفعہ فون آ چکا تھا وہ قصداً ہر بار نظر انداز کر جاتی تھی۔ سب نے اسے بات کرنے کو کہا تھا لیکن اس نے بات کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔

آج کل وہ سارا سارا دن سب کے رویوں سے تنگ آ کر کمرے میں ہی دروازہ لاک کر کے رہنے لگی تھی۔ سب ہی اس کے رویے سے اچھے خاصے تنگ آ چکے تھے۔

اس وقت بھی صبح سے شام ہو چلی تھی سوائے صبح وہ ایکسر سائز کرنے کے بعد کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ابیشا اسے دوپہر کا کھانا اس کے کمرے میں دے گئی تھی۔ کمرے میں بیٹھی پویٹری کی ایک ہاتھ میں لئے کتاب میں مگن تھی۔ جب ماما کمرے میں داخل ہوئیں بستر پر لیٹے لیٹے ایک نظر اٹھا کر پویٹری کو دیکھا اور پھر مصروف ہو گئی۔

مشعال۔“ اس کے پاس بستر پر بیٹھ کر انہوں نے پکارا۔ وہ سن کر یکسر ان جان بن ’ ’ گئی۔ بدستور اپنا کام جاری رکھا۔

مشعال میں تم سے مخاطب ہوں۔“ انہوں نے اس کا کندھا جھنجوڑا۔ ’ ’

کیا مصیبت ہے آپ کو” مخاطب ہیں تو میں کیا کروں۔ کتنی دفعہ کہا ہے کہ میں آپ ’ ’ لوگوں کو نہیں جانتی میں آپ کی کچھ نہیں لگتی۔ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ حیرت ہے پھر بھی آپ چلی آئیں۔ میں ہر وقت تنگ کرنے ’زندگی عذاب کردی ہے آپ نے تو...“ وہ ابھی تک پتھر تھی ’غصے سے پھٹ پڑی۔ ماما سن کر رونے لگیں۔

کتنی کھٹور ’سنگدل ہوگئی ہو تم مشعال! میں ماں ہوں تمہاری۔ تمہیں جنم دیا ہے میں ’ ’
“نے اب یوں تو نہ کرو۔

اچھا...ویری اسٹرینج۔ نئی خبر ہے میرے لئے’ مجھے بھی کسی نے جنم دیا ہے مگر مجھے تو ’ ’ وہ کمینہ انسان کہہ رہا تھا کہ میں آسمان سے ٹپک گئی تھی یا پھر زمین سے اگ آئی تھی۔ لیکن یہاں تو بات ہی نرالی ہے مجھے بھی کوئی جنم دینے والی ماں ہے۔“ وہ کتاب رکھ کر انہیں استہزائیہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ماما کا دل اس کی بات پر کٹ سا گیا۔

پتا نہیں کون ہیں آپ لوگ۔ میرے تو ماں باپ مرگئے ہیں۔ آپ کو نہیں علم؟ آپ ’ ’ شاید نہیں جانتیں؟ مہینہ ہوگیا ہے انہیں مرے ہوئے۔ آج سے پورا مہینہ پہلے جب میں نے اس اونچی اونچی دیواروں والی حویلی سے بھاگنے کی کوشش کی تھی ناں تو مجھے پتا چلا کہ میرے

والدین مر گئے ہیں۔ یقین کریں' میں سچ کہہ رہی ہوں ایک مہینہ پہلے میں انہیں اچھی طرح رو چکی ہوں۔ آپ کو بتاؤں انہوں نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ اور میں انہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی اور آپ... کون ہیں آپ؟ میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اپنے ماں باپ ‘ ‘ کے چہرے تک بھول گئے ہیں۔

وہ سپاٹ چہرے اور عجیب لہجے میں کہتی خود سے بولتی خود اذیتی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ آنکھیں بھی تو یوں سپاٹ تھیں جیسے واقعی اس کا ان سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ بہت عرصے بعد اس نے ان سے اتنا کچھ کہا تھا نہیں تو وہ انہیں دیکھتے ہی تنفر سے منہ موڑ لیتی تھی۔ ماما اس کی باتوں پر اور شدت سے رو دیں۔ وہ ان کے یوں زار و قطار رونے پر خود سے الجھ گئی۔ کتاب زور سے بستر پر پھینک کر کھڑی ہو گئی۔

خدا کے لئے آپ لوگ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ سکون سے جی لینے دیں۔ آپ میرے ’ ’ لئے اور میں آپ کے لئے اسی دن مر گئی تھی جس دن میں نے اس ذلیل انسان کے منہ سے آپ کے کہے گئے الفاظ سنے تھے۔ بھلا تو میں نے آپ کو اسی دن دیا تھا جب آپ نے ہر تعلق بھلا کر مجھے اپنے ہاتھوں سے اس جنگلی درندہ صفت انسان کے سپرد کیا تھا۔ اب میرا آپ لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ برباد تو کر کے رکھ دیا ہے مجھے مزید کیا چاہتے ہیں۔ دل میں کوئی اور حسرت رہ گئی ہو گی' اب وہ پوری کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ وہ پوری کیسے کریں گے مر تو میں گئی ہوں اندر سے تو میں پہلے ہی ختم ہو گئی ہوں۔ کیا فرق پڑتا ہے مشعال اگر کھاتی ہے‘

چلتی ہے' پھرتی ہے' سوتی ہے کوئی فرق نہیں پڑتا مسز شاہ کمال! یہاں بیٹیاں یوں ہی درگور ہوتی ہیں جسم کے قاتل کو تو پھانسی مل جاتی ہے۔ روح کے قاتل کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ میں پہلے بھی اس گائوں کے وحشی لوگوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھی تھی۔ اب بھی ایک وحشی بہت زعم اور استحقانہ حق لئے مجھے روزانہ ادھیڑتا ہے۔ اب کیا لینے آئی ہیں آپ؟ دیکھیں مشعال برباد ہو چکی ہے۔" وہ دونوں ہاتھ ماما کی طرف پھیلا کر کہہ رہی تھی۔ ماما نے ایک دم سے اسے دیکھا۔

"مشعال! تمہارے پاپا کو بہت تیز بخار ہے۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے ایک دفعہ چل کر انہیں دیکھ لو وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" اس کے اتنے سخت لہجے پر بھی وہ بہت امید بھری نظروں سے منتظر تھیں وہ رخ موڑ کر کھڑی رہی۔

"مشعال چلو!" ماما نے اس کا بازو تھامنا چاہا تو وہ ایک دم بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔

"ہرگز نہیں۔ جا کر کہہ دیں انہیں' میرا انتظار نہ کریں کوئی تعلق نہیں میرا ان سے۔ انہوں نے اپنی مشعال کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے۔ بیٹیاں باعث شرم ہوتی ہیں۔ انہیں اس بات پر دکھ ہے کہ انہوں نے مجھے میرے پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کیوں نہ کر دیا تھا۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ پیدا ہوتے نہ سہی پچیس سال بعد انہوں نے زندہ درگور کر دیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے مار دیا ہے اور لاشیں کبھی کسی کی عیادت کو نہیں آیا کرتیں۔ ماما! میں پاپا کی عزت و ناموس کو دو ٹکے کا کرنے چلی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنی خاندانی روایتوں سے

رو گردانی کے جرم میں قتل کر دیا ہے۔ میں اسی قابل تھی پہلے لوگوں نے میرے جسم کو قتل کیا۔ بعد میں میرے باپ نے میری روح کو۔ رہی سہی کسر ان کا نام نہاد داماد پوری کر رہا ہے۔ میری سزا تو گولی تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے مجھے مرنے کب دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے قتل کرنے کے لئے سزا کے طور پر شاہ رز کو منتخب کیا۔" پہلی دفعہ اس کے منہ سے شاہ رز کا نام نکلا تھا نہیں تو وہ اس کے القابات پر جز بز تھی۔ "کاش وہ مجھے حویلی کی دہلیز پار کرنے کے جرم میں گولی سے اڑا دیتے۔ میرے جسم سے جان نکال لیتے تو اس وقت نہ میں روز جیتی نہ روز مرتی۔ انہیں جا کر اس گائوں اور اس حویلی کے منتخب کئے گئے قانون بہت سخت ہوتے ہیں، ایک قانون پر عمل کر کے انہوں نے فیصلہ کیا اور مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین میں زندہ دفن کر دیا۔ نہ مرنے کے لئے نہ جینے کے لئے اور دوسرا فیصلہ مشعال کرتی ہے جو ان کی ہی بیٹی ہے اس کی رگوں بیں اسی خاندان کا خون دوڑتا ہے۔ میں ان کے پاس نہیں آئوں گی۔ مر گئی میں ان کے لئے۔" ماما اسے یوں بکھرے بکھرے لب و لہجے اور انداز میں کہتے دیکھ کر آگے بڑھی تو اس نے اتنے ہی قدم پیچھے ہٹا لئے۔

نہیں... جائیں ماما! شاہ کمال کی جس بیٹی کا نام مشعال تھا وہ مر گئی ہے۔ وہ زندہ نہیں ’ ’ ہے۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے شاہ رز کے لئے نکاح نامے پر دستخط کرنے سے پہلے دفنا دیا تھا۔ اس وقت جو زندہ ہے وہ مسز شاہ رز جہانزیب ہے۔ مان لیں جو مر جاتے ہیں وہ کبھی

زندہ نہیں ہوتے اور یہی بات جا کر شاہ کمال صاحب کو بھی سمجھا دیں۔" اس نے واقعی اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔

ماما کافی دیر تک اسے دیکھتی رہیں پھر جس طرح خاموشی سے آئی تھیں اسی طرح خاموشی سے نامراد چلی گئیں۔ جاتے وقت ان کی آنکھیں آنسوئوں سے بہہ رہی تھیں۔

وہ دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔ کتنی دیر گم صم انداز میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھی رہی۔

بے حس و حرکت

گم، صم چپ چاپ حتیٰ کہ آنکھیں لبالب نمکین پانیوں سے بھرتی چلی گئیں۔

ماما! دیکھیں کیا کر دیا آپ نے۔ مجھے تباہ کرنے میں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں تو سمجھی تھی ماں تو بس ماں ہوتی ہے پھر آپ کیسی ماں تھیں؟ خود اپنی بیٹی کی خوشیوں کو نگل لیا۔

ماما! میں ہار گئی۔ اس شخص کے سامنے صرف اور صرف آپ اور پاپا کی وجہ سے میں نے جو اتنے دن اس کا وحشیانہ ظلم سہا ہے کاش آپ کو اپنا زخم زخم وجود دکھا سکتی۔ کاش ماما! آپ دیکھتیں شرافت کے لبادے میں لپٹا یہ شیطان اندر سے کس قدر گھٹیا اور وحشی ہے۔ آپ کو حقیقت کا پتہ چل جاتا تو یوں روتے ہوئے نہ جاتیں۔ آپ نے تو ماما! مجھ سے میری ذات کا اعتماد تک چھین لیا ہے۔ تنکوں سے زیادہ ہلکی ہو گئی ہوں میں نہیں تو یہی شخص تھا جس سے بات کیا، میں

دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی اور اب آنکھیں بند کرتی ہوں تو سوائے اس کے سلوک کے کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ آنکھیں بند کر کے وہ رونے لگی۔

ماما! کوئی یوں بھی کرتا ہے اپنی بیٹیوں کے ساتھ۔ میں بری نہیں تھی آپ نے مجھے سمجھا نہیں۔ میری ذات آپ لوگوں سے علیحدہ تو نہیں تھی پھر کیوں مجھے گلے سڑے عضو کی مانند کاٹ کر پھینک دیا۔ میں بد تہذیب اور بد تمیز نہیں تھی آپ سب نے مل کر کر دیا۔ آپ نے کیوں کیا یہ سب کچھ؟ کیوں کیا ماما؟ میں تو آپ کی اپنی سگی بیٹی تھی یوں رسوا تو نہ کرتیں۔" کتنی دیر تک وہ سسکتی روتی رہی تھی جب دل کا غبار ذرا ہلکا ہوا تو دوبارہ کتاب کھول لی۔

٭٭٭

اگلے چند دنوں میں پاپا کا بخار مزید تیز ہو گیا تھا۔ اسے ابیشا سے ساری خبر مل جاتی تھی اب تو اس نے صبح بھی کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے اب حویلی کے ہر مکین سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

وہ تہمینہ اور زرینہ کے گھر گئی تھی۔ وہ دونوں بہنیں میکے آئیں تو اس سے حویلی میں ملنے آئی تھیں مگر جب وہ ان کے گھر گئی تو سب نے اسے منع کیا تھا برا مانا تھا لیکن وہ سرکشی پر آمادہ تھی۔ سب کے منع کرنے کے باوجود وہ وہاں ساری دوپہر گزار کر جیسے ہی شام چار کے قریب حویلی واپس آئی تو اس کے پاس ابیشا آ گئی۔

پلیز مشعال آپی ! میرے ساتھ چلیں، پاپا کی طبیعت بہت خراب ہے انہیں بہت تیز ’ ’ بخار ہے۔ ان پر غنودگی طاری ہو گئی ہے، وہ بار بار آپ کو بلا رہے ہیں، صرف ایک دفعہ چلی چلیں، بے شک ایک دو منٹ رک کر واپس آ جائیں۔ صرف ایک دفعہ۔” وہ منت کر رہی تھی۔ ابیشا کے مقابلے میں وہ خود کو ہمیشہ کافی بے بس محسوس کرتی تھی۔ اب بھی ہارنے لگی۔ سو اثبات میں گردن ہلا دی اور چپ چاپ اس کے ہمراہ چل دی۔

جب وہ ان کے کمرے میں پہنچی ارد گرد ماما، چچی زینب، بڑی امی، بھابی سب ہی موجود تھیں۔ ماما اسے دیکھ کر پاپا کو جگانے لگیں جو آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔

کمال ! دیکھیں مشعال آئی ہے۔” ماما کی پکار پر انہوں نے فوراً آنکھیں کھول کر دیکھا جو ’ ’ ان کے بستر سے تھوڑا فاصلے پر کھڑی تھی۔

کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟” وہ نپے تلے انداز میں کھڑے کھڑے پوچھنے لگی۔ پاپا ’ ’ کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ کتنے صدیوں کے سے فاصلے درمیان میں در آئے تھے۔

ٹھیک ہوں اب۔” بہت نحیف آواز میں وہ بولے تھے جبکہ ابیشا ان کے سرہانے بیٹھ ’ ’ کر ان کا سر دبانے لگی وہ یونہی کھڑی رہی۔ آ تو گئی تھی اب سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے۔

مشی ! کھڑی کیوں ہو بیٹھو۔” شگفتہ بھابی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے کرسی فراہم کی ’ ’ تو وہ نفی میں گردن ہلا کر بدستور کھڑی رہی۔ پھر ماما سے پاپا کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے

لگی۔ وہ اسے ان کی طبیعت کے بابت تفصیل سے بتانے لگیں۔ مزید چند منٹ رک کر وہ وہاں سے آ گئی تھی۔

اگلے دو دنوں میں ان کی طبیعت مزید بگڑ گئی تو آرز بھیا انہیں گاؤں سے باہر قریبی اسپتال میں لے گئے وہ خود تو اسپتال نہیں گئی تھی مگر ابیشا سے ان کی طبیعت کے متعلق دریافت کرتی رہی وہ وہاں تین دن ایڈمٹ رہے تھے۔ دوائی اچھی تھی۔ برابر ٹریٹمنٹ مل رہا تھا سو چند دنوں میں ہی انہیں کافی افاقہ ہوا تھا۔ گھر واپس آئے تو وہ ان کی عیادت کو جاتی رہی۔ ان سے وہ اب بھی نہیں بولتی تھی۔ بس کھڑے کھڑے طبیعت پوچھ لیتی تھی اور ان کے لئے یہی بہت تھا کہ وہ کسی بات پر آمادہ تو ہوئی۔

صبح وہ اپنے مقررہ وقت پر اٹھی تھی۔ رات وہ شاہ زر والے کمرے میں سونے کی بجائے ابیشا کے ساتھ باتیں کرتے کرتے اسی کے کمرے میں ہی سو گئی تھی۔ اب اٹھنے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر پہلے کچن میں جا کر اپنے لئے ایپل جوس بنایا۔ رات کو وہ کھانا کھائے بغیر ہی سو گئی تھی۔ اس وقت بھوک لگی ہوئی تھی۔ جوس جگ میں بھر کر گلاس لے کر وہ حویلی کے دائیں احاطے میں چلی آئی۔ جگ اور گلاس ٹیبل پر رکھ کر وہ ایکسرسائز میں مشغول ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تھک کر لان کے ایک گوشے میں بیٹھ گئی۔

گھٹنوں میں سر دیئے بغیر کچھ سوچے وہ کافی دیر تک ٹھنڈی گھاس پر بیٹھی رہی۔ کچھ وقت سرکنے کے بعد اچانک اسے احساس ہوا کہ یہاں اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔

کوئی ملازمہ ہو گی۔" آنکھیں بند کئے لمبے لمبے سانس لیتے اس نے اپنے خیال کی تردید ’ ’ کی۔

اے! اب بس بھی کرو۔" کسی نے اس کا کندھا چھو کر کہا۔ یہ آواز "اے" کہہ کر ’ ’ مخاطب کرنے کا مخصوص انداز صرف شاہ رز کا ہی تھا۔ خیال آتے ہی وہ جھٹ آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ واقعی شاہ رز ہی تھا۔ اس کے برابر گھاس پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب گھاس پر وہی جگ اور ہاتھ میں وہی گلاس پکڑا ہوا تھا جو وہ لے کر آئی تھی اور وہ گھونٹ گھونٹ ایپل جوس پی رہا تھا۔ حویلی میں اس کی موجودگی پر اسے جھٹکا لگا۔

صبح بخیر۔" مشعال کی حیران کن آنکھوں میں دیکھ کر وہ دلکشی سے مسکرایا۔ وہ ناسمجھی ’ ’ میں سر ہلا کر اٹھ گئی۔ ٹیبل کے قریب آ کر کرسی پر دھرا ٹاول اٹھا کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔

لو یہ پیو اور جان بناؤ۔" وہ گلاس بھر کر پیچھے ہی چلا گیا۔ وہ بغیر کچھ کہے خاموشی سے ’ ’ گلاس تھام کر پینے لگی۔ ساتھ میں کن اکھیوں سے اسے دیکھا جو کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ ہلکی بادامی کلر کی ٹی شرٹ پہنے ٹرائزر میں کافی سلجھا تاثر دے رہا تھا۔ شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی تھیں۔ گریبان کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ سلوٹوں والی شرٹ اور بکھرے بالوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے سلجھا رہا تھا۔ آنکھوں کے ڈوروں سے نیند کا خمار چھلک رہا تھا۔

کرسی پر براجمان ہو کر اس نے اپنی تمام تر توجہ مشعال کو دیکھنے میں لگادی تھی۔ اس کی بے باک نظریں خود پر محسوس کر کے وہ بے چین ہونے لگی۔ اس کی انہی نظروں سے اسے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی۔

''کب آئے تم؟'' اس کی خود پر سے توجہ ہٹانے کو اس نے بادل نخواستہ پوچھ لیا۔

''رات دو کے قریب حویلی پہنچا تھا۔ چچا جان کی ناساز طبیعت کا علم ہوا تو عیادت کو چلا آیا۔'' ان میں ایسا کوئی تعلق نہ تھا کہ وہ بنیاد بنا کر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتی۔ اس کی بات سن کر خاموش رہی۔ اس کی بلا سے وہ آئے یا جائے۔ خاموشی سے خالی جگ اور گلاس تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سنو! تیار ہو جاؤ اور پیکنگ کر لو۔ ہم دونوں کو آج نو دس کے قریب واپسی کے لئے نکلنا ہے۔'' اسے جاتے دیکھ کر وہ بھی ساتھ ہو لیا۔ ساتھ ساتھ چلتے وہ بتا رہا تھا وہ سن کر ایک دم رک گئی۔ شاہ رز کے چہرے کی طرف دیکھا وہاں سنجیدگی رقم تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' شاہ رز کی ''ہم دونوں'' والی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ دوبارہ چلتے چلتے پوچھنے لگی۔

''بہت صاف اور واضح مطلب... یعنی میں اور تم شہر جا رہے ہیں۔'' کچن کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک لمحہ کو شاہ رز کے چہرے کو دیکھا پھر اندر قدم بڑھا دیئے۔

صرف تم... میں کہیں نہیں جا رہی۔” صاف ٹھوس الفاظ میں انکار کر کے وہاں کچن میں ’ ’ موجود کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر جگ اور گلاس سنک میں رکھ کر وہ ابیشا کے کمرے میں آ گئی۔ وہ پیچھے کھڑا بس گھورتا ہی رہا۔

یہ خود کو سمجھتا کیا ہے؟ سکون سے جینے بھی نہیں دیتا اور مرنے بھی۔ میں اس کے ’ ’ ساتھ کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔ بتا دینا اس حاکم کو۔” کمرے میں آ کر اپنا سارا غصہ ابیشا پر نکالا وہ ساری صورتحال سے یکسر لاعلم تھی۔ حیران ہو کر مشعال کے سرخ چہرے کو دیکھا۔

کسے بتا دوں؟” وہ مشعال سے پوچھنے لگی۔ ’ ’

شاہ رز کو اور کون ہے۔ کتنے آرام سے کمینہ کہہ رہا تھا کہ دونوں کو نو دس کے قریب ’ ’ واپسی کے لئے نکلنا ہے۔” وہ اس کی نقل اتار کے بتانے لگی۔ ابیشا کے چہرے پر اسے “کمینہ” کہنے سے مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ مشعال نے اسے مسکراتے گھورا تو وہ بروقت تمام اپنی مسکراہٹ چھپانے لگی۔

شاہ بھائی آئے ہیں؟” اس کی طرح وہ بھی اس کی آمد سے لاعلم تھی اسنے پوچھنے پر ’ ’ سر ہلا دیا۔

اچھا... ٹھہریں پھر میں مل کر آتی ہوں۔” وہ جانے کے لئے تیزی سے دروازے کی ’ ’ طرف لپکی تو اس نے اسے روک دیا۔

کوئی ضرورت نہیں اس جھگڑالو کو سر آنکھوں پر بٹھانے کی۔ میرا بس چلے تو اس دھانسو کو گولی مار دوں۔" وہ واقعی سخت غصے میں ٹہل رہی تھی۔

ابیشا سمجھ کر رک گئی۔ وہ کسی ایک کی حمایت کر کے کسی دوسرے کی دل شکنی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر شاہ زر غلط تھا تو مشعال بھی غلطی پر تھی۔ وہ کچھ کہنے کی بجائے مشعال کا غصہ کم کرنے لگی۔

شام کو شاہ زر کی طرف سے اسے اس حرکت پر بہت سخت سست کہا گیا تھا۔ وہ ہونٹ سیے سب سنتی رہی۔ وہ جیسے ہی دل کی بھڑاس نکال کر ٹی وی کے سامنے بیٹھا اس نے وہی کل والی روٹین اپنائی۔ وہ جانتی تھی یہ فرار کا وقتی سہارا ہے۔ شاہ زر کو جب بھی اس بات کا علم ہو گا وہ بہت غضبناک ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ سلو پوائزننگ اس کے باخبر ہونے سے پہلے ہی اپنا کام دکھا جائے۔ سو وہ اس وقتی سہارے سے کچھ سکون کے لمحے کشید کرنے پر مجبور تھی۔

بے چارہ شاہ زر! اب کس کو اذیت پہنچا کر تمہیں سکون ملے گا۔" نیند سے بند ہوتی آنکھوں اور بوجھل ہوتے دماغ سے وہ نفرت سے سوچنے لگی۔

اگلے دن دوپہر کے بارہ کے قریب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ آج کل کی نسبت دروازہ وقفے وقفے میں بجتا رہا تھا۔ نیند میں ڈوبی آنکھوں اور سوئے ہوئے ذہن سے اسے یہی محسوس ہوتا تھا۔ کمرے سے باہر جب نکلی تو ڈھیلے ڈھالے سلیپنگ سوٹ میں بغیر دوپٹے کے ایک ہاتھ سے آنکھوں کو مسلتی دوسرے سے بالوں کو سمیٹتی ٹی وی لاؤنج میں داخل ہو گئی۔

اماں ! شاہ زر چلا گیا ہے ؟‘‘ اماں صوفے پر لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی ’ ’ مگر نظریں سامنے پڑیں تو اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

یہ آج آفس نہیں گیا؟‘‘ شاہ زر لاؤنج کی کھڑکی کے قریب کھڑا کسی گہری سوچ میں گُم ’ ’ تھا وہ جو لان میں کھلتی تھی۔ اس نے نظر پھیر کر مشعال کو دیکھا۔

یہ تمہارے اٹھنے کا وقت ہے؟‘‘ وہ کھڑکی چھوڑ کر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ’ ’

وہ نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

اماں گہری نیند میں غرق تھی جبھی ان کی نشست میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ کوئی بھی جواب دیئے بغیر دوبارہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے کمرے میں گھس گئی۔ جان بوجھ کر کافی دیر لگا کر نہا کر اور کپڑے چینج کر کے وہ کمرے سے باہر نکلی تو وہ اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔

سارا گھر دیکھنے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا۔ خواہ مخواہ ٹینشن سر پر سوار رہتی۔

آرام سے اپنے لئے کھانا نکال کر کچن کی ٹیبل پر ہی بیٹھ کر کھانے لگی۔ ابھی اس نے چند لقمے ہی لئے تھے جب شاہ زر بھی کچن میں چلا آیا۔ اس نے تحیر سے اسے دیکھا۔

مجھے بھی کھانا دو۔‘‘ کرسی گھسیٹ کر وہ بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے خاموشی ’ ’ سے حکم کی تعمیل کی تھی۔ کھانا نکال کر ٹیبل پر ہی لے آئی پھر خاموشی سے اس کے سامنے ٹرے رکھ کر خود دوبارہ اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟" کھانا کھاتے اس نے اسے کہتے سنا تھا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر ہاں میں سر ہلا دیا۔ شاہ زر نے لقمہ منہ میں رکھتے اسے بغور دیکھنے لگا۔

چاندنی سے روشن چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ وہی تاثر جس کا وہ اسیر ہو جاتا تھا۔ اس وقت اس کا اس کے چہرے پر کہیں نام و نشان ہی نہیں تھا۔ آنکھوں کے نیچے ہلکے نمایاں تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ خشک پیلے ہونٹ۔ شاہ زر کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا اس کا ہاتھ لقمہ توڑتے رک گیا۔

وہ اب اس سے نظریں ملا کر بات نہیں کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر لمحہ رہنے والی سرکشی کا کہیں وجود نہیں تھا۔ وہ یوں لگ رہی تھی جیسے مہینوں سے بیمار ہو۔ زندہ دل ہشاش بشاش، خوب صورچار منگ خدوخال والی متین سراپے والی اور اٹریکٹیو فیس والی لڑکی کا کہیں پتہ ہی نہیں تھا۔ یہ جو اس کے سامنے بیٹھی تھی یہ کوئی اور ہی مشعال تھی۔

اسے یاد آیا کتنے دن ہو گئے تھے وہ بیمار تھی۔ ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گئی تھی حتیٰ کہ اس نے خود بھی کئی دفعہ کہا تھا اور اماں کے ذریعے بھی کہلوایا تھا لیکن اسے تو جیسے اپنی پرواہ ہی نہیں رہی تھی۔ اس کو اس سمے اس پر ایک خوب صورت پتھر کی دیوی کا گمان ہوا۔ اس کا دل بری طرح لرزنے لگا۔ نہ جانے کیا خیال تھا کہ پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ اس کے چہرے کو محسوس کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا ابھی بھی وہ نرم گرم میٹھی سفید پھوار والی نمی کا متاثر اس

کے چہرے پر. برقرار ہے وہ اسے اپنی انگلیوں سے چھونا چاہتا تھا۔ ایک دم چھو کر محسوس کرنے کی خواہش شدت اختیار کرتی گئی تو وہ بے اختیار اسے پکار بیٹھا۔

’’مشعال!‘‘ وہ اس کی پکار پر سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

بالکل سرد و سپاٹ سی نظریں تھیں۔

وہ جو اک گہری کالی سیاہ سی چمک تھی وہ بھی کہیں دکھائی نہ دی۔

’’تم میرے ساتھ آج ڈاکٹر کے پاس چلنا۔‘‘ اس کے سوالیہ دیکھنے پر اس نے بات بنائی۔

’’کیوں؟‘‘ حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ وجہ التفات جاننا چاہتی تھی۔ وہ ابھی بھی وہی مشعال تھی جس سے اسے گھن آتی تھی۔ جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا اور اب اچانک لہجے میں یہ نرمی۔ اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اسے شاہ زر کا اپنی غرض میں لیٹنا با عزم رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ چند دنوں میں بالکل نہیں بدلی تھی۔ ابھی بھی وہی تھی جس سے اسے نفرت تھی۔ تو پھر یہ پروا کیا معنی رکھتی تھی؟ حیرانگی سے دریافت کرتے ایک سرد پن خود بخود اس کی آواز میں آسمایا تھا۔

تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی مجھے اسی لئے۔" اس نے "کیوں" کی تاویل پیش کی تو ’ ’ وہ یوں ہنسی جیسے کسی چھوٹے بچے نے بڑی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہو۔

کتنے بڑے ایکٹر ہو تم! میں واقعی تمہاری بیمار ذہنیت کو نہیں سمجھ پائی۔ حیرت ہے ’ ’ "کیسی اسٹرینج سائیکی ہے تمہارے۔ زخم دے کر نمک پاشی کرنے والی۔ بہت خوب۔

وہ اندر ہی اندر ہنسی تھی بہت لطف اندوز ہو رہی جیسے شاہ زر نے لطیفہ سنا دیا ہو۔

لیکن میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ منتظر تھا جواب سننے کے لئے آرام سے بولی۔ پھر ’ ’ سر جھکا کر آخری لقمے جلدی جلدی کھانے لگی۔ شاہ زر خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

وہ بالکل بدل گئی تھی۔ اسے ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا چاہئے تھا لیکن وہاں نہ جا کر وہ اندر ہی اندر ختم ہو رہی تھی۔ اسے تشویش سے زیادہ گھبراہٹ ہونے لگی۔ نہ جانے کیوں۔ ابھی وہ پھر غور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تم اگر کہو تو ہم دونوں گاؤں چلتے ہیں۔" پہلے سے زیادہ نرم لہجے میں اس نے دوبارہ ’ ’ پوچھا تو اس دفعہ مشعال پھر حیران ہو گئی۔ کچھ عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ وہی حیرانگی اس کی آنکھوں سے بھی چھلک رہی تھی۔ "کہیں اس کا دماغ تو نہیں گھوم گیا۔" پہلا خیال یہی آیا۔

مسٹر! میں اب بھی وہی ہوں جسے تم نے صرف ہرانے کے لئے اپنے نکاح میں لیا ’ ’ تھا۔ اب یہ ہمدردی یہ نرمی۔ آخر چاہتے کیا ہو۔" نظروں ہی نظروں میں پوچھ رہی تھی۔ پھر ایک دم استہزائیہ ہنسی ہنس دی۔ شاہ زر نظریں چرا گیا تو وہ کچھ کہنے سے خود کو نہ روک پائی۔

وجہ التفات دریافت کرسکتی ہوں؟" وہ پوری طرح اس کو دیکھنے لگی۔ "یہ ہمدردیاں ’ ’ یہ نرمیاں۔ آخر میرے لئے کیوں میں وہی ہوں جس سے تمہیں گھن آتی ہے لیکن اپنی توہین مٹانے کے لئے اسی کے وجود کو چھپاتے ہو۔" اسے نہیں اندازہ تھا کہ وہ یوں.برملا چوٹ کر جائے گی۔ ایک لڑکی ہو کر۔ اس طرح واشگاف الفاظ میں۔

اچانک حملہ ہوا تھا۔ شاہ زر کے پاس کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ پہلے تو تھوڑا سا خائف ہوا پھر چہرہ سرخ ہونے لگا۔ وہ اخذ نہ کرسکی کہ یہ سرخی خجالت کی تھی یا پھر غصے کی جبکہ وہ پوری طرح اس کی طرف سے کسی شدید قسم کے ری ایکشن کی منتظر تھی۔

ملنے کے لئے۔ وہاں گاؤں میں وہ لوگ ہم دونوں کے منتظر ہوں گے۔ پرسوں.بڑی ’ ’ امی کا فون آیا تھا وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ ایک دفعہ آکر ہم دونوں مل جائیں۔" بہت تحمل سے اس نے جواب دیا تھا جبکہ اس نے واشگاف الفاظ میں اس کے کردار پر چوٹ کی تھی۔ اس کا بھڑک جانا لازمی تھا۔ اتنے سخت الفاظ سن کر بھی یہ تحمل خیزی اس جیسے بندے کی طبیعت کا خاصہ تو نہیں تھی۔ وہ اندر ہی اندر چوک گئی۔

ہاں تو تم چلے جائو۔” وہ برتن سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی طرف سے گویا بات ہی ختم ’ ’
کی۔

لیکن میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔” اس نے اس کے اس طرح کہنے سے دوبارہ ٹوکا۔ ’ ’

وہ ورطہ حیرت میں غرق ہو گئی۔ اس نے اس کے اتنے رنگ دیکھے تھے کہ یہ نرم نرم رنگ سمجھ نہیں آ رہے تھے۔

یا خدا! آج اس بندے کو ہو کیا گیا ہے۔ سمجھ سے بالاتر ہے۔ اتنی فکر وہ بھی مجھ جیسی ’ ’
”لڑکی کی۔ کہیں اس کا دماغ تو نہیں گھوم گیا۔ پہلے ہی کافی پاگل ہے مزید ہو گیا ہو گا۔

میرا وہاں کوئی نہیں ہے پھر میں کس کے پاس ملنے جائوں گی۔” برتن سنک میں ’ ’
رکھتے ہوئے اس نے جتانے والے انداز میں جواب دیا تو شاہ زر چپ ہو گیا۔

اس کے لہجے میں بھی پہلے والی سرکشی اور استہزاء نہیں تھا۔ پہلے جب بھی بات ہوتی تھی یوں ہی لگتا تھا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہو اور اب وہ پہلے والی کوئی بات ہی نہیں رہی تھی۔ عام سے لہجے میں سب کہہ رہی تھی۔ بالکل نارمل لہجے میں۔ وہ کئی لمحے سن بیٹھا رہا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی سب سے قیمتی متاع حیات کو دھیرے دھیرے آگ لگا رہا تھا۔

مشعال! میں جو میڈیسن لایا تھا تم یوز تو کر رہی ہو؟” ٹیبل سے اٹھتے ہوئے اس نے ’ ’
ایک دفعہ پھر پوچھا تو۔ غصے کا اُبال اٹھا تھا اس کے اندر۔ جی تو چاہا ایسا کڑا جواب دے کہ

موصوف کے چودہ طبق روشن ہو جائیں لیکن چپ رہی بلکہ پلٹے بغیر گردن ہلا دی۔ پھر استہزائیہ ہنس دی۔ وہ واقعی چکنا گھڑا ثابت ہو رہا تھا۔ یا پھر اسے ہی لگا۔

“بے فکر رہو شاہ زر جہانزیب! میں بہت ڈھیٹ ہوں اتنی ڈھیٹ کہ اتنی جلدی مرنے والی نہیں ہوں۔ جب گولیوں سے چھلنی وجود تھا تب بھی نہیں مری تھی۔ اس وقت بھی جسم سے جان نہیں نکلی تھی جب ماما پاپا کی ذات کا اعتماد میرے دل سے رخصت ہوا تھا۔ تمہارا وحشی پن سہہ کر پتھر ہو گئی ہوں۔ پتھر ٹوٹتے ہیں روتے نہیں اور اب بھی میں مرنے والی نہیں ہوں۔ جب روز پوائزن اپنے اندر اتار رہی ہوں۔ ہاں مروں گی تو تمہارے سلوک سے، میرے جسم سے جان نکلے گی تو تمہارے رویے کی بدولت۔ مجھے قبر میں اتارو گے تو صرف تم۔ مگر مجھے یہ کیوں لگتا ہے کہ میں پھر بھی نہیں مروں گی؟ میں بہت سخت جان ہوں کوئی صدمہ مجھ پر اثر ہی نہیں کرتا، کسی کی بے اعتباری میری نبضیں نہیں روکتی، کسی کی گالیاں مجھے مدفن نہیں کرتیں۔ مجھ پر تو تمہاری مار بھی اثر نہیں کر رہی۔ تمہاری نفرت مجھ سے گھن کھانا کچھ بھی تو مجھے نہیں مار رہا۔ میں بہت ڈھیٹ ہوں۔ بھلا میں کیونکر مروں گی۔ ابھی تو تم نے مجھ سے بہت زیادہ بدلہ لینا ہے۔ تمہارا انتقام ابھی پورا کب ہوا ہے۔ بغیر بدلہ لئے میری جان جسم سے نکالے بغیر تو تم مجھے مرنے بھی نہیں دو گے۔ میں جانتی ہوں۔ سب سمجھتی ہوں تم یہ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو کیوں زور دے رہے ہو۔ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہارے ہاتھوں نے میری کھال کو نہیں ادھیڑا۔ میں کتنے دن ہو گئے تمہاری وحشت کی بھینٹ جو نہیں چڑھی۔”

مسلسل آنسو بہاتے وہ روئے جا رہی تھی۔ برتن دھو کر باہر نکلی تو وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی چینل پر چینل بدلتی رہی۔ شام ہوتے ہی شاہ زر واپس گھر لوٹ آیا تھا کھانا کھا کر وہ بھی ٹی وی کے سامنے اپنے آفس کی فائلز لے کر بیٹھ گیا۔ وہ اسے چور نظروں سے دیکھتی اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی لیکن شاہ زر کی پکار پر رک گئی۔

کہاں جا رہی ہو؟" فائل سے نظریں اٹھا کر وہ اسے دیکھتے پوچھ رہا تھا۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر واپس مڑی۔ شاہ زر کی یہ مداخلت بہت ناگوار گزری تھی۔

"سونے جا رہی ہوں۔

آج کل تم کچھ زیادہ ہی سونے لگی ہو!" وہ تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چہرے پر ناگواری کے تاثرات لئے لب بستہ کھڑی رہی۔

طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" وہ فائل بند کر کے اٹھ کر اس کی طرف چلا آیا۔ وہ تب بھی بے بسی سے دیکھ کر اطراف کا جائزہ لینے لگی۔

سنا نہیں... میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے..." اس کی مسلسل چپ پر وہ جھنجلا کر دیکھنے لگا۔

وہ نظر انداز کئے بدستور ارد گرد دیکھتی رہی۔ چپ رہ کر وہ اسے جو شکست دے رہی تھی وہ اسے اندر ہی اندر تقویت پہنچا رہی تھی۔

‘‘مشعال ! یہ کیا انداز اپنا رکھا ہے تم نے۔'' وہ اس سے زیادہ نرم رویہ نہیں اپنا سکتا تھا۔ ایک دم غصے سے پوچھنے لگا وہ پھر بھی چپ ایستادہ جمی رہی۔

‘‘اچھا چلو کمرے میں' اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ وہ بھی چپ نہیں رہ سکتی تھی۔ نخوت سے سر جھٹکتے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑوا کر خونخوار نظروں سے دیکھنے لگی۔ آج کتنے دنوں بعد اس کے اندر وہی پہلے والے انداز نے سر ابھارا تھا۔

‘‘میں نہیں جاؤں گی۔ تم حاکم مرد ہو اور تمہارے شکنجے میں پھنسی بے بس و کمزور سی لڑکی ہوں۔ میں نے تمہیں چیلنج کیا تھا اور تم نے مجھے ہرا دیا۔ اب میں ہی اپنی شکست کو مانتی ہوں۔ میرے منہ سے یہی سننا چاہتے تھے ناں تم تو سنو! میں نے تمہاری مردانگی کو تسلیم کر لیا ہے۔ میں مان گئی ہوں کہ تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ اس بات سے قطع تعلق کہ ہمارے درمیان جو تعلق تھا وہ کیا ڈیمانڈ کرتا ہے۔ میں نے تمہاری حاکمیت و سفاک طبیعت کو قبول کر لیا ہے۔ مگر اب خدا کا واسطہ ہے میری جان چھوڑ دو۔ مجھے میرے حال میں مست رہنے دو۔ کچھ پل سکون سے جی لینے دو۔ میں نے مان لیا کہ میں ہمیشہ سے غلط تھی اور تم درست تھے۔ یہ سب سن کر بھی تمہاری انا کو تسکین نہیں پہنچے گی۔ تم مجھے نہیں بخشو گے تو میں کیسے رہتی ہوں میں آخری حد تک بھی چلی جاؤں گی۔ میں تمہارے ہاتھوں اتنی دفعہ قتل ہوئی اتنی دفعہ موت کی طرف سفر کیا ہے کہ اب مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ ویسے بھی میں کون سی بہت اچھی

ہوں بہت پاکباز' باکردار اور باحیا ہوں۔ ہیں تو اتنی پنچ اور گھٹیا ہوں کہ گھن کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ تم تو مجھے قتل کرنے کے درپے تھے سو میں کہہ دیتی ہوں آئندہ تم نے اگر میرا راستہ روکا تو میں بہت برا کروں گی... سن لیا تم نے..." بات مکمل کر کے وہ اسے دھمکی آمیز نظروں سے دیکھ کر چپ ہو گئی۔ شاہ زر واقعی چند منٹوں کے لئے اس کے لہجے اور اس کی سرد آنکھوں میں دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ مشعال کے لہجے اور اس کی آنکھوں میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ وہ اسے دوسرے کمرے کی طرف جاتے اور اندر گم ہوتے دیکھتا رہا مگر خود میں اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ آگے بڑھ کر اسے روک سکتا۔ بے بسی سے مٹھیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگا۔

ؤؤؤ

پھر تو جیسے یہ مشعال کی روٹین بن گئی تھی۔ وہ اماں سے باتیں کرتی تھی لیکن اس گفتگو کا دورانیہ بھی بہت مختصر ہوتا' صرف چند گھنٹے۔ شاہ زر سے تو اس نے سرے سے بات کرنا' بلانا اور دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر میں ہوتے ہوئے بھی گھر میں نہیں ہوتی تھی۔ وہ قسمت کے لکھے پر شاکر نہیں تھی۔ اللہ کی مرضی پر راضی بہ رضا نہیں تھی شاہ زر زبردستی اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اور وہ اس زبردستی کے رشتے کو کسی بھی قیمت پر نہیں نبھاہ سکتی تھی۔

سارہ اماں کے لا کر دیئے گئے گولیوں کے دونوں پتے ختم ہونے والے تھے صرف تین گولیاں تھیں جو ایک پتے میں باقی تھیں۔ اس وقت وہ تینوں گولیاں نکال کر اس نے منہ میں رکھ لیں۔ حسرت سے اپنے ارد گرد ایک نظر ڈالی۔ اندر سینے میں دھڑکتا دل بھی ٹوٹنے لگا۔ آج یہ

اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ تین گولیاں کھانے کے بعد اس کا جسم زندگی کی قید سے بالکل آزاد ہو جائے گا۔ لمحہ بہ لمحہ خود کو اپنے ہاتھوں سے موت کے منہ میں دھکیلنا آسان کام تو نہیں تھا۔ لیکن وہ یہ مشکل مرحلہ بآسانی طے کر گئی تھی اب تو صرف صندوق میں آخری کیل ٹھوکنا باقی تھی۔ نیم مردہ جسم سے اب صرف جان نکلنا رہ گئی تھی۔ منہ میں گولیاں رکھنے کے بعد اس نے گلاس میں پانی ڈالا ہی تھا کہ شاہ زر کمرے میں چلا آیا۔ اس نے جلدی سے ریپر مٹھی میں دبا لیا۔ شاہ زر کو اگنور کیئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔ جیسے ہی گولیاں حلق سے نیچے اتریں گلاس ٹیبل پر رکھ کر وہ شاہ زر کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

ایک ہفتے کے اس وقفے میں وہ ذہنی و جسمانی لحاظ سے اس حد تک کمزور ہو چکی تھی کہ اب دو تین دن سے بستر سے اٹھنا بھی محال ہو گیا تھا۔ پہلے زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں سوتے گزارتی تھی۔ اب تین دن سے مسلسل نیند میں غرق رہی تھی۔ سارہ اماں اور شاہ زر کس قدر پریشان تھے اسے اس کی قطعی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے اس فعل پر بہت مطمئن اور آسودہ تھی۔ سو اس نے ان کی طرف دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔

حویلی سے فون آیا ہے ابیشا تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔" جب سے فون کٹوا دیا تھا۔ ’ ’ ابیشا سے کبھی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ سنجیدہ لہجے میں اسے اطلاع دے رہا تھا۔ وہ اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

’’موبائل میرے کمرے میں رکھا ہوا ہے‘ جا کر بات کر لو۔‘‘ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر اسے جواب دیتا وہ باہر نکل گیا۔ بہت عرصے بعد اس کی ابیشا سے بات ہونے والی تھی۔ صبح سے اس نے کتنی شدت سے خواہش کی تھی کہ وہ کاش مرنے سے پہلے ایک دفعہ ابیشا سے بات کر لے۔ بعض خواہشیں کتنی جلدی پوری ہو جاتی ہیں۔ اب ابیشا کا نام سن کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ بمشکل اپنے بے جان ہوتے جسم کو گھسیٹتے وہ دوسرے کمرے میں پہنچی تھی۔ بیڈ کے سرہانے پر ہی موبائل رکھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر بے تابی سے کان سے لگا لیا۔

’’ابیشا! میری جان! کیسی ہو؟‘‘ وہ لاکھ خود کو ہارڈ اسٹون‘ ظالم پتھر دل اور بے حس ظاہر کرتی تھی مگر اس گھڑی ابیشا کی آواز سن کر سارے اختیار کھو بیٹھی۔ سارے حواس بے حواس ہو گئے۔ ساری نفرتیں بہہ گئیں۔ اتنی شدت اور کُرب سے پوچھ رہی تھی کہ آنسو ایک دم آنکھوں کی دہلیز پر آ بیٹھے۔ کمرے میں داخل ہوتا شاہ زر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر رک گیا۔ بستر پر بیٹھی‘ کان سے موبائل لگائے وہ حال سے بے حال دکھائی دے رہی تھی۔ نہ اپنا ہوش تھا اور نہ ہی کپڑوں کا۔

’’میں بالکل ٹھیک ہوں‘ آپ بتائیں کیسی ہیں؟‘‘ اس کے یوں بہت چاہ اور فکر مندی سے پوچھنے پر اس نے لاکھ کوشش کی کہ آنسو آنکھوں کی دہلیز عبور نہ کریں‘ ضبط چھلکنے نہ پائے۔ اختیار بے اختیار نہ ہو جائے مگر سب ارادے پسپا ہو گئے۔ سب کوششیں ناکام گئیں۔

سب تدبیریں رائیگاں رہ گئیں۔ آنسو ابیشا کے سوال پر تمام حدیں پار کر گئے تھے۔ پھر وہ خود کو رونے سے روک نہیں پائی تھی۔ بے آواز شدت کے ساتھ روتی رہی۔

"کیا بات ہے مشعال آپی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟ کیا ہوا ہے پلیز مجھے بتائیں۔ کہیں شاہ بھائی نے تو کچھ نہیں کہا۔ پلیز بتائیں آپ ٹھیک تو ہیں۔ پلیز بتائیں چپ کیوں ہیں؟ آپ بتائیں مجھے نہیں تو میرا دل بند ہو جائے گا۔" اس کی ہچکیوں کو محسوس کر کے وہ بے تابی سے کئی سوال کر بیٹھی تھی وہ پھر بھی چپ رہی بس روتی رہی۔ خود پر تو اس سے اختیار تھا ہی نہیں۔ ٹوٹی شاخ کی طرح لرز رہی تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب علیحدہ تباہ کاری مچا رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی تو کوئی صلاحیت تھی ہی نہیں۔

"پلیز مشی آپی! بتائیں کیا ہوا ہے؟ بتائیں نہیں تو میرا ضبط جواب دے جائے گا۔" مشعال کی طرف کوئی جواب نہ پا کر وہ روہانسی ہو گئی۔

"ابیشا میری جانو! میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری آپی بالکل ٹھیک ہے۔ پتا ہے ناں آج کتنے دنوں بعد تم سے بات کر رہی ہوں۔ یقین کرو میں آج کل بہت خوش ہوں۔ بہت سکون سے رہ رہی ہوں۔ ایسا سکون جو مجھے پہلے کبھی بھی نصیب نہ ہوا۔ میں برسوں تڑپی ہوں‘ نہ جانے کس خیال کس احساس نے مجھے بے چین کیئے رکھا تھا۔ آج وہ ساری بے چینی ختم ہو جائے گی۔ سارے احساس مر جائیں گے۔ سارا کُرب ڈھل جائے گا۔ وہ کُرب جس نے مجھے نہ ہی برطانیہ جیسی آزاد فضاؤں میں خوش رہنے دیا اور نہ ہی حویلی میں۔ تم یقین نہیں کرو گی لیکن یہ سچ ہے

میں یہاں بہت خوش ہوں۔" وہ روتے روتے بتانے لگی۔ شاہ زر حیران نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ سامنے نظروں کے جو مشعال بیٹھی ہوئی تھی اس کا تو کہیں تصور بھی نہیں تھا اور جس مشعال کا تصور اس کے ذہن میں زندہ تھا وہ یہ نہیں تھی۔ اس کے ذہن نگاہوں نے فوراً محسوس کر لیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے اور اس وقت حواسوں میں بھی نہیں تھی۔ نہ جانے کیا کچھ ابیشا سے کہہ رہی تھی۔

ابیشا! میں بہت بری ہوں۔" تمہیں' ماما اور پاپا کو ہمیشہ پریشان کیا۔ کبھی تم لوگوں کی بات نہیں مانی ہمیشہ خود کو حق پر سمجھا۔ بہت تنگ کرتی رہی ہوں میں تم سب کو۔ پلیز کبھی ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ واقعی میں آپ لوگوں سے بہت محبت کرتی ہوں میں اب تم لوگوں کو کبھی پریشان نہیں کروں گی۔ تم سب مجھ سے ناراض تھے ناں تو میں نے اس کا حل نکال لیا ہے۔ بس تم ماما پاپا کا خیال رکھنا۔ انہیں کہہ دینا میں انہیں بہت یاد کرتی ہوں۔ ان کے لئے بہت روتی ہوں میں ان سے ناراض بھی نہیں ہوں بھلا کبھی کوئی بیٹی اپنے ماں باپ سے ناراض ہو سکتی ہے۔ ہاں وہ مجھ سے خفا ہوں گے۔

کاش ابیشا میں ان سے معافی مانگ سکتی۔ کاش... شاید یہی طے تھا۔ شاید یہی کسک لئے مجھے اس دنیا سے چلے جانا ہے۔" وہ دروازے کی طرف پشت کئے ہوئے تھی۔ شاہ زر کی کمرے میں موجودگی سے بھی یکسر بے خبر تھی۔ وہ تو خود سے بھی اور اپنے الفاظ سے بھی بے خبر تھی۔

’ ’ مشی آپی! ایسی باتیں مت کریں بہت تکلیف ہو رہی ہے مجھے، آپ تو بہت مضبوط تھیں، بہت حوصلے والی تھیں پھر آج کیوں رو رہی ہیں ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟" دوسری طرف وہ اس کی باتوں سے از حد ہراساں ہو رہی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔

’ ’ کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے! بھلا مجھے کیا ہو سکتا ہے۔ اب بھی میں بہت مضبوط ہوں۔ بہت بڑا حوصلہ کیا ہے میں نے۔ اپنے ہاتھوں سے جان پر کھیل جانا بزدلوں کا کام تو نہیں ہوتا۔ بس یہ ہوا کہ مشعال جھک نہیں سکتی تھی۔ وہ جھکنے کے لئے پیدا ہی کب ہوئی تھی۔ اور اسی زعم میں ٹوٹ گئی۔ دیکھو ابیشا! تمہاری آپی کرچی کرچی ہو کر بکھر رہی ہے۔ ختم ہو رہی ہے۔ میں اندر تک ٹوٹ گئی ہوں ابیشا! اور حیرت کی بات ہے مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ شاید مجھے کسی نے اس قابل ہی نہیں سمجھا۔" وہ مزید پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ موت اس سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بہت تیزی سے سرائیت کرتی جا رہی تھی۔ وہ ابیشا سے ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کا ذہن سوتا جا رہا تھا اس کے اعصاب چٹختے جا رہے تھے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ نیند کی گہری وادی میں اتر رہی تھی۔ سلیپنگ گولیاں اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔

’ ’ ابیشا! مجھے نیند آ رہی ہے، مجھے اب سونا ہے۔ تم اب پریشان نہیں ہونا۔ ماما پاپا کا بھی خیال رکھنا۔ ان سے کبھی میری باتیں مت کرنا۔ وہ بہت ہرٹ ہوں گے۔" اسے لگ رہا تھا وہ یونہی سو جائے گی۔ ابیشا دوسری جانب کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ خود بھی کچھ سننا چاہتی تھی مگر

اس کی سماعت بے حس ہو گئی تھی۔ وہ فون کان سے ہٹا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پوری طرح اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر اس نے بمشکل اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر آنکھیں کچھ بھی دیکھنے سے انکاری تھیں۔ اس کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے کی اس کے اندر اب ہمت نہیں رہی تھی۔ نیند پوری طرح غالب آ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں رفتہ رفتہ بند ہوتی جا رہی تھیں۔ بمشکل اپنے بری طرح چکراتے سر کو تھام کر وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ دروازے کے قریب پہنچتے ہی ایک دفعہ پھر چکرا گئی۔ شاہ زر جو پہلے ہی اس پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھا فوراً آگے بڑھا تھا اس کے چکراتے گرتے وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

مشعال! ہوش کرو۔ کیا ہوا ہے؟" اس کے پرسکون ہوتے سراپے کو وہ بازوؤں میں ’ ’ سنبھالے بری طرح چیخا مگر مشعال کو تو نیند آ رہی تھی۔ بہت گہری، ہمیشگی والی نیند۔

مجھے معاف کر دو ابیشا! اب تمہاری آپی کبھی زندہ نہیں رہے گی۔" بہت ہلکی مدھم ’ ’ سرگوشی تھی جو اس کے پرسکون ہوتے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔

مشی!" شاہ زر نے اسے بازوؤں سے جکڑے بری طرح جھنجھوڑا تو مشعال نے ’ ’ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنا چاہی تھیں مگر کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں تو دور بہت دور بہت ہی سریلی، مدھر و مدہوش کن لے میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ کوئی بہت ہی تڑپ سے میٹھی میٹھی آواز میں اسے آوازیں دے رہا تھا۔ کوئی اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس پر محبت و توجہ

کے پھولوں کی بارش برس رہی تھی۔ چاروں طرف خوشبو رقصاں تھی۔ مندر کی گھنٹیاں تیز سے تیز ہوتی جارہی تھیں۔ خوشبو اس کے وجود پر چھائی اسے مدہوش کرتی جارہی تھی۔ وہ کسی کی توجہ و قرب کی بارش سے نہاتی جارہی تھی۔ وہ میٹھی میٹھی مدھر و دلنشین آوازوں پر آنکھیں کھولنا چاہتی تھی لیکن نیند نے اسے مہلت ہی نہیں دی تھی۔ اچانک ساری گھنٹیاں خاموش ہوگئیں۔ مدہوش خوشبو غائب ہوگئی۔ اس کا ذہن کسی تاریک اندھیرے کی لپیٹ میں آگیا۔ پھر سارا منظر بدل گیا۔ اب صرف اندھیرا تھا۔ گہرا گھپ اندھیرا۔ ڈراؤنا اندھیرا۔ شاید سلیپنگ پلز اپنا اثر دکھا چکی تھیں۔ وہ منٹوں میں ہی شاہ زر کی بانہوں میں جھول گئی۔

اوہ... مائی گاڈ... یہ کیا ہوا؟" سدا کا انا پرست ضدی' پتھر دل اپنی متاع حیات کو اس ’ ’ حالت میں دیکھ کر پگھل گیا۔ پگھل تو وہ اسی وقت گیا تھا جب وہ ابیشا سے بات کرتے زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے فوراً اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ نگاہ اچانک اس کی بند مٹھی پر ٹھہر گئی۔ دل نے انوکھا شور مچانا شروع کر دیا۔ کئی قسم کے خیالات گھر گھر آنے لگے۔ جلدی سے اس کی بند مٹھی کھولی تو خالی ریپر نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ از حد حیران ہوا۔ بے یقین نظروں سے خالی ریپر کو گھورے گیا۔ خالی ریپر میں تقریباً دس گولیاں تھیں جو ساری کی ساری کھائی جاچکی تھیں۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ نگاہوں کے سامنے سارا کمرہ گھومنے لگا جبکہ ذہن صرف اسی آواز میں الجھا ہوا تھا۔ وہ ان الفاظ کا متن سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مجھے معاف کر دو ابیشا! اب تمہاری آپی کبھی زندہ نہیں رہے گی۔" آواز تھی یا کوئی بم۔ وہ تڑپ اٹھا ایک دم چیخ پڑا۔ اس کے اعصاب جھنجا گئے۔

"نہیں۔

"...یقین کرو میں آج کل بہت خوش ہوں' بہت سکون سے رہ رہی ہوں

ایک نیا خیال دل کی دنیا تہہ و بالا کرنے لگا۔ اس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

میں برسوں تڑپی ہوں نہ جانے کس خیال' کس احساس نے مجھے بے چین کیئے رکھا تھا۔ آج وہ ساری بے چینی ختم ہو جائے گی۔ سارے احساس مر جائیں گے۔ سارا کرب ڈھل جائے گا۔" پھر وہ کہہ رہی تھی۔

ابیشا! میں بہت بری ہوں تمہیں' ماما اور پاپا کو ہمیشہ پریشان کیا۔ کبھی..." اس کا ذہن کسی بھی خیال پر نہیں ٹھہر رہا تھا۔

بھلا کبھی کوئی بیٹی اپنے ماں باپ سے ناراض ہو سکتی ہے ہاں وہ مجھ سے ضرور خفا ہوں گے۔ کاش ابیشا! میں ان سے معافی مانگ سکتی' کاش...شاید یہی کسک لئے مجھے دنیا سے چلے جانا ہے۔"

وہ اسے جب سے یہاں لے کر آیا تھا ایک دفعہ بھی اس کے لبوں سے اپنے ماں باپ کا نام نہیں سنا تھا۔ اب وہ ابیشا سے تھوڑی دیر پہلے ان کی باتیں کر رہی تھی۔ کس قدر حسرت سے وہ سب

کہہ رہی تھی۔ کتنی تڑپ تھی اس کی آواز میں۔ کتنی محبت پنہاں تھی اس کے آنسوئوں کی روانی میں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے اپنا حل نکال لیا ہے اور یہ کیسا حل تھا۔ شاہ زر کا ذہن مائوف ہوتا جا رہا تھا۔ بے چینی و بے قراری تو حد سے ہوا تھی۔ بس سمجھ کر بھی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنے مضبوط اعصاب کا مالک' پہاڑ جیسے حوصلے والا معاملہ فہم شاہ زر جہانزیب اس گھڑی اس قدر بے بس ولاچار خود کو محسوس کرنے لگے گا۔ اس قسم کی کسی مشکل میں بھی پڑ جائے گا۔ اگر مشعال کا بے سدھ وجود اسے چڑا رہا تھا تو دوسری طرف سلیپنگ پلز کا خالی ریپر جسم سے روح تک کھینچ لا رہا تھا۔ وہ انتہائی بے بسی سے ٹہلنے لگا۔ مشعال نے واقعی ایک حل نکال لیا تھا۔ اس کا ذہن اس کے گزشتہ رویوں کی طرف دوڑنے لگا۔ پھر ایک آواز سب آوازوں پر حاوی ہو گئی۔

کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے'... بھلا مجھے کیا ہو سکتا ہے۔ میں اب بھی بہت مضبوط ہوں۔ ' '
بہت بڑا حوصلہ کیا ہے میں نے' اپنے ہاتھوں سے اپنی جان پر کھیل جانا بزدلوں کا کام نہیں ہوتا۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رک گیا۔ مشعال کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھا تو فوراً اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں اس کے چہرے پر واقعی بہت سکون تھا۔ وہ کہہ رہی تھی ابیشا سے کہ وہ یہاں بہت سکون سے ہے۔ ہمیشہ سے چاندنی سے پرنور چہرہ زردی کی رداوڑھے محو استراحت تھا۔ اس نے سختی سے ہونٹ کاٹ لئے تو مشعال کا ہوش و حواس میں حرکت کرتا وجود اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اسے چڑانے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

دیکھ لو! مشعال جھک نہیں سکتی تھی۔ مشعال جھکنے کے لئے پیدا ہی کب ہوئی تھی اور ’ ’ اسی زعم میں ٹوٹ گئی۔ بکھر گئی ہے۔ کرچی کرچی ہو گئی ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے۔ تم تو خود یہی چاہتے تھے کتنی شدید خواہش تھی ناں تمہاری مشعال کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارنے کی ترساترسا کر مارنے کی لو آج وہ تمہاری پوری ہو رہی ہے۔ تمہیں تو اس سے گھن آتی تھی بہت.بری لگتی تھی ناں تو وہ آج اپنے بے حیا و شرمناک وجود سمیت تمہاری زندگی سے ”بغیر تمہیں بتائے نکل چلی ہے تو پھر اب اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو۔

مشعال! اٹھو... پلیز ہوش کرو...” وہ ایک دم پاگل ہو گیا۔ دیوانوں کی طرح اسے ’ ’ جھنجھوڑنے لگا مگر وہ نہیں اٹھی تھی اس پر شاہ زر کی کسی پکار کا اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ جو اس کی ہر چوٹ اور ہر بات کا جواب دینا اپنے لئے فرض عین سمجھتی تھی۔ اس وقت شاہ زر کی دیوانگیوں سے بے خبر آنکھیں موندے سب سے روٹھ چکی تھی۔ شاہ زر کی توجہ ایک دفعہ پھر خالی ریپر کو دیکھنے لگا۔

اس کے پاس یہ گولیاں کہاں سے آئیں؟” کافی دیر بعد کوئی قابل غور خیال ذہن میں ’ ’ سمایا تھا وہ جوں جوں سوچتا جا رہا تھا مزید الجھتا جا رہا تھا۔

اگلے ہی پل وہ اماں کو چیخ چیخ کر آوازیں دینے لگا۔ وہ فوراً بھاگی آئیں۔ شاہ زر کو پریشانی و بے چینی سے ٹہلتے اور مشعال کو اس کے کمرے میں سوتے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

کیا بات ہے بیٹا! کیوں پکار رہے تھے؟” انہیں ان جانے خدشے تنگ کرنے لگے۔ ’ ’

‘‘یہ گولیاں آپ لائی تھیں؟’’ اس نے خالی ریپر اماں کے سامنے کیا تو وہ دیکھ کر مزید چونکیں۔ ضرور کہیں کچھ غلط ہو گیا تھا ان کا دل پکار پکار کر کہہ دیا تھا۔

‘‘ہاں... میں نے چوکیدار سے کہہ کر منگوائی تھیں لیکن بیٹا...!’’

‘‘کیوں... کیوں منگوائی تھیں؟’’ اماں سے وہ ہمیشہ بہت تمیز سے بات کرتا تھا مگر اس وقت لہجہ خود بخود پتھر ہو گیا۔ اماں مزید پریشان ہو گئیں۔

‘‘مشعال کے سر میں درد ہو رہا تھا اسی نے لکھ کر دی تھیں میں نے چوکیدار سے کہہ کر منگوادیں۔ یہ والے تو دو پتے تھے میں نے خود دیکھے تھے اس کے علاوہ بھی دو اور رنگوں کے بھی دو پتے تھے۔ دیکھ بیٹا! میں پڑھی لکھی ہوں نہیں میں کیا جانوں؟ یہ دوائیں کیسی ہیں؟’’ اماں شاہ زر کے سخت رویے سے سمجھ گئیں ضرور کچھ الٹ ہو گیا ہے۔

‘‘کب لا کر دی تھیں آپ نے... آج؟’’ وہ پوچھ رہا تھا، اماں نے نفی میں گردن ہلادی۔

‘‘ہفتہ ہو گیا ہے پچھلے جمعے کو لا کر دی تھیں۔’’

‘‘کیا!’’ اماں کی بات پر تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ‘‘اوہ... نو... کیا کہہ رہی ہیں آپ! اس کا مطلب ہے یہ پچھلے جمعے سے یہ گولیاں استعمال کر رہی ہے اور آج تو سوموار ہے... یہ... یہ کیا کر دیا اس کم عقل لڑکی نے...’’ وہ بار بار ماتھا مسلتے بستر پر ہی ٹک گیا یا تو ٹانگوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اماں نا سمجھی میں اسے دیکھے گئیں اور وہ اسے دیکھنے لگا۔ جو خود سے

بے گانہ اس کی توجہ حاصل کئے سو رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا اس کی گری گری طبیعت اور مسلسل نیند لیتے دیکھ کر بھی اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ اس کی باتوں سے بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اس حد تک چلی جائے گی۔ اس لئے تو وہ علیحدہ کمرے میں ٹیبلیٹز کھا کر سو جاتی تھی۔ ساری رات اور سارا دن پڑی سوتی رہتی تھی۔ وہ اور اماں سمجھ رہے تھے کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے۔ جان بوجھ کر بار بار دستک دینے پر بھی دروازہ نہیں کھولتی لیکن اصل بات کیا تھی اب اس کے علم میں آئی تھی۔

وہ ایک بے بس سی نگاہ مشعال کے وجود پر ڈال کر رہ گیا۔ دوسرے کمرے میں آ کر دوسرا ریپر تلاش کرنے کی کوشش کی چند منٹوں کی تلاش بسیار کے بعد وہ بھی تکیے کے نیچے سے میڈیسن والے شاپر میں پڑا مل گیا دوسرا ریپر بھی خالی تھا۔ شاہ زر کے تو رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ نیند کے علاوہ دو اور ریپرز تھے ایک ڈسپرین اور دوسرا اپیناڈول کا۔ وہ سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ بے بسی کے ساتھ ساتھ مشعال پر غصہ بھی آنے لگا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے سوئے ہوئے وجود کو جھنجوڑ کر کھڑا کر دے۔

''کیا بات ہے؟ کیا کیا ہے اس نے؟ بتاتے کیوں نہیں۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔'' اماں اسے سر تھامے دیکھ کر الجھ گئیں۔ اس نے ایک بے چارگی کی سی نگاہ ان پر ڈالی۔

''اماں! یہ نیند کی گولیاں ہیں۔ اس قدر ہائی پوٹنسی کی گولیاں ہیں اگر بندہ صرف ایک گولی استعمال کرے تو ساری رات ہوش و حواس میں نہیں رہتا اور آپ کی چہیتی پورے ایک ہفتے

سے یہ گولیاں استعمال کر رہی ہے اور آج پتا نہیں اس نے کتنی گولیاں لی ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی سے یہ قبر میں بھی جا سکتی ہے مگر اس بات سے اس کو کیا!" سخت جھنجلاہٹ، غم و غصے، بے یقینی اور پریشانی سے کہتا گیا۔ اماں سن کر حیران و پریشان ہوئیں۔ اس کے لب و لہجے پر ہول ہی تو گئیں۔

خدا خیر کرے یہ کیوں مرے گی۔ کبھی اچھا بول نہ بولنا۔ جب بھی کچھ کہنا الٹا ہی کہنا۔ میں تو سچ کہتی ہوں یہ سب تمہارا قصور ہے۔ تم نے ہی اس کو اس حالت تک پہنچایا ہے۔ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے کہ یہ اس حد تک چلی گئی۔ میں نے کتنی دفعہ سمجھایا تھا تمہیں کہ یہ ضدی ہے، کم عقل ہے، لڑکی ذات ہے لیکن تم تو مرد ہو، اچھا بھلا سوچ سکتے ہو، عقل و خرد رکھتے ہو۔ پھر بھی تم نے میری کوئی نہ سنی۔ کتنا کہا میں نے سختی نہ کرو، سختی سے چیزیں سنورتی نہیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ تو پھر انسان تھی کوئی چیز تو نہیں تھی جو ٹوٹ جاتی تو بازار سے نئ لے آتے۔ مگر تم نے میری کوئی بات نہیں مانی۔ نہ جانے تم پر کس بات کا بھوت سوار تھا۔ یہی میری تربیت تھی نا۔ اچھی لاج رکھی شاہ زر تم نے میری شب و روز کی محنت کی۔ اچھا صلہ دیا تم نے میری خدمتوں کا۔ دیکھ لیا تم نے اب انجام بھی۔ اسی دن سے میں تمہیں روکتی تھی۔ اس کے ماں باپ کو کیا جواب دو گے جو تمہیں بیٹوں سے بھی بڑھ کر چاہتے ہیں جنہوں نے تمہاری خاطر اپنی بیٹی کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اس سارے قصے میں تو مشعال کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ جس دیس سے آئی تھی وہاں کا معاشرہ ہی ایسا ہے۔ بے باک، نڈر۔ اس کی تربیت اسی

ماحول میں ہوئی تھی اب تو یہ ہمارا کام تھا کہ اسے ہم اپنی محبت، توجہ سے اپنا بنا لیتے۔ اپنی مٹی کا اسیر کر لیتے۔ یہ اصل میں بگڑی ہوئی نہیں تھی تم بگڑے ہوئے تھے۔ شروع سے ہی ایسے ہو تم۔ دوسروں کو اذیت دے کر تمہیں سکون ملتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ بھی اوروں کی طرح جانوروں سے بھی برا سلوک کرتے رہے۔ یہ تک نہ سوچا یہ تمہاری بیوی ہے۔ پھر بھی تم توقع رکھتے تھے کہ یہ تمہارے سامنے زبان نہ چلائے، روئے نا، جو تم کرتے جاؤ چپ چاپ آنکھیں بند کئے سب برداشت کرتی جائے۔ مگر پاگل! یہ کیوں نہیں سوچا یہ بھی انسان ہے گوشت پوشت سے بنا وجود۔ کیا یہ تمہارے ظلم پر چیختی بھی نہ۔ درد ہو تو چیخ کا نکل جانا لازمی امر ہے۔”

اماں مشعال کے لئے رو رہی تھیں۔

“شاہ زر! تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ اگر اس کو کچھ ہوا تو میں کبھی تمہاری شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔ کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اگر تم اس سے محبت سے پیش آتے، نرم رویہ رکھتے، اچھی نظر سے دیکھتے تو یقینا جواب میں تمہیں بھی یہی سب کچھ ملنا تھا۔ اس نے کبھی میرے ساتھ بد تمیزی نہیں کی۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ اسے تو ہماری توجہ، پیار، محبت، نرمی اور اچھے سلوک کی ضرورت تھی اور تم نے شاہ زر اسے توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔” اماں روتے روتے اپنی خفگی کا اظہار کر کے دوسرے کمرے میں آ گئیں۔ مشعال کے بے خبر، بے سدھ، لاپرواہ وجود کو سیدھا کر کے بکھرے، پریشان بالوں کو سمیٹ کر کمبل اوڑھایا، شاہ زر بھی وہیں آ گیا۔ خود کو پر سکون ظاہر کر رہا تھا۔ مگر اندر تو ایک طلاطم برپا

تھا۔ بھانبھڑ مچا ہوا تھا۔ رہی سہی کسر اماں کی باتوں نے پوری کر دی تھی۔ وہ شرمندگی‘ تاسف‘ ندامت کی آگ میں جلتے پریشان ہو رہا تھا۔ وہ یہ بات نظرانداز نہیں کر سکتا تھا نہ اسے اس کے حال پر چھوڑ سکتا تھا کسی بھی قیمت پر نہیں۔ اس قدر تیز گولیاں تھیں اور دوسرا وہ ایک ہفتے سے مسلسل استعمال کر رہی تھی۔ ایسی گولیاں تو ایک ذی ہوش و خرد مند انسان کو بھی ذہنی و جسمانی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ موت کو گلے لگا لیتا ہے جبکہ مشعال کے وقتی فرار میں چھپا یہ مقصد کھل کر واضح ہوا تو دکھ‘ پریشانی‘ کرب‘ غم و اذیت نے سارے وجود پر ڈیرہ جما لیا۔

’’اب کیا ہوگا!‘‘ اماں اپنے آنسو صاف کر کے اس کے پریشان چہرے کو دیکھنے لگیں۔ وہ مشعال کی کلائی تھام کر نبض چیک کرنے لگا۔ بہت آہستہ رفتار سے چل رہی تھی۔

’’پتہ نہیں کیا ہوگا؟ کلائی چھوڑ کر وہ بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ عجیب ٹوٹے ٹوٹے اعصاب تھے۔ اماں کو ایک دم اس پر ترس آیا۔ مشعال کے لئے وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھیں۔

’’اسے ہوش کب آئے گا؟‘‘

’’پتا نہیں... آئے گا بھی یا نہیں...‘‘ وہ بہت مایوس تھا۔ سارا طنطنہ صابن کی جھاگ کی طرح بہہ گیا تھا۔

اللہ نہ کرے...‘‘اماں نے بہت تڑپ کر مشعال کا ہاتھ لبوں سے چھو کر سینے سے لگالیا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتے انہیں دیکھے گیا۔

اماں ! یہ ایک ہفتے سے یہ گولیاں استعمال کر رہی ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ آج اس نے کتنی لی ہیں۔ ایک تو قبول صورت ہے' ہوش میں لایا جاسکتا ہے لیکن ایک سے زائد اماں ! ‘‘اس کے لئے بہت نقصان دہ ہیں۔ اس صورت میں کہ وہ پہلے بھی استعمال کرتی رہی ہوں۔

‘‘۔شاہ زر ایک کام کرو۔ اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔

کیا کہہ رہی ہیں اماں ! یہ بہت مشکل ہے۔ سو طرح کے مسائل ہو سکتے ہیں۔ اوپر سے ہمیں یہ بھی تو علم نہیں کہ آج اس نے کتنی گولیاں استعمال کی ہیں۔‘‘ اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ نفی میں گردن ہلانے لگا۔ اماں نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

تو کیا اسے مرنے کے لئے چھوڑ دو گے ؟ اتنے ظالم مت بنو ! انسانیت کی توہین مت کرو ! کچھ خدا کا ہی خوف کر لو۔ یہ بیوی ہے تمہاری۔ اسلام نے تو اسے لباس قرار دیا ہے اور تم کیسے شوہر ہو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے آپ کو برہنہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ ایک مسلمان کا فرض اپنی بیوی کو صرف کھلانا پلانا ہی نہیں بلکہ اچھا سلوک کرنا بھی ہے۔ کہاں گئی تمہاری وہ تعلیم ؟ تمہاری اسلام سے محبت ؟ کچھ کام نہیں آئے گا تمہارے جو تم نے مدرسہ بنوایا' اسپتال بنوایا... سب اعمال ضائع جائیں گے اگر تم حقوق الناس کا ہی خیال نہیں کرو گے۔ کتنے غلط ہو تم میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ انسان کو تو اپنے پالتو کتے سے بھی محبت ہو جاتی ہے اس کے زخم

پر مرہم لگاتا ہے اور یہ تمہاری بیوی کیا جانور سے بھی گئی گزری ہے؟ ذرا بھی تمہارے دل میں اس کے لئے محبت نہیں ہے؟ نکاح کے لفظوں سے تو میاں بیوی کے دل میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ تم کیسے شوہر ہو جو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی بیوی کو مارنے پر تلے ہوئے ہو۔ شرم محسوس ہو رہی ہے مجھے خود سے۔ کاش میں نے تمہاری تربیت نہ کی ہوتی یا پھر تمہاری ماں سے کوئی وعدہ ہی نہ کیا ہوتا۔" اماں زار و قطار رونے لگیں۔ وہ مزید پریشان ہو گیا۔

اماں! میرا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا۔ میں تو کسی اور رنگ میں کہہ رہا تھا۔ اچھا روئیں نہیں۔ میں گاڑی نکالتا ہوں پھر اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔"

شاہ زر انہیں چپ کراتے ایک دم اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اماں نے فوراً چادر کے پلو سے اپنے آنسو صاف کئے۔

ؤؤؤ

وہ اسپتال کے کمرے میں بستر پر لیٹے لیٹے رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی جب وہ دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر صفحہ الٹتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے رسالہ بند کر کے اماں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ شاہ زر اس کے پائوں کی جانب ٹیبل پر دھری فائل میں موجود کاغذات دیکھنے لگا تھا جبکہ اماں اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔ رات کی شفٹ ختم ہو گئی تھی۔ دن کی شروعات ہوتے ہی اماں نو کے قریب اس کے پاس اسپتال میں موجود تھیں۔

کیسی طبیعت ہے اب تمہاری' رات اچھی گزری ناں۔" اس کی پیشانی چوم کر وہ پوچھنے ' ' لگی۔ وہ اس قدر والہانہ پیار پر بے دلی سے مسکرا دی۔ رسالہ ایک طرف رکھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

میں ٹھیک ہوں۔ آپ میری فکر کیوں کرتی ہیں۔" اس نے ایک نظر شاہ زر کی طرف ' ' دیکھا جو فائل بند کر کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ مسلسل ایک ہفتے سے اسے یونہی چپ چاپ اپنی روٹین بناتے دیکھ رہی تھی۔ رات وہ اس کے پاس اسپتال میں بھی گزارتا تھا۔ ان آٹھ دنوں میں وہ جس قدر خاموش رہا تھا وہ اس کی اس خاموشی پر اندر ہی اندر حیران تھی۔ لیکن اپنی حیرت کا اظہار نہیں کر سکی تھی۔

آئندہ تم نے ایسی بات کی تو میں بہت ناراض ہوں گی۔ لو بھلا بتاؤ ماں بیٹیوں کی فکر ' ' کیوں کرتی ہے۔" انہوں نے خفگی سے کہا تو اس نے مسکراتے دونوں بازو ان کے کندھوں کے گرد حمائل کر لئے۔ شاہ زر باہر جا چکا تھا۔ کمرے میں وہ صرف دونوں تھیں۔

۔اماں ! ماں بھی تو ایسی بیٹی کی فکر کرتی ہے جو قابل محبت ہو۔ میں تو بہت بری ہوں۔ ' ' بہت بے شرم و بے حیا۔ اماں ! میں تو اتنی گری ہوئی ہوں کہ مجھ سے صرف گھن ہی کھائی جاسکتی ہے' محبت نہیں کی جاسکتی مجھ پر تو تھوکا جاسکتا ہے' محبت بھرے دامن میں سمیٹا نہیں جاسکتا۔ اماں ! میں نے اپنی حقیقی ماں اور باپ کو بدلتے دیکھا ہے۔ انہوں نے کس قدر بے مروتی سے ہر تعلق بھلا کر صرف فیصلہ سنا دیا تھا۔ اور اماں ! پھر بھی آپ میری فکر کرتی ہیں؟

اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود بھی؟" وہ بہت آزردگی و یاسیت سے کہہ رہی تھی۔ اماں نے ایک دم اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

"ماں قربان! کیوں کرتی ہو ایسی باتیں۔ اپنا بھی دل جلاتی ہو اور میرا بھی۔ تم میری بیٹی ہو۔ ماں ہوں میں تمہاری۔ اب الٹا سیدھا بولا تو ایک ہاتھ لگاؤں گی۔ ابھی تم خود ماں نہیں بنی ناں تمہیں کیا علم ممتا کیا ہوتی ہے؟ اسی لئے ایسا سب کچھ کہہ رہی ہو۔ جب خود اولاد پیدا کرو گی تو پھر میں پوچھوں گی۔ بھلا ماں باپ اولاد کو کب چھوڑتے ہیں۔ یہ تو اولاد ہی نہیں سمجھتی۔" اماں بہت دکھ سے کہہ رہی تھیں۔ اس نے بہت ہی خاموشی سے ان کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ تبھی شاہ زر دوبارہ کمرے میں چلا آیا تھا۔

"شاہ زر! ڈاکٹر سے بات کر لو۔ پھر ہم مشعال کو گھر لے جائیں گے۔" اس کے بالوں میں کنگھا کرتے اماں نے کہا تو اس نے دونوں کو دیکھا۔ پھر سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

آج مشعال کو ڈسچارج ہو جانا تھا۔ آٹھ دن پہلے سوموار کی رات کو اماں کے آنسوئوں کے ہاتھوں بے چین ہونے کی بجائے وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے یہاں لے آیا تھا۔ میڈیسن کے استعمال نے مشعال کے جسم کو بالکل ہی بے بس کر دیا تھا۔ اندر کا سسٹم پوائزن نے ناکارہ بنا دیا تھا۔ قوت مدافعت ختم ہو چکی تھی۔ وہ جب اسے اسپتال لے کر آیا تھا تو وہ بہت سیریس حالت میں تھی۔ یہاں آ کر بھی اسے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پہلے تو ڈاکٹرز اسے ٹریٹمنٹ دینے کو تیار نہیں تھے۔ یہ سراسر خودکشی کا کیس تھا۔ مگر یہاں آ کر اس کا اپنا عہدہ

اور تعلقات کام کر گئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کی زندگی کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

جب ڈاکٹرز اسے آئی سی یو میں لے گئے تھے تو اسے کس قدر شدت سے احساس ہوا تھا کہ اس لڑکی کی زندگی اس کے لئے کس قدر اہم ہے۔ پوائزن جسم سے نکلا تو اس کے اندر بھی زندگی کی رمق دوڑنے لگی۔ دو دن بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں لیکن تب بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے نابلد تھی۔ بعد میں مسلسل ٹریٹمنٹ نے اسے زندگی کی طرف قدم بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب اسے علم ہوا کہ وہ زندہ بچ گئی ہے تو وہ کتنا روئی تھی۔

’’کیوں بچایا ہے ہے تم لوگوں نے مجھے؟‘‘ وہ اماں سے کتنا لڑی تھی۔ ان کے ہاتھوں کو جھٹکتے انہیں پیچھے دھکیلتے وہ بس مسلسل روئے گئی تھی۔

’’مجھے نہیں زندہ رہنا اماں! مجھے مار دو۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دو۔‘‘ وہ اماں اور اس کا چیخ چیخ کر رونا دھونا سہہ نہیں پایا تھا۔ فوراً کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر اسے خاموش کروا دیا تھا۔ اور پھر گزرتے لمحوں نے اس کو پھر نارمل کر دیا تھا۔ سارا دن اماں اس کے پاس رہتیں اور رات ہوتے ہی وہ خود چلا آتا۔ جب تک اماں اسپتال ٹھہرتیں تو وہ دو تین چکر ضرور لگاتا تھا۔ بعد میں وہ اماں کو گھر بھیج کر رات اس روم میں ہی ٹھہر جاتا تھا۔ اس نے اور اماں نے اسے اس حرکت پر ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اماں تو پھر بھی اس سے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کر لیتی تھیں جبکہ اس کے اندر تو اس کو مخاطب کر کے ایک لفظ بھی کہنے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی۔

اس نے حویلی میں کسی کو بھی اطلاع نہیں دی تھی۔ خواہ مخواہ وہاں سب پریشان ہو جاتے۔ پھر وہ انہیں کیا بتاتا کہ مشعال نے یہ حرکت کیوں کی ہے وہاں تو وہ سب یہ سمجھتے تھے کہ وہ مشعال کے ساتھ بہت خوش ہے۔ اب اگر انہیں ذرا بھی علم ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ کیسا وحشیانہ و ظالمانہ سلوک کرتا رہا ہے تو نہ جانے کیا کرتے۔ اسے رہ رہ کر خود پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔

اپنے رویوں' اعمال اور سلوک کی وجہ سے اس قدر شرمندہ تھا کہ سر اٹھا کر مشعال کو دیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ ہر لمحہ اسے اپنا آپ ایک گٹر کے گند کی طرح غلیظ محسوس ہوتا۔ احساس زیاں اس قدر تھا کہ کسی بھی پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

ڈاکٹر نے مشعال کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے سکون بھرا سانس لیا۔ تمام چارجز پے کر کے وہ دوبارہ کمرے میں آگیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی تھی۔ اور اماں آہستہ آہستہ اس کا سر دبا رہی تھیں۔

"کیا کہا ہے ڈاکٹر نے؟" مشعال کا خیال کرتے بہت آہستہ آواز میں انہوں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے گھر لے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ نارمل ٹریٹمنٹ تو گھر میں بھی ہوتا رہے گا۔ آپ سامان سمیٹیں۔" وہ ایک نظر اس پر ڈال کر خود بھی سامان اکٹھا کرنے میں اماں کی مدد کرنے کو آگے بڑھا۔

وہ اسے اور اماں کے گھر چھوڑنے کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ اماں اسے شاہ زر والے کمرے میں لے آئیں۔ جسم اس قدر لاغر ہو چکا تھا کہ وہ بغیر سہارے کے چل پھر نہیں سکتی تھی۔ باتھ روم تک جانے کے لئے اسے سہارے کی ضرورت پڑتی تھی۔

تم لیٹ کر آرام کرو، میں خانساماں سے کھانے پینے کا بندوبست کروالوں۔" اماں اسے ’ ’ بستر پر لٹا کر کمبل اوڑھا کر ہدایت دیتی باہر نکل گئیں۔

تم لیٹ کر آرام کرو، میں خانساماں سے کھانے پینے کا بندوبست کروالوں۔" اماں اسے ’ ’ بستر پر لٹا کر کمبل اوڑھا کر ہدایت دیتی باہر نکل گئیں۔

وہ بستر پر لیٹی سستانے لگی۔ نہ جانے کس پہر آنکھ لگی تھی اور کس وقت سوئی تھی جب اٹھی تو سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ سانس بھی اکھڑ رہی تھی۔ کچھ لمحے لیٹی وہ اپنی سانس ہموار کرتی رہی پھر اپنے دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بستر پر بیٹھ گئی۔ نظریں اپنے دائیں طرف اٹھیں تو چند لمحے پلٹنا بھول گئیں۔ شاہ زر اس کے برابر ہی لیٹا بہت انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس پر سے نظریں ہٹا کر وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی پھر کمبل ہٹا کر بستر سے اتر کر کمرے میں موجود باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو شاہ زر اٹھ کر بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گزشتہ رویے کو برقرار رکھے ہوئے خاموشی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی موجودگی کو نظر انداز کرتی باہر نکلنے والی تھی۔

’’مشعال ! ادھر آئو۔ پلیز بات سنو میری۔‘‘ شاہ زر کی آواز سن کر وہ وہیں دروازے پر ہی رک گئی۔ دیوار تھام کر ٹیک لگاتے اس نے سہارا لیا۔

’’ہاں کہو۔ سن رہی ہوں میں۔‘‘ شاہ زر کے لہجے کی نرمی کو نظر انداز کیئے وہ دروازے کی چوکھٹ پر ہی جمی رہی۔ اس کے خیال میں شاہ زر کے لہجے میں نرمی تب ہی اترتی تھی جب کوئی مقصد پورا کروانا ہوتا تھا یا پھر مشعال سے اپنی بات منوانی ہوتی تھی۔ وہ ویسے ہی سرد نگاہوں سے دیکھتی رہی جبکہ جسم وہیں کھڑا رہنے کا متحمل نہیں تھا۔

شاہ زر خود ہی اٹھ کر اس کے پاس آگیا اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے آیا۔ بستر پر بٹھا کر خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ اس سے بات کرنے کے لئے الفاظ ترتیب دینے لگا۔ وہ خاموشی سے انگلیوں کو الجھائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی اس کے بولنے کی منتظر رہی۔

’’تم نے یہ کیوں کہا؟‘‘ کافی دیر بعد وہ بولا تو اس نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔

’’کیا کہا ہے میں نے؟‘‘ بہت سرد کٹیلے انداز میں اس سے پوچھا اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

’’تم نے سلیپنگ ٹیبلیٹس کیوں استعمال کیں؟‘‘ وہ سرد نگاہوں سے اس کے جھکے جھکے سر کو دیکھتی رہی۔ اس کی گزشتہ خاموشی کو محسوس کرتے اس کو توقع نہیں تھی کہ وہ یہ سوال کر جائے گا۔

’’اگر اپنے جھکے سر کا اندازہ لگا لیتے تو کبھی یہ سوال نہ کرتے‘ تم یہ سوال کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ کوئی اور بات کرنا چاہو تو کرو۔‘‘ اس نے اس کو ٹالنا چاہا۔ اندر تو کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔

’’نہیں... میں کوئی اور بات نہیں کر سکتا۔ خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو جانتی ہو کیا ہوتا۔‘‘ وہ سخت جھنجلا کر اسے دیکھنے لگا جو اپنی سرد نگاہوں سمیت بہت پر سکون لگ رہی تھی۔

’’ہاں جانتی ہوں کیا ہوتا۔ بس مر جاتی۔ کم از کم تمہاری یہ سونپی گئی غلامی واذیت کی زندگی گزارنے سے تو بہتر تھا کہ میں مر جاتی۔‘‘ وہ اب بھی بہت پر سکون انداز میں بولی تھی۔

وہ جو اپنے رویوں پر نادم تھا اس قدر لاپرواجواب سن کر اس کے اندر تو جیسے آگ ہی تو لگ گئی۔

’’تو پھر ایک ہی دفعہ ساری گولیاں کھا کر مر ہی کیوں نہ گئیں۔ پھر بھی زندہ ہو۔ عذاب مسلسل کی طرح۔‘‘ وہ بہت اپ سیٹ تھا۔ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ خود بھی نہ سمجھ پایا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ علم تو تب ہوا جب وہ اس کے الفاظ کی تردید کر رہی تھی۔

’’نہیں شاہ زر! تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ میں تم پر کبھی بھی عذاب مسلسل کی طرح مسلط نہیں رہی ہوں۔ میں نے تو خود کو ختم کر ڈالنے کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ یہ تو تم ہی تھے جس نے مجھے مرنے بھی نہیں دیا۔ کتنے ظالم ہو تم؟ نہ جانے کیسی نیچر کے مالک ہو تم؟ میں تمہیں ابھی تک نہیں سمجھ پائی۔ ابھی بھی تمہارے دل میں مجھے تباہ و برباد کرنے کی کوئی حسرت رہ گئی ہو گی۔ تم ایک ہی دفعہ مجھے مار کیوں نہیں ڈالتے۔ یہ ترسا ترسا کر مارنے سے

تمہیں آخر کیا حاصل ہو گا۔" بہت دکھ سے کہتے وہ رک گئی تھی۔ آنکھیں بند کر کے چند لمحے اپنی سانس ہموار کرتی رہی۔ "میں نے تو پوری کوشش کی تھی تم سے دور ہو جانے کی۔ تم چاہو تو ابھی سارے تعلق ختم کر ڈالو۔ میرے لئے تو یہ عین مسرت کا مقام ہو گا۔ دوسری صورت میں یہ سلیپنگ پلز آخری حد تو نہیں تھیں۔ خودکشی کے اور بھی کئی طریقے نکل آتے ہیں۔ اب میں موت سے نہیں ڈرتی کم از کم موت کی یہ اذیت تمہاری بخشی گئی اذیت سے ہزار درجے پر سکون ہے۔"

وہ بہت مطمئن انداز میں کہہ کر اسے دیکھنے لگی جو بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

"کیا ہوا شاہو! ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ یقین نہیں آتا تو ابھی عمل کر کے دکھا دیتی ہوں مگر یہ نہیں سنوں گی کہ میں عذاب مسلسل کی طرح تم پر مسلط ہوں۔ تم نے شاہ زر! ابھی عورت کی نفرت دیکھی ہی کب ہے؟ میں نے تو تم پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ میں چاہتی تو ماما پاپا کے ساتھ ساتھ بڑی امی کو سب بتا دیتی مگر نہیں شاہ زر جہانزیب! تم عورت کو کبھی نہیں سمجھو گے۔ اگر میں انہیں تمہارے وحشیانہ سلوک کے متعلق بتاتی تو تم بھی کبھی مجھے نہ روک پاتے۔ اب بھی اگر میں مر جاتی تو تب بھی تم پر الزام نہیں آنا تھا۔ اب بھی سارا قصور میرے حصے میں آنا تھا اور اگر میں دوبارہ کوشش کروں گی تو تم بھی نہیں جان پاؤ گے۔" وہ سفاک لہجے میں سب کہتی گئی۔ اس نے اس کو جان بوجھ کر "شاہو" کہا تھا۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا تھا۔

مگر زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ مشعال کے اندر اسے چپ سادھے دیکھ کر جیسے اطمینان اترنے لگا۔ وہ خود اذیتی کے ساتھ ساتھ اذیت پسندی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔

نہیں مشعال ! تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔‘‘ وہ آنکھوں میں نرمی سموئے اور لہجے میں پیار ’ ’ لئے اسے منع کر رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہنستی گئی۔ حتیٰ کہ آنکھیں جھل تھل ہوتی گئیں۔ ایک ایسا شخص اس کو یہ کہہ رہا تھا جس کے سامنے وہ کبھی رو رو کر گڑگڑائی تھی۔ جس سے اس نے بارہا رحم کی بھیک مانگی تھی۔ لیکن اس وقت تو یہ شخص نعوذ باللہ خدا بنا بیٹھا تھا۔ اور اب... استہزائیہ ہنستی ہنستے اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

آئی ایم سوری مسٹر شاہ زر جہانزیب ! میں تمہارا یہ بھیانک کھیل ختم کرنا چاہتی ہوں۔ ’ ’ میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور پلیز آئندہ تم اپنی یہ جھوٹی ہمدردیاں مجھ پر نچھاور مت کرنا۔ نہ ہی مجھے بچانے کی ناکام کوشش کرنا۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے وجود‘ میری بات‘ اور میرے انکار کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں لیکن خدا کے لئے اب مجھ پر رحم کرو۔ دن رات میں نے بہت سی تکلیف سہی ہے اور چند دن مجھے سکون سے گزار لینے دو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں میں عذاب مسلسل کی طرح تمہاری زندگی میں نہیں رہوں گی۔ آرام سے نکل جاؤں گی۔ میں بہت سکون سے مرنا چاہتی ہوں۔ تم جیسے قابل نفرت‘ وحشی‘ درندے انسان سے ہٹ کر دور ہو کر‘ تم نے مجھے بہت مایوس کیا۔ تم ایسے نہیں تھے تم بھی بدل گئے ہو۔ وہ جو ایک ”شاہو“ کہیں تھا وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ بھی مر گیا ہے۔

تم نے شاہ زر! اسے بھی مار دیا ہے۔ تم میری ساری خوشیوں کو مار دینا چاہتے ہو۔'' وہ عجیب سے لہجے میں سب کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں نفرت نہیں تھی اک عاجزی سی تھی جبکہ مشعال کی آنکھیں نفرت کی گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ پھر وہ زبان تک نہ ہلا سکا۔ کچھ کہنے کے لئے اب کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے کئے پر نادم تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا مگر اس کو بغیر معافی مانگے ہی سزا مل گئی تھی۔ اس نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کی منتظر رہی اسے بالکل خاموش دیکھ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ وہ بے بسی سے دروازے کے ہلتے پردے کو دیکھے گیا۔

☆...☆...☆...☆...☆...☆...☆

مشعال بیٹی! کیوں کیا تم نے ایسا؟'' شاہ زر کے گھر سے نکل جانے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سارہ اماں بھی اس کے لیے کھانا لیے چلی آئیں۔ کھانا کھا کر وہ جیسے ہی فارغ ہوئی اماں اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگیں۔ اس کی بات پر وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ شاہ زر کے سامنے جس قدر پرسکون و مطمئن تھی، علیحدگی میں اماں کے سامنے وہ اتنی ہی پریشان و مضطرب تھی۔ بے چینی سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس وقت اس کو کی برداشت جواب دے رہی تھی۔

پتا نہیں اماں! میں نے کیوں کیا؟ بس مجھے اس کے لفظوں نے بہت تکلیف دی تھی۔ وہ کہتا تھا میں بہت بے شرم و بے حیا ہوں۔ میں بہت گری ہوئی ہوں اماں! اس نے کہا کہ

اسے مجھ سے گھن آتی ہے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارے مگر اماں! وہ پاپا کی وجہ سے ایسا نہیں کر پا رہا تھا۔ اماں! میں بہت تنگ آچکی تھی۔ پہلے میں نے سب برداشت کیا لیکن اس کی باتوں کے بعد مجھے لگا اگر میں زندہ رہی تو وہ مجھے واقعی اپنے ہاتھوں سے مار دے گا۔ مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ بس ہر وقت یہی خیال رہتا کہ میں مر جاؤں۔ اماں! میں بہت بزدل ہوں۔ گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی نہ کر سکی لیکن اماں! گولیاں تو کھا سکتی تھی۔" بات کرتے کرتے وہ ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔

ایسے نہیں کہو مشعال بیٹی! شاہ زر برا نہیں ہے۔ بس ضد پر اترا ہوا ہے۔ بس صبر کر لو ‘ ‘ کچھ دن کی بات ہے۔ پھر وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کرے گا۔" اسے یوں بچوں کی طرح روتے دیکھ کر تسلی دیتے ہوئے اماں شاہ زر کا دفاع کرنے لگیں۔

نہیں اماں!... وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ وہ سائیکی کیس ہے۔ اسے مجھے اذیت دے کر ‘ ‘ سکون ملتا ہے۔ آپ کچھ نہیں جانتی ناں اسی لیے کہہ رہی ہیں۔ مجھ سے پوچھیں وہ کیا ہے؟ اس نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ کس احترام کا متقاضی ہوتا ہے وہ تو سرے سے جانتا ہی نہیں۔ وہ تو سراسر انتقام بنا ہوا ہے۔ اس نے مجھ سے شادی نہیں کی تھی‘ ایک جوا جیتا تھا۔ اماں وہ یہ کہتا ہے اور یہ سچ ہے۔ ہر رات جو میں نے اس کے ساتھ گزاری ہے‘ مجھے میری اوقات یاد دلاتی رہی۔ اگر وہ مجھے بیوی سمجھتا تو کبھی نہ کبھی اس کا دل اسے

ملامت کرتا۔ وہ شیطانیت کا لبادہ اتار کر انسانیت کی لاج رکھ لیتا۔ میں تو گری ہوئی ہی ہوں مگر اماں ! وہ جو میری نظروں سے گرا ہے کبھی اٹھ نہیں سکے گا۔ جتنی نفرت میں نے اس سے کی ہے شاید ہی کسی بیوی نے اپنے شوہر سے کی ہو۔ ہمارے درمیان تو میاں بیوی کا تعلق سرے سے تھا ہی نہیں۔ دنیا دکھاوے کو تو ہم میاں بیوی تھے' کاغذوں میں ہمارا نکاح ہوا تھا مگر میں تو ایک طوائف اور کال گرل سے بھی گئی گزری تھی۔ آپ نہیں جانتیں اماں ! اس نے کن کن الفاظ میں کس کس انداز میں مجھے میری اوقات یاد دلائی ہے۔ میں سب بھول سکتی ہوں مگر اپنی خودداری و نسوانیت پر لگائے جانے والے چرکے کبھی نہیں بھلا سکتی۔ آپ کو کیا پتا وہ کس قدر ”ظالم و سفاک انسان ہے۔

وہ اور شدت سے رو رہی تھی۔ اماں چپ کی چپ رہ گئیں۔ مشعال کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج اپنے دل کی ساری بھڑاس ان کے سامنے نکال دے۔ اپنا زخم زخم وجود ان کو دکھائے۔

’ ’کیا کیا ہے اس نے تمہارے ساتھ ؟” اماں اس کی بات سن کر چپ تو ہو گئی تھیں مگر اندر ہی اندر چونک گئیں۔ دونوں کا رویہ' لہجہ اور سلوک ان کے سامنے تھا لیکن اندر کی بات سے وہ بالکل بے خبر تھیں۔

’ ’اماں ! اس نے تو ظلم کی انتہا کر دی۔ میں بری نہیں تھی۔ اس نے مجھے بنا دیا۔ دیکھیں آپ وہ میرے وجود سے کیسے ظالمانہ و سفاکانہ طریقے سے کھیلتا رہا ہے۔ پھر بھی آپ کہتی ہیں ”وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ نہیں اماں ! وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو گا۔

روتے روتے وہ اپنے جسم سے کپڑا ہٹا کر اماں کو دکھانے لگی۔ اماں ایک نظر ڈال کر گم صم ہو گئیں۔ آنکھیں تو جیسے ساکت ہی ہو گئیں۔ مشعال کے جسم پر جگہ جگہ مار پیٹ کے نشان تھے۔ جگہ جگہ جسم جھلسایا گیا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

’’نہیں... وہ یہ نہیں کر سکتا... وہ سب کچھ کر سکتا ہے لیکن یہ کام کبھی نہیں...‘‘ وہ نفی میں متواتر گردن ہلاتی گئیں۔ شاید انہیں اپنی تربیت پر بہت اعتماد تھا۔

’’اماں! وہ یہ سب کرتا رہا ہے۔ یقین کر لیں۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ میں تنگ آ چکی ہوں اس کے اس وحشیانہ سلوک سے۔ میں اس سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔ چاہے کسی بھی طریقے سے، چاہے مر کر ہی سہی۔‘‘ شاہ زر اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ نہیں تو وہ اس سے ضرور باز پرس کرتیں۔ خاموشی سے بغیر کچھ کہے اور مشعال سے آنکھیں ملائے بغیر باہر نکل گئیں۔ پیچھے وہ کشن پر سر رکھ کر اپنی قسمت پر اور زیادہ رونے لگی تھی۔

ابیشا کے بعد اماں کے سامنے اس نے کچھ کہا تھا۔ دل کے زخم دوبارہ ہرے ہو گئے تھے۔ وہ اندر تک زخمی زخمی تھی۔ آنکھوں کا بہنا بھی بجا تھا۔

اگلے چند دن اس کے لیے نئی تبدیلی لے کر آئے تھے۔ شاہ زر کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا اور نرم ہو گیا تھا۔ اماں بھی ہر وقت اس کا خیال رکھنے کو ساتھ لگی رہتیں۔ ایک پل بھی اسے تنہا نہیں رہنے دیتی تھیں جب کہ وہ کسی بھی تبدیلی پر غور کیے بغیر ہر وقت اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ جی چاہتا تو اماں سے بھی بات کر لیتی ورنہ سارا دن چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ خود

سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوتا تو گھنٹوں غافل رہتی۔ اماں اسے اس حالت میں دیکھ کر بہت کڑھتی تھیں۔ حتیٰ کہ اس نے ایک لمحہ بھی شاہ زر کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کا روز بروز بدلتا رویہ بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرا پایا تھا۔

مشعال ! سونا نہیں؟ جاؤ جاکر سو جاؤ۔" رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ شاہ زر اپنے بیڈ روم میں جا چکا تھا۔ وہ خالی ذہن سے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے گھور رہی تھی۔ اماں کافی دیر سے اسے دیکھنے کے بعد اس کے اٹھنے کا ارادہ نہ دیکھ کر خود ہی اندر جانے کا کہنے لگیں۔ ایک منٹ کو اس نے ان کی پکار پر سر اٹھا کر دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر بیڈ روم میں آ گئی۔

شاہ زر اس وقت اپنی پوری توجہ فائلز کی جانب مبذول کیے ہوئے تھا۔ مشعال کی طرف سرسری انداز میں دیکھ کر دوبارہ فائلوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اپنی توجہ کتاب کی طرف رکھے مگر دل و دماغ میں ایک عجیب و غریب سی سرد جنگ شروع ہو گئی۔ وہ یکسوئی سے کتاب نہیں پڑھ پا رہی تھی۔ چند لمحے خود پر کنٹرول کرتی رہی۔ غصہ حد سے بڑھا تو کتاب زور سے بند کر دی۔ شاہ زر نے چونک کر اس کو دیکھا۔

وہ اس کی طرف دیکھنے کے بجائے بند کتاب کو گھور رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر اپنی فائلوں پر جھک گیا۔ شاہ زر مکمل طور پر اپنی فائلز کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی توجہ مشعال کی طرف نہیں تھی۔

مشعال نے اسے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر کمرے سے جانا چاہا تو شاہ زر چونکا اور اسے کندھوں سے تھام کر بستر پر بٹھانا چاہا تو وہ اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر پھٹ پڑی۔

''کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟ گھٹ گھٹ کر تو میں پہلے ہی مر رہی ہوں۔ تم ایک کام کرو۔ مجھے ایک ہی دفعہ مار دو۔ میں مر جانا چاہتی ہوں۔ اب کیوں نہیں مجھے مارتے... مار دو مجھے... اب بھی مار و نا...'' شاہ زر کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر وہ اپنے چہرے پر مارنے لگی تھی۔ اس نے ایک دم اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ وہ مشعال کو اس روپ میں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس قدر پر اعتماد لڑکی آج اس کے سامنے ڈانواڈول تھی۔ کبھی یہی تو اس کے دل کی اشد خواہش تھی مگر بجائے اب خوش ہونے کے وہ احساس جرم کی لپیٹ میں آگیا۔

''کیا کر رہی ہو تم؟ پلیز ادھر بیٹھو... لو یہ پانی پیو...'' اس نے جلدی سے سائیڈ پر رکھے جگ میں سے گلاس میں تھوڑا سا پانی انڈیل کر اس کی طرف بڑھایا جو بڑی دقت سے اپنی اکھڑی سانسوں سمیت اپنی ہچکیوں کو کنٹرول کر رہی تھی۔ مشعال نے ہاتھ مار کر گلاس پھینک دیا۔

''نہیں پینا مجھے پانی... ت... تم ایسا کرو... م... م... مجھے زہر پلا دو۔'' اس کا گریبان جھنجوڑتے ہوئے وہ عجیب سے انداز میں الٹا سیدھا بول رہی تھی۔ شاہ زر گم صم رہ گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔ وہ خود بخود اس کے ساتھ لگ گئی۔ اس کی یہ کیفیت بھی تو عجیب ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ دماغ بالکل چکرایا ہوا تھا۔

تم بہت برے ہو شاہو ! تم انسان نہیں درندے ہو۔ گوشت خور درندے۔ تم نے مجھے اس قدر اذیت دی ہے۔ خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا..." وہ اس کے سامنے اس کے ہی سلوک پر شکوے کر رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔ مگر اب شاہ زر یوں چپ تھا جیسے کبھی اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکالا ہو۔ اس نے اسے آہستگی سے خود سے جدا کیا اور بیڈ پر بٹھایا۔ وہ کافی دیر تک روتی رہی۔ شاہ زر بہت خاموشی سے ساتھ بیٹھ گیا۔

شاہو... !" کافی دیر روتے رہنے کے بعد اس کے کندھے کو چھوا تو وہ اسے دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور شاہ زر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ "شاہو ! تم مجھے چھوڑ دو۔" بہت اچانک اس نے کہا تھا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھایا۔ شاہ زر کو لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں سیسہ گھول کر ڈال دیا ہو۔ وہ بے یقین نظروں سے مشعال کو دیکھے گیا۔

کیا کہہ رہی ہو تم ؟" اس نے اپنے ہاتھوں کو مشعال کی گرفت سے کھینچنا چاہا لیکن نکال نہ پایا۔ وہ بہت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی۔

ہاں شاہو ! مجھے آزاد کر دو۔ طلاق دے دو مجھے۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ میں بہت بری ہوں۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔ تم خود یہی کہتے ہو ناں میں اچھی لڑکی نہیں ہوں، میرا کردار بھی اچھا نہیں ہے، تو پھر مان لو۔ میں بہت بدکردار ہوں، بے شرم و بے حیا۔ تم جیسے انسان کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ پلیز مجھے

طلاق دے دو۔ مجھے جانے دو۔ اگر تم نے مجھے یونہی اپنے ساتھ باندھے رکھا تو میں مر جائوں گی، گھٹ گھٹ کر، تمہیں مجھ سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میرے دل و دماغ نے تمہیں ابھی تک قبول نہیں کیا۔ پھر میں تمہارے ساتھ نبھا فکروں بھی تو کیسے؟ پلیز شاہو!...'' اس نے بات کا آغاز جس نام سے کیا تھا اختتام بھی اسی نام سے کیا تھا۔ شاہ زر اسے دیکھے گیا۔ بغیر کسی احساس اور جذبے کے۔ اس کے چہرے پر بہتے آنسوئوں پر نظریں جمائے رکھیں۔ اس نے بہت دنوں بعد اس کے چہرے پر وہی پرانا تاثر دیکھا تھا۔ چاندنی سے زیادہ پر نور، سورج کی نقرئی کرنوں سے زیادہ چمکتا دمکتا، چاند سے زیادہ روشن اور شفاف تاثر، آنکھوں سے گرنے والے آنسو صبیح و روشن پر نور چہرے پر تسبیح کے دانوں کی طرح ایک کے بعد ایک گرتے جا رہے تھے۔ اس کے سلکی آبشار ایسے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ملگجے پیرٹ کلر کے کپڑوں میں وہ سامنے قالین پر بیٹھی اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہا وہ اس اچھوتے دل کو چھو لینے والے تاثر کو اپنی انگلیوں سے چھو کر محسوس کرے۔ لیکن وہ رک گیا۔ مشعال نے آخر میں جس جذبے اور تڑپ سے اسے ''شاہو'' کہا تھا وہ اسی قدر تڑپ اٹھا تھا۔ اپنے دانتوں تلے ہونٹوں کو کچلا کہ ان سے خون رسنے لگا۔

'' پلیز شاہو! انکار نہیں کرو۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز شاہو! اپنی اس محبت کو یاد کرو جس نے کبھی تمہارے دل کے ایوانوں میں جگہ پائی تھی۔ پلیز مجھے چھوڑ دو۔'' وہ ایک ہی نام پر ایک ہی تکرار کیے جا رہی تھی۔ شاہ زر اس کے جڑے ہاتھوں کو دیکھ کر

رخ موڑ گیا۔ وہ اس کے یوں رخ موڑنے پر برداشت نہیں کر سکی تھی اور شدت سے رونے لگی۔

”تم بہت برے ہو...“ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔ ”میری بات مان کیوں نہیں لیتے۔ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نفرت کرتی ہوں تم سے، پھر بھی سب جانتے بوجھتے تم نے مجھے اپنی زندگی میں داخل کیا اور اب بھی تم مجھے خود سے نتھی رکھنے پر کیوں بضد ہو۔ چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے۔ کیا تمہیں بھی پاپا کی طرح زندوں سے زیادہ مردوں سے کیا گیا عہد پیارا ہے۔“ وہ فیصلہ چاہتی تھی ابھی اور اسی وقت، جب کہ شاہ زر کی مسلسل چپ اسے متوحش کر رہی تھی۔ وہ اس کے سابقہ رویوں کی پروا کیے بغیر اس کے سامنے ڈٹ کر جمی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھنے لگا۔ واقعی اس کی نگاہوں میں ایسی تو کوئی چیز نہیں تھی جو اسے اپنی سوچ پر مضبوط رکھتی۔ وہاں نفرت ہی نفرت تھی۔ لہجے میں بھی، الفاظ میں بھی اور آنکھوں میں بھی۔ وہ اس کی بہتی آنکھوں میں جھانکتا اسے سامنے سے ہٹا کر دروازے کی طرف لپکا۔

”نہیں شاہ زر...! ایسے نہیں... آج تم فیصلہ کر کے جاؤ گے... نہیں تو...“ مشعل نے فوراً آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔ وہ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ مشعل کے ”نہیں تو“ کے اندر چھپی ایک واضح دھمکی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس کا مظاہرہ بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ بے بسی سے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھانے لگا۔

مشعال پتھر کی دیوار بنی اس کے سامنے بدستور کھڑی اس کا ضبط آزما رہی تھی۔

مجھے کچھ سوچنے کا وقت دو۔" گہرے کنویں سے شاہ زر کی آواز آتی سنائی دی۔ ’ ’

کتنا وقت چاہیے تمہیں؟" وہ اپنی نظروں سے شاہ زر کا جائزہ لینے لگی۔ وہ سر جھکائے ’ ’ کھڑا تھا۔ اندازہ نہ کر پائی کہ اس کی بات میں کس قدر سچائی ہے۔

صرف ایک یہ رات اور دن، کل تمہیں اسی وقت جواب مل جائے گا۔" وہ سر اٹھا کر ’ ’ اسے دیکھتا بہت آہستگی سے کہہ کر کمرے سے فوراً نکل گیا۔

مشعال کے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ خود کو بستر پر گرا لیا۔ آنکھیں برس رہی تھیں۔ اندر باہر لگی آگ شعلے اگل رہی تھی مگر وہ اب مطمئن تھی۔ اس کا دل پر سکون تھا۔ شاہ زر قول کا پکا تھا، جو کہتا تھا ہر حال میں پورا کرتا تھا۔ آزادی کی ایک امید سی بندھنے لگی۔

ؤؤ...ؤؤ

مشعال! مجھے تمہاری بات قبول ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔" اگلی رات وہ کتنی دیر ’ ’ تک انتظار کرتی رہی کہ شاید شاہ زر کچھ کہے مگر اس نے تو جیسے ہونٹوں پر قفل لگا رکھا تھا۔ وہ صبح اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی گھر سے نکل گیا تھا اور پھر رات گئے لوٹا تو کسی سے بنا بات کیے سیدھا کمرے میں گھس گیا اور جب وہ رات گئے سونے کے لیے کمرے میں آئی تو وہ کچھ کاغذات پھیلائے بیٹھا تھا۔ کتنی دیر تک دونوں طرف سے خاموشی طاری رہی۔ شاہ زر نے

کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کے کچھ بھی کہنے کے آثار نہ دیکھ کر وہ بددل ہو کر لیٹ گئی تھی۔ شاہ زر بھی لائٹ آف کر کے ایک طرف لیٹ گیا۔ اور تب اندھیرے کو چیرتی شاہ زر کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔ وہ بے یقینی سے لیٹی رہی۔ پھر جب یقین ہو گیا کہ واقعی اس نے کچھ کہا ہے تو ایک دم اٹھ کر لائٹ جلالی۔

’’شاہو! ... ت ... تم ... سچ کہہ رہے ہو نا ...‘‘ فرط مسرت سے اس کی آواز لڑکھڑائی تھی۔ بے انتہا خوش ہو گئی۔ اسے تو گویا جیسے کسی نے نئی زندگی کی نوید سنا دی تھی۔ بے یقین نظروں سے شاہ زر کو دیکھنے لگی جو آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا ہوا تھا۔

’’ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا لیکن تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘ اپنی حالت بدلے بغیر وہ کہہ رہا تھا۔ وہ الجھ سی گئی۔

’’کہ ... کہ ... کیسا انتظار؟‘‘ اس کے ہکلانے پر شاہ زر نے بازو ہٹا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ مزید الجھ گئی۔ دل جو ایک لمحہ پہلے خوش ہوا تھا ایک دم پھر خوف کے حصار میں سمٹنے لگا۔ ایسا ہی خوف اس کی آنکھوں میں بھی چھا گیا تھا۔

’’میں چاہوں تو تمہیں ابھی فارغ کر دوں۔ میں جو ہمیشہ اپنی مرضی کرتا آیا ہوں اب بھی تمہیں بآسانی چھوڑ سکتا ہوں۔ لیکن مشعال یہ تو مجھے آج پتا چلا ہے یہاں پاکستان میں رشتے صرف دو انسانوں کے درمیان نہیں جوڑے جاتے بلکہ پورا خاندان شامل ہوتا ہے۔ آج ہی تو مجھے علم ہوا کہ کچھ پرانی اور نئی نسلوں کی بقا و ضمانت کے لیے ہمیں بعض اوقات اپنے دل کو مار

کر ایسے فیصلے بھی کرنا پڑتے ہیں جو ہمیں ہر گز قبول نہیں ہوتے۔ میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ جس طرح ہماری شادی بڑوں کی باہمی رضامندی سے انجام پائی تھی اسی طرح یہ ختم بھی ان کی مرضی سے ہو۔ اسی لیے آج میں نے چچا جان کو گاؤں فون کیا تھا۔ بہت چاہنے کے باوجود ان سے براہ راست کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ لیکن ان کی باتوں سے میں نے جو اندازہ لگایا ہے وہ میرے اس فعل پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ دوسری طرف آذر بھائی اور بڑی امی سے بھی بات کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ بلکہ دھمکیاں بھی دی ہیں۔ مجھے اپنی فکر نہیں، میں ہمیشہ سے ان رشتوں کے بغیر جیتا آیا ہوں۔ مگر شاید تمہیں کچھ مسئلہ ہو جائے۔ میں نے تمہیں زبان دی ہے۔ تمہیں بہت جلد چھوڑ دوں گا اور اس کے لیے تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ میں چاہتا تو ابھی فیصلہ کر دیتا ہوں۔ میرے لیے یہ مشکل نہیں ہے مگر یہ بات مت بھولو، چچا جان حویلی میں بیمار رہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی خبر اچانک ان تک پہنچی تو وہ شاید یہ خبر سہ نہ پائیں۔ خدانخواستہ انہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ان کی موت کا ذمہ دار میں بنوں۔" وہ بہت مدھم بغیر تاثر کے لہجے میں مخاطب تھا۔ اس کی اس انہونی بات پر وہ الجھ گئی۔ بات کا مقصد جاننے کے لیے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو وہاں بھی کوئی خاص تاثر دکھائی نہ دیا تھا۔ بالکل سپاٹ چہرہ تھا اور لہجہ تو اس سے سوا تھا۔

میں کچھ نہیں جانتی۔ تم غلط کہہ رہے ہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہیں مجھے ڈائی ’ ’ ”ورس دینا ہو گی۔

" مشعال! یقین کرو' میں مجبور ہوں۔ میں فی الحال یہ سب نہیں کر سکتا۔ ' '

کیوں نہیں کر سکتے۔ غلط کہہ رہے ہو تم۔ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ تم خود ہی ' ' نہیں چاہتے۔ تم ابھی بھی چاہتے ہو کہ مجھے ترسا ترسا کر مارو۔ ابھی تمہارا انتقام پورا ہی کب ہوا ہے۔ مجھ جیسی لڑکی یوں آرام سے تمہارے شکنجے سے نکل جائے' تمہاری انا پرست طبیعت کو گوارا ہی کب ہے۔" وہ اب بھی اس پر طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔ اب بھی اس پر چر کے لگا رہی تھی۔

ہاں نہیں پورا ہوا' میرا انتقام... نہیں چاہتا کہ میں تمہیں چھوڑوں۔ یہ صرف تمہارا اپنا ' ' فیصلہ ہے اور جو تمہیں میں نے کہا ہے یہ بھی سچ ہے' یہ صرف میرا اور تمہارا معاملہ نہیں ہے' جیسے منٹوں میں چٹکی بجائی اور سب فنش... نہیں مشعال! ابھی کچھ ٹائم لگے گا۔ یہ پورے خاندان کا معاملہ ہے۔ میں نے بہت سوچا' ہر زاویے پر غور کیا ہے۔ میں چچا جان کو بتائے بغیر بالا ہی بالا ان کو یہ تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ تم مانو یا نہ مانو وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں' یہ فیصلہ ان کے لیے کسی شاک سے کم نہیں ہو گا۔ پہلے ہی ان کی طبیعت خراب رہتی ہے' اب جب اچانک انہیں علم ہو گا تو نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں' پلیز میرا اعتبار کرو۔ جب بھی مجھے اندازہ ہو گیا کہ چچا جان میرے اس فعل سے ہرٹ نہیں ہوں گے تو میں تمہارے کہے بغیر ہی سب تعلق توڑ لوں گا۔ تمہیں اپنے نام سے علیحدہ کر دوں گا۔ کاغذات میں نے تیار کروا لیے ہیں' بس سائن کرنا باقی ہیں۔" مشعال کے طنز نے جس طرح اسے

مشتعل کر دیا تھا' اتنے ہی غصے میں وہ بولا تھا لیکن آخر میں بہت متحمل لہجے میں اس کا انداز سمجھانے والا تھا۔ وہ اس کی ساری بات سن کر بے دلی سے لائٹ آف کر کے دوبارہ لیٹ گئی۔ دل جو پرسکون ہوا تھا۔ وہ ایک نئی بات سن کر پھر اندر ہی اندر مچلنے لگا۔

''سنو! تمہیں کتنا وقت لگے گا پاپا کو راضی کرنے میں۔'' وہ اندھیرے میں اس سے پھر مخاطب ہو گئی۔ شاہ زر جو اپنے ہی خیالوں اور سوچوں میں غلطاں تھا' اندھیرے میں اس کی آواز سن کر چونکا۔

''پتا نہیں۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ شاید چند دن' مہینہ یا پھر... یا پھر۔'' کہہ کر وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

''نہیں... میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتی۔ جو کچھ کرنا ہے صرف ان چند دنوں میں کرو۔'' زیادہ سے زیادہ میں صرف ایک ماہ انتظار کر سکتی ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

''ہوں...'' شاہ زر کی ڈوبی آواز ابھری تو وہ کوفت زدہ ہو کر پھر رونے لگی۔

ایک رہائی کا پروانہ مل رہا تھا اور وہ بھی قسطوں پر۔ وہ پریشان نہ ہوتی تو پھر کیا کرتی۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نیند تو آنکھوں کی دہلیز سے کوسوں دور تھی۔

ۇۇ...ۇۇ

اگلا دن اس کے لیے بہت ہی خوشگوار اور انوکھا تھا یا پھر اسے یہی لگا تھا۔ رات کافی دیر تک جاگتے رہنے کے باوجود اگلے دن اس کی آنکھ منہ اندھیرے ہی کھل گئی تھی۔ شاہ زر کی بات پر تفکرات میں گھرنے کے باوجود مطمئن اور آسودہ تھی۔

کیا بات ہے ‘آج بہت خوش ہو؟’’ سارا دن خلاف معمول اور خلاف توقع وہ چہکتی اور خوش رہی تھی۔ اماں سے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھیں۔ اس نے بے اختیار مسکراتے ان کے گلے میں دونوں بانہیں ڈال دیں۔

ہاں اماں! واقعی آج میں بہت خوش ہوں۔ پتا ہے شاہ زر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ’’وہ مجھے ڈائی ورس دے دے گا۔

یہ کیا بلا ہوتی ہے؟’’ مشعال کی بات اماں کے بالکل پلے نہیں پڑی تھی۔ مشعال ان کا سوال سن کر ہنس دی۔

اماں! یہ کوئی بلا ولا نہیں ہوتی بلکہ ڈائی ورس کا مطلب ہوتا ہے طلاق دے دینا اور شاہ ’’زر مجھے طلاق دے دے گا۔

کیا؟’’ اماں آنکھیں پھیلاتیں حیرت و بے یقینی سے گنگ رہ گئیں۔

کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟’’ اماں یقین کرنے کو تیار نہیں تھیں جب کہ مشعال ان کی حیرت کو سمجھے بغیر بہت مسکرا رہی تھی۔ کھلکھلاتی آواز میں اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔

‘‘اماں! اب میں شاہ زر کی پہنچ سے بہت دور چلی جائوں گی۔ وہ اب مجھے کبھی بھی کوئی تکلیف نہیں دے سکے گا۔ اور میں... یقین کریں اماں! میں بہت خوش ہوں۔ اس سزا یافتہ قیدی سے بھی زیادہ جسے پھانسی کے تختے پر عین اس وقت اذن رہائی ملا ہو جب وہ بالکل ناامید ہو چکا ہو۔ اور میں اماں! اپنی اس رہائی پر بہت خوش ہوں۔‘‘ ان کے گلے لگے وہ خود ہی بولتی جا رہی تھی۔ اماں اسے خود سے علیحدہ کر کے بغور چہرہ دیکھنے لگیں جہاں انہیں سوائے خوشی کے کوئی اور تاثر نہیں ملا تھا۔

‘‘کیا شاہ زر واقعی تمہیں چھوڑ دے گا، طلاق دے دے گا؟‘‘ جھجکتے ہوئے مشعل سے سوال کیا جو ان کی بات سن کر خود سے الجھ سی گئی۔

‘‘کیوں نہیں دے گا اماں! اسے مجھے طلاق دینا ہو گی۔ نہیں تو میں زمین و آسمان ایک کر دوں گی۔ خود تو میں مروں گی ہی لیکن زندہ وہ بھی نہیں رہے گا۔‘‘ اٹل لہجے میں بغیر کسی خوف کے حصار میں آئے کہنے لگی۔ اماں نے ایک گہری سانس سینے سے خارج کی۔

‘‘شاہوں کے خاندان میں آج تک کسی نے کسی کو طلاق نہیں دی۔ جو لڑکی جس کی امانت ہوتی ہے، ساری عمر اسی کے نام پر گزارتی ہے، چاہے بیوی کے ساتھ شوہر اچھا سلوک کرے یا نہیں۔ ہر حال میں اسے ساری عمر اسی کے ساتھ گزارنا ہوتی ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ تم طلاق لے رہی ہو۔ شاہ زر کبھی بھی ایسا نہیں کرے گا۔ خاندانی ریت و رواج کے معاملے میں وہ کبھی بھی کسی کی نہیں سنتا۔ کبھی شاہوں کی روایتوں کو نہ توڑے گا اور تم خود عقل مند ہو،

ہوش کی دوا لو اور عقل مندی سے سوچو تو اس مسئلے کا حل طلاق تو نہیں ہے۔ شاہ زر بہت بدل گیا ہے۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا' اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور جب انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو مخالف کو بھی چاہیے کہ اسے معاف کر دے۔ مشعال بیٹی! تم بھی شاہ زر کو معاف کر دو لیکن اتنا بڑا قدم نہ اٹھاؤ۔ سارا خاندان اجڑ کر رہ جائے گا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔"

لیکن اماں! میں مانتی ہوں سب مگر میری اپنی ذاتی پسند ناپسند بھی ہے۔ آپ سب جانتی ہیں' میں نے اپنی خوشی سے اس سے شادی نہیں کی تھی اور میں اس کے ساتھ رہنا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے ہر حال میں طلاق چاہیے۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس خاندان میں پہلے کسی عورت کو طلاق ہوئی ہے یا نہیں مگر اب ہو گی۔ ضروری تو نہیں ہر غلط رسم و رواج کی ہم پاسداری کرتے چلیں۔ بات شاہ زر کی ہوتی تو شاید میں کچھ سوچ بھی لیتی مگر اماں یہاں بات اس غلط سوچ کی ہے کہ اس خاندان میں کبھی کسی عورت کو طلاق نہیں ہوئی۔ عورت ملکیت تو نہیں' نہ ہی بھیڑ بکری' بھینس ہے جسے ہمیشہ اپنی ملکیت سمجھ کر ناروا سلوک کرتے رہیں۔ تایا جان نے شاہ زر کی والدہ کے ساتھ کب اچھا سلوک کیا تھا۔ وہ بھی انہی کا بیٹا ہے۔ ایک غلط سوچ نے اس کے دماغ میں گرہ باندھ دی ہے۔ اپنی محرومیوں کا بدلہ دوسروں کو اذیت پہنچا کر لے رہا ہے۔ اماں! بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اس شخص سے طلاق لوں گی۔" وہ سب بہت صاف اور کھرے لہجے میں کہہ گئی تھی۔ اماں اس کا غصہ دیکھ کر چپ

رہیں۔ اس وقت ان کا مشعال کو کچھ بھی سمجھانا دیوار سے سر پھوڑنے کے مترادف تھا مگر وہ دل ہی دل میں پریشان ہو گئی تھیں۔ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ کس طرح سمجھا بجھا کر دونوں کو اس فعل سے باز رکھیں جس کی لپیٹ میں سارا خاندان آ جانا تھا۔ شاہ زر توان کی بات سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا جبکہ مشعال سرے سے کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

دونوں کے تعلقات دن بدن کشیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ اب جوان چند دنوں میں انہیں شاہ زر کا اچھا رویہ اور شرمندگی دیکھ کر کچھ سکون ملا تھا' اب وہ سکون مشعال کی اس نئی بات نے ختم کر دیا تھا۔

ؤؤ...ؤؤ

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے کوئی دسویں مرتبہ اپنا جائزہ لیا تھا۔ اس کا حسن ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ گہرا پرپل کلر جس پر ہم رنگ موتیوں کا بہت ہی نفیس سا کام تھا۔ مکمل بازو جن کی کہنیوں تک درمیان میں کٹنگ ہوئی تھی۔ موتیوں کی لڑیوں سے سجے اس کے خوبصورت سفید' صحت مند بازوؤں کو اور بھی دلکش روپ دے رہے تھے۔ پورا ڈریس ہی اس کے ذرا قد و قامت والے سراپے کی اچھی خاصی زینت بڑھا رہا تھا۔ عام حالات میں تو وہ شلوار قمیص بحالت مجبوری ہی پہنتی تھی۔

جب تک گاؤں میں تھی صرف شاہ زر کی موجودگی میں شلوار قمیص سے کام چلایا تھا پھر بعد میں وہ اپنی روٹین کے لباس پر آ گئی تھی اور اب جب سے وہ شاہ زر کے ہمراہ لاہور آئی ہوئی تھی'

صرف شلوار قمیص ہی پہن رہی تھی اور خاص طور پر جدید تراش خراش اور اسٹائل سے بنا یہ سوٹ جسے پہن کر وہ شاہ زر کے ہمراہ اس کے ڈی سی صاحب کے گھر دعوت پر گئی تھی اور اس دن سب کے ساتھ ساتھ شاہ زر نے بھی اس کی بہت تعریف کی تھی اور وہ تعریف اگرچہ طنز و تمسخر کے لبادے میں کی گئی تھی مگر اس کے باوجود اسے بذات خود یہ لباس بہت ہی زیادہ پسند آیا تھا۔

آج جب تیار ہونے کے لیے اس نے وارڈروب کا جائزہ لیا تو نظر سب کپڑوں سے ہوتی ہوئی صرف اسی ایک سوٹ پر ہی جم گئی تھی اور اس وقت وہ یہ سوٹ پہنے خود کو بار بار آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ سوٹ اور اس کے کلر نے اس کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ ہمراہ بڑا سا دوپٹہ شانوں کو ڈھانپتا اور پھر پھسل کر دوبارہ بازوؤں میں جھولتا اس کے حسن کو اک نئی انوکھی نرالی چھب عطا کر رہا تھا۔ کپڑوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد خود کو مزید سنوارنے کے لیے میک اپ کا استعمال بھی کرنے لگی۔ ابھی اس نے صرف ایک ہی آنکھ کی آئی شیڈ مکمل کی تھی' جب شاہ زر کمرے میں داخل ہوا۔ اسے بہت عرصے بعد یوں اہتمام سے تیار ہوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دیکھ تو اس نے بھی لیا تھا ایک نظر ڈال کر دوسری آنکھ کا میک اپ مکمل کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ آئینے میں دکھائی دیتے شاہ زر کے وجود کو بھی دیکھے گئی۔

آج وہ روٹین سے ذرا ہٹ کر جلدی گھر لوٹ آیا تھا ورنہ رات دس گیارہ سے پہلے وہ اب گھر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اپنے میک اپ کو آخری ٹچ دے کر میک اپ کٹ بند کر کے دراز میں

رکھی اور برش سے اپنے بالوں کو سیٹ کرنے لگی۔ سامنے سے بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ نکال کر انگلی پر لپیٹ کر چھوڑ دی تو وہ چہرے کے ارد گرد جھولتی اس کے رخسار کو چومتی ایک جگہ جامد و ساکت ہو گئی۔

آخری بار آئینے میں اپنا ایک بھرپور جائزہ لے کر پلٹی تو بستر پر آڑے ترچھے لیٹے شاہ زر کو مکمل طور پر اپنی طرف متوجہ پایا۔ ایک سیکنڈ کو نہ جانے کیوں جھجک سی گئی۔ مشعل کے دیکھ لینے پر بھی اس نے اپنی نظروں کا زاویہ نہیں بدلا تھا بلکہ اس نے ان آنکھوں میں ایک عجیب سی لپک محسوس کی تھی۔ آنچ دیتی ہوئی، کلام کرتی ہوئی، اندر باہر ایک آواز لگاتی ہوئی۔ اس کی نگاہوں کی تپش سے گھبراتے وہ بے اختیار نظر چرا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ جوتا پہن کر اسٹریپ بند کرنے لگی۔

”کہیں جارہی ہو؟“ آج بہت دنوں بعد شاہ زر نے اس کو خود سے مخاطب کیا تھا۔ وہ چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”ہوں... جولف کے ساتھ باہر ڈنر کا پروگرام ہے۔ وہیں جارہی ہوں۔“ سر جھکا کر دوبارہ دوسرے جوتے کا اسٹریپ بند کرنے لگی۔ شاہ زر نے اس کا جواب سن کر ہونٹوں کو بری طرح دانتوں تلے کچلا کہ زبان مضبوط قلعے میں ایک قیدی کی طرح بلبلا کر رہ گئی مگر اسے فریاد کرنے کا حق حاصل نہ ہوا تھا۔

شاہ زر ایک زہریلی مسکراہٹ ہنستے ہوئے بری طرح آنکھیں میچ گیا مگر بند پلکوں کے ادھر آنکھوں کی زمین پر اس قتالہ حسن کا خوب صورت سراپا پوری آن بان کے ساتھ آباد ہوا۔ آنکھیں کھولے بغیر ہی اس نے منہ تکیے میں چھپالیا۔

وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو جسے وہ ہر لمحہ صرف اور صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے لہراتا رہا ہے خود اسی کے ہاتھوں اس بری طرح ہار جائے گا کہ کسی سے کوئی شکوہ بھی نہیں کر سکے گا۔ زبان رکھنے کے باوجود فریاد کرنے سے محروم رہے گا۔ اور دل وہ بے چارہ الگ بے حال تھا۔ وہ جو خود کتنی نظروں کی طلب تھا' کتنے دلوں کی دھڑکن تھا' جس نے خود آج تک کسی لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دل نے شکست بھی کس سے کھائی تھی' صرف اسی ایک لڑکی سے جو گزشتہ چند سالوں سے اس کی نظروں میں کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ جسے چند ماہ پہلے سامنے دیکھ کر سارا خون آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ جس کے لیے صرف ایک ماہ پہلے ہی تو رگوں میں خون کے بجائے غصہ و انتقام گردش کرنے لگتا تھا۔ وہی لڑکی جسے مسل دینے کو ہاتھ ہمہ وقت بے چین رہتے تھے' طرح طرح کے شیطانی خیالات دل و دماغ کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے تھے... اور وہ دل و دماغ کی مانتے مانتے ہر حد پار کرتا گیا۔ یہ تک نہ سوچا کہ سامنے والا بھی انسان ہے۔ گوشت پوست سے بنا وجود اسے بھی تکلیف ہوتی ہو گی۔

سوچا تھا تو صرف اتنا کہ وہ لڑکی اس کی دسترس میں ہے، فکر تھی تو صرف اتنی کہ یہ مغرور و حسین، بے بس و مجبور سی لڑکی اس کی مردانگی و انا اور خودداری کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ایک کھلا چیلنج۔ اس کی مغرور انا، نسوانیت اور غرور کی ردا میں لپٹی خودداریت کو کچلنا ہی اس کی اپنی ذات کے لیے باعث افتخار اور مردانگی و غیرت و وقار کی علامت ہے۔

یہ سب کچھ کر گزرنے کے باوجود اب اس کے اپنے ہاتھ میں کیا آیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ صرف ایک سسکتا و بلکتا ہوا جذبہ، انا و مردانگی کی جنگ میں شکست خوردہ پاش پاش دل۔ وہ دونوں ہاتھوں سے خالی تھا۔ سزا کے طور پر دہلیز دل پر درد کا ایک ایسا صحرا آباد ہو گیا تھا جسے اب ساری عمر پیاسا ہی رہنا تھا۔ جس کی قسمت میں سیراب ہونا تو لکھا تھا مگر اس کی اپنی سیاہ کاریوں کے سبب دل کی زمین بالکل بنجر ہو گئی تھی۔ بالکل ایک بے آب و گیاہ صحرا کی طرح۔ اس صحرا میں دکھ و رنج کی بوندیں تو گرتی ہیں مگر پچھتاوں کی خشک زمین میں جذب ہو کر اسے مزید پیاسا بنا دیتی ہیں۔

اس کا دل اسے عین اس لمحے دغا دے گیا تھا جب وہ خود اپنی طاقت فتح کے نشے میں چور چور اس بے بس و لاچار سی لڑکی کو بکھیرنے کی دھن میں سوار مست و غرق تھا۔ اب تو ضمیر ہر وقت احساس جرم کے کچوکے ہی لگاتا رہتا تھا۔ اس قدر لعنت و ملامت کر چکا تھا کہ اب اسے اپنے وجود و شکل سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اسی وجود کے زعم میں وہ وحشت پر اتر آیا تھا۔ اخلاقیات کے قاعدوں کو بھلا ڈالا۔ انسانیت سوز سلوک برتتا رہا۔ یہ کیسی نفرت تھی جو اسے

خود سے ہو گئی تھی۔ مشعال جو اس سے نفرت کرتی تھی وہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی، بہت کم تھی۔ اس نے تو طلاق کا مطالبہ کر کے اسے کچھ رعایت دے دی تھی مگر اس کے لیے سب سے بڑی سزا تو ضمیر کی آواز ہی تو تھی۔ وہ آواز جس کے کوڑے اسے بری طرح پشیمانی و پچھتاوں کے کھنڈرات میں دھکیلتے جاتے تھے اور وہ اس سزا کے ہاتھوں ہر روز بری طرح کٹھرے میں کھڑا ہوتا تھا۔ اس نے یہ سب کرتے کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ ذہن میں ایک دفعہ سوچ نہیں ابھری تھی۔ دل میں ایک بار بھی خیال نہیں آیا تھا۔ جسم ایک لمحے کو بھی نہیں لرزا تھا کہ اپنے شکنجے میں جس بے بس و مظلوم لڑکی کے بدن کو سگریٹ کے شعلوں سے جلا جھلسا کر جو تسکین و خوشی حاصل کرتا رہا ہے، وہ خوشی اور تسکین ایک دن اس کے اپنے لیے بھی باعث عذاب ہو گی۔ وہی تکلیف جو وہ اس کو دیتا رہا تھا وہ اپنے بدن میں بھی محسوس کرے گا۔ وہی آنسو جو اس لڑکی کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کے اندر ٹھنڈک سی پڑتی تھی وہی پانی کے قطرے اپنی آنکھوں میں آگ کے الاؤ کی طرح دہکا کریں گے۔ وہی دل کو صرف ایک لمحے کو مسرور کر دینے والی ٹھنڈک، اسے ہر روز شعلوں اور نہ دکھائی دیتے دہکتے انگاروں پر گھسیٹا کرے گی۔

مشعال کے ساتھ یہ سب سلوک کرتے، اسے آنسوؤں کی دنیا میں رہنے پر مجبور کرنے کے باوجود وہ ایک رات بھی پر سکون ہو کر نہیں سویا تھا۔ اسے اذیت دے کر وہ وقتی سکون و تسکین حاصل کر تو لیتا تھا لیکن بعد میں بہت بے چین و مضطرب ہو جاتا تھا۔ کبھی خیال ہی نہ کیا

کہ یہ بے چینی و بے سکونی کیوں ہے۔ شیطان نے اس بری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا کہ وہ اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھا تھا۔

احساس جرم کی پہلی دستک تو دہلیز دل پر اسی دن ہو گئی تھی جب مشعال کا اجڑا اجڑا روپ نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ اس دن اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ اندر سے مسلسل بے چین تھا۔ پہلی بار دل کے اندر یہ احساس جاگا کہ وہ اپنی سب سے قیمتی متاع حیات کو دھیرے دھیرے آگ لگا رہا ہے۔ خود اپنے ہاتھوں سے اسے موت کا راہی بنا رہا ہے۔ اس دن پہلی دفعہ اپنے تلخ لفظوں، جملوں، رویوں اور ناشائستہ بلکہ وحشیانہ سلوک پر ندامت ہوئی تھی۔ پہلی دفعہ پیشانی عرق ندامت سے تر ہو گئی تھی۔ پہلی بار اپنے غلط ہونے کا احساس ڈسنے لگا۔

دوسری دستک نے اس کے جسم سے جان تب نکالی جب مشعال کا خواب آور دوا کھانے کا واقعہ علم میں آیا تھا۔ اس رات جب اماں نے اسے اس کا اپنا بھیانک چہرہ آئینے میں دکھایا تو مشعال کے وہ تمام جملے، وہ تمام القابات، وہ تمام باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں جو وہ وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں کہتی رہتی تھی... جنہیں کبھی وہ اپنے لیے چیلنج سمجھتا تھا۔ اس دن ان پر ندامت ہوئی۔ اپنی بے اعتنائیاں و بدسلوکیاں گہری قبر میں زندہ در گور کرتی گئیں۔ اس رات وہ یہی سوچتا رہا کہ انسانیت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ نے اسے ایک نرم و نازک مگر بے بس سے وجود کا نگہبان بنایا تھا اور اس نے اسی متاع عزیز کو تباہ کر ڈالا۔ وہ تو شکر ہوا کہ بروقت

ابیشا کی فون کال کی وجہ سے معاملہ سنگین نوعیت اختیار کرنے سے پہلے ہی اس کے علم میں آگیا تھا اور اسپتال لے جانے پر وہ بچ گئی تھی۔

بعد میں دہلیز دل پر جو بچا تھا وہ ایک ایسا جذبہ تھا جو اس کے دل میں برسوں سے پنپتا چلا آرہا تھا۔ وہ خودرو پودا اس کی سوچ و دماغ کی دین نہیں تھا بلکہ وہ جذبہ عطیہ خداوندی تھا جو اس کے دل میں خود بخود پیدا ہوا تھا۔ اس دن جب مشعال پیدا ہوئی تھی اور آغا جان نے اسے ہاتھوں میں اٹھا کر شاہ جہانزیب کی جھولی میں ڈال دیا تھا' اسے ان کے الفاظ اب بھی اچھی طرح یاد ہیں۔

کمال اور جہانزیب ! یہ مشعال میرے شاہ زر کی دلہن بنے گی۔ تم دونوں ذہن میں رکھنا۔"

اور پھر ان دونوں نے جو یاد رکھا سو رکھا مگر وہ خود کبھی نہیں بھولا تھا۔ بڑے ابا کے الفاظ اس کے ذہن میں گردش کرتے رہتے تھے۔ اس بات کا احساس اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہا تھا۔ شعور کی منزل میں قدم رکھتے ہی اسے اپنے اور مشعال سے بندھے رشتے کا پوری شدت سے احساس دل و روح میں چٹکیاں کاٹنے لگا تھا۔ کتنی آسودگی ملتی تھی اس خیال سے کہ وہ سب سے مختلف' سب سے حسین دکھنے والی' الہڑ' ضدی اور کچھ کچھ مغرور سی مشعال صرف اس کی ہے۔ بعد میں محبت نے ایسی لگن لگائی کہ وہ سر تا پا اس کا دیوانہ بن گیا تھا۔ اس سے لڑنے کے باوجود اس کی ہر بات مان جاتا تھا۔ وہ غلط کہتی تو فوراً ساتھ دینے کو تیار ہو جاتا تھا۔ وہ اس کی آنکھ میں

آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت خاص اور اہم تھی۔ اور پھر وہ اس کے پاکستان سے چلے جانے کے باوجود اس کے خواب دیکھتا تھا۔ اپنی ہر سوچ صرف اسی ایک ہستی تک جا کر ختم ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ اور پھر ایک دن اس کے خوابوں کا حسین تاج محل مشعال کے صرف ایک انکار نے پاش پاش کر دیا تھا۔

شاہ زر پلیز! میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ پہلے تو میں نے ماما پاپا کی وجہ سے انکار کیا ’ ’ ”تھا لیکن اب میں اپنی وجہ سے انکار کرتی ہوں۔ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔

اسے آج تک اس کے یہ الفاظ یاد تھے جنہوں نے اسے کتنی دیر تک ساکت و جامد کیے رکھا تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون اس کے لبوں سے کسی اور کے لیے پسندیدگی کے الفاظ سن کر منجمد سا ہو گیا تھا۔ گویا کائنات جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔

وہ پہلے بھی فون کر کے انکار کر چکی تھی۔ ای میلز میں بھی وہ اکثر اس رشتے سے عدم وابستگی کا اظہار کرتی رہتی تھی مگر اس نے کبھی بھی اس بات کو گہرائی سے نہیں لیا تھا کیونکہ وہ جس دس سالہ مشعال کو جانتا تھا وہ صرف شاہ زر کی آنکھوں کی وارفتگیوں سے ہی حیا کے سارے رنگ اوڑھ لیتی تھی۔ جو مغرور، ضدی اور اکھڑ ضرور تھی مگر بے وفا نہیں تھی۔ اس نے کبھی بھی لفظوں سے اظہار نہیں کیا تھا لیکن دونوں جانب سے دل میں ایک خاموش عہد تو ضرور تھا۔ پھر یہ احساس بھی کہ اگر وہ برطانیہ جا کر بدل بھی گئی تو اس کے اندر خاندانی فیصلوں کو چیلنج

کرنے کی طاقت کبھی پیدا نہیں ہو گی۔ اسے ہر حال میں اسی کے پاس آنا ہے۔ مگر مشعال نے تو حد کر دی۔ نہ صرف انکار کر دیا بلکہ کسی اور کو اپنے اور اس کے درمیان لا کھڑا کیا۔

کون ہے وہ؟ وہی تمہارا خالہ زاد۔" کسی اور کے بارے میں جان کر ایک تلاطم برپا ’ ’ ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا شاہ کمال سے اسے ہر خبر ملتی رہتی تھی۔ چچی کی ناپسندیدگی بھی واضح تھی۔ مشعال کا گریز بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح باخبر تھا کہ عصمت بیگم مشعال کا رشتہ اپنے بھانجے سے کرنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے بہت غصے سے اس دن اس نے اس سے پوچھا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ جس لڑکی کو دل میں سب سے اونچے مقام پر بٹھا کر پوجا کرتا ہے وہ اسے یوں بری طرح ریجیکٹ کر دے گی، اسے یوں دھکا دے دے گی

کون ہے وہ؟ وہی تمہارا خالہ زاد۔" کسی اور کے بارے میں جان کر ایک تلاطم برپا ’ ’ ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا شاہ کمال سے اسے ہر خبر ملتی رہتی تھی۔ چچی کی ناپسندیدگی بھی واضح تھی۔ مشعال کا گریز بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح باخبر تھا کہ عصمت بیگم مشعال کا رشتہ اپنے بھانجے سے کرنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے بہت غصے سے اس دن اس نے اس سے پوچھا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ جس لڑکی کو دل میں سب سے اونچے مقام پر بٹھا کر پوجا کرتا ہے وہ اسے یوں بری طرح ریجیکٹ کر دے گی، اسے یوں دھکا دے دے گی۔

نہیں... مجھے ایاز (مشعال کے کزن کا نام) سے کوئی غرض نہیں اور نہ ہی میں اس سے ’ ’ شادی کروں گی۔ میرا ایک دوست ہے جولف۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس نے مجھے پرپوز کیا ہے

اور میں نے اس سے شادی کے بارے میں سوچ لیا ہے۔ ماما پاپا نہیں مان رہے' پلیز تم انکار کر دو۔" دوسری طرف وہ اس کے برسوں کے جذبات کی پرواکیے بغیر انتہائی سفاک و کرخت لہجے میں سب کہہ گئی تھی۔ اس کے منہ سے ایک عیسائی کا نام سن کر اسے پہلی دفعہ مشعال سے بہت نفرت محسوس ہوئی تھی۔ پہلی دفعہ اسے مشعال کی ضدی' اکھڑ' مغرور نیچر پر بے انتہا غصہ آیا تھا۔

''سوری... میں انکار نہیں کروں گا۔ تم شاید بھول رہی ہو کہ تم سے میری نسبت بچپن سے طے ہے اور یہ بات آغا جان نے طے کی تھی۔ ان کے بعد میں کبھی بھی نہیں چاہوں گا کہ ان کا فیصلہ رد ہو۔ اور پھر یہ ہمارے خاندان کے اصولوں اور رسم و رواج کے قطعی خلاف ہے۔ تمہاری ہر حال میں مجھ سے ہی شادی ہو گی۔" اس دن اس نے پہلی دفعہ مشعال سے بالکل جاگیر داروں والے لب و لہجے اور تحکم میں بات کی تھی۔ پہلی دفعہ وہ محبت کو بھول کر خاندانی وقار کی بات کر رہا تھا۔ پہلی دفعہ اس کے اندر شاہ جہانزیب کا بیٹا ہونے پر کوئی ندامت نہیں ہوئی تھی۔ جواباً وہ اس سخت لب و لہجے پر مشتعل ہو گئی تھی۔

''تم اور تمہارا خاندان... تم یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میں مر تو سکتی ہوں مگر تم سے کبھی شادی نہیں کروں گی اور پھر تم کس خاندان کی بات کرتے ہو۔ کن رسم و رواج اور فیصلوں پر تم فخر کر رہے ہو۔ ذرا اپنی اوقات تو یاد کرو۔ اپنا موازنہ تو کرو۔ وہی تمہارا خاندان ہے ناں' وہی خاندان تمہارا اور تمہاری والدہ کا ہے جو رسم و رواج اور ریتوں کو توڑنے میں

مشہور ہے۔ تم بھی ویسے ہی ہو۔ ایک تاوان میں آئی ہوئی ماں کے بیٹے۔" مشعال کے ساتھ ملکوں نے جو کچھ کیا تھا اس نے اسے ایک زخمی ناگن بنا دیا تھا۔ وہ اندر تک زہریلی ہو گئی تھی۔ ملکوں سے خاص طور پر ملک ایاز سے اس کی نفرت کی تو کوئی حد نہیں تھی۔ وہ نفرت کی انتہا تک جا سکتی تھی مگر اس حد تک بھی چلی جائے گی اسے امید نہیں تھی۔

شٹ اپ مشعال... آئی سے شٹ اپ..." اس کا ایسا للکارتا جواب سن کر وہ بے قابو ہو گیا تھا۔ پھر اس نے فون ہی بند کر دیا تھا۔

اسے ہر اس شخص سے نفرت تھی جو اسے اس کی ماں کا حوالہ دیتا' خاندان کا طعنہ دیتا تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی ملکوں سے کبھی کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا حتیٰ کہ یہاں لاہور میں جب وہ تعلیم حاصل کرنے آیا تھا تو ملک ایاز کے بیٹے صہیب ملک نے کئی دفعہ اس کے پاس آ کر اپنے اور اس کے رشتے کو اجاگر کرنا چاہا تھا۔ کتنی کوششیں کی تھیں اس نے کہ دونوں خاندانوں کے تعلقات پھر سے استوار ہو جائیں مگر اس نے ہر دفعہ اس کو نامراد لوٹا دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود پر سے ایک تاوان میں آئی ہوئی ماں کے بیٹے کا دھبہ مٹا دینا چاہتا تھا۔

وہی دھبہ جس نے ایک آسیب کی طرح بچپن سے لے کر جوانی تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ اس کے ساتھ چمٹا رہا تھا۔ وہ ساری زندگی بے چین رہا تھا۔ اس ایک احساس نے اس کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ سب سے پہلے اسے اس بات کا احساس دلانے والی آذر بھائی' زوبیہ' ماریہ اور شاہ میر کی والدہ بڑی امی تھیں۔ شاہ جہانزیب کی پہلی بیوی۔

آذر کی ماں! یہ شاہ زر بھی تمہارا بیٹا ہے' اسے بھی توجہ دیا کرو۔ بن ماں کے بچہ ہے' ’ ’ اس بات کو بہت محسوس کرتا ہے۔ جب تم اس کو پیار نہیں کرتیں۔" اس کا باپ شاہ جہانزیب بڑی امی سے کہہ رہے تھے۔ اس وقت اس کی عمر صرف چھ سال تھی۔

نہیں شاہ جی! میں تاوان میں آئی ہوئی اس عورت کے بچے کو نہیں پال سکتی جسے اس ’ ’ کے مرنے کے بعد بھی آپ کی بیوی قبول نہیں کر پائی۔ میں اسے حویلی میں برداشت کر لیتی ہوں اتنا ہی بہت ہے۔ اس پر نظر پڑتی ہے تو مجھے اس کی ماں یاد آتی ہے۔ سبرینہ کی معصوم "صورت رلاتی ہے۔ کتنے ارمان تھے اسے اپنی بھابی بنانے کے۔

بڑی امی رونے لگی تھیں۔ اس کے باپ نے ان کے منع کرنے کے باوجود اس کی ماں سے شادی کی تھی۔ انہیں اس بات کا بھی بڑا قلق تھا۔

دیکھو آذر کی ماں! یہ معصوم سا بچہ ہے۔ اسے کچھ علم نہیں۔ کچھ نہیں جانتا۔ تم محبت ’ ’ دو گی تو تمہیں ماں کہے گا۔ پھر یہ مجھے آذر سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ بھلے اس کی ماں ملکوں کی بیٹی تھی۔ خواہ یہ سبرینہ کے تاوان میں آئی ہوئی ماں کا بیٹا ہے لیکن یہ تو ہمارا خون ہے۔ ہمارے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ دیکھ لینا یہ ایک دن بڑا ہو کر اپنے باپ کی جگہ ہمارا نام روشن کرے گا۔" شاہ جہانزیب نے والہانہ محبت سے کہتے اس کا ماتھا چوم لیا تھا تو بڑی امی چپ رہیں۔

اسے تب ان کا چپ رہنا بہت غنیمت لگا تھا۔ اسے حویلی میں ایک جگہ مل گئی تھی۔ وہ حویلی کا بیٹا تھا۔ شاہوں کا خون تھا۔ اسے اپنا مقام اور اپنی شناخت بنانے میں بہت وقت لگا تھا۔ اس نے دن رات ایک کیے تھے۔ انتھک محنت کی تھی۔ بڑی مشکلوں سے وہ بڑی امی کا دل جیتنے میں کامیاب ہوا تھا۔ زوبیہ اور ماریہ کو بہنوں کی طرح محبت دی تھی۔ شاہ میر کو چھوٹا بھائی ہی سمجھ کر جانا اور چاہا تھا۔ آذر بھائی کو بڑے بھائیوں کی سی عزت' رتبہ اور مان دیا تھا۔ اسے حویلی میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔ ایک الگ ہی مقام مل گیا تھا۔ سب اس سے محبت بھی کرتے تھے اور عزت بھی۔ لیکن وہ اپنی ذات سے ملکوں کا دھبہ نہ مٹا پایا تھا۔ وہ ہر اس مقام پر بری طرح ہرٹ ہوا تھا جب اس نے خود کو شاہوں کا فرد ثابت کرنے کے لیے اپنا سکھ چین بھی تباہ کر دیا تھا۔ وہ پل بھی گیا تھا۔ سارہ اماں نے اس کی بہت اچھی تربیت کی تھی۔ اسے ایک ماں سے بڑھ کر محبت دی تھی۔ اتنا تو انہوں نے اپنے بچوں کو بھی نہیں چاہا تھا جس قدر والہانہ لگاؤ اور محبت اس سی کرتی تھیں۔ مگر افسوس وہ اس کی شخصیت نہ بنا سکیں۔ اس کے اندر پلنے والا کمپلیکس نہ ختم کر سکیں۔

ماں سر پر نہ ہو تو بچوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ اس نے لمحہ لمحہ بچپن سے جوانی تک اس بات کا تجزیہ کیا تھا۔ اس کی ذات میں بہت سی محرومیاں رہ گئی تھیں۔ وہ بہت جلد غصے میں آ جاتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلد خفا ہو جاتا تھا۔ منفی سوچوں کی بدولت اس نے خود کو ایک محدود

حد میں مقید کر لیا تھا۔ اس کے اندر کا یہ خلا کم ہونے کے بجائے اور بڑھا تھا۔ اور پھر جب مشعال نے انکار کر دیا تو اسے اس کا دیا گیا طعنہ بہت اذیت دیتا تھا۔

یہی وہ دور تھا جب اس کے اندر بہت سی خامیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ بہت کرخت ہو گیا تھا۔ سفاکانہ سوچ اس طرح حاوی ہوئی کہ محبت کہیں جا سوئی۔ پھر توانا اور ضد نے دل و دماغ پر ایسا بسیرا کیا کہ وہ ہر وہ کام کرتا گیا جو اسے انتہائی برا لگتا تھا۔ اسے لڑکیوں سے میل ملاپ، دوستیاں کرنا زہر لگتا تھا، اپنے اندر کی سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے لڑکیوں سے ملنا ملانا شروع کر دیا تھا۔ حسن و بو کی محفلوں میں دل و نظر کو سیر کرنے کے باوجود اس کے اندر کی تلملاہٹ و بے چینی کم نہیں ہوتی تھی بلکہ اور بڑھ جاتی تھی۔

اکثر اس کا دل چاہتا وہ اپنی ذات کو ہی ختم کر ڈالے۔ مگر وہ یہ نہ کر پایا۔ جواباً وہ اذیت پسند ہو گیا۔ تھر ڈلی اور سنگ دلی نے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کئی مقامات پر اس نے اپنی ذات کو سنوارنے کے لیے بہت جدوجہد کی تھی مگر جب بھی کوئی اسے تاوان میں آئی ہوئی ماں کے بیٹے کا طعنہ دیتا تو وہ سر سے پاؤں تک بھڑک اٹھتا تھا۔ اندر تک ادھڑتا چلا جاتا تھا۔ طیش غم و غصے کا سیلاب ایسا منہ زور ہوتا تھا کہ وہ مقابل کو مرنے مارنے پر تل جاتا تھا۔ اس کے دوست احباب جاننے والے اور رشتہ دار سب ہی اس کے غصے سے بہت خائف رہتے تھے۔ پھر مشعال کو جب پندرہ سالوں بعد اپنے روبرو دیکھا تو اس کے اندر تک ایک ہلچل سی مچ گئی تھی مگر اسی رات جب وہ آئی تھی اس نے وہی باتیں دہرائی تھیں جنہیں وہ بھلانے کی کوشش کرتے

کرتے اپنی ذات کو بھی بھول گیا تھا۔ اس کے اندر بھی کوئی اچھا شاہ زر بستا ہے۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس نے اسے پھر وہی خاندان اور تاوان میں آئی ہوئی ماں کے بیٹے کا طعنہ دیا تھا۔ پھر وہ سہہ نہیں پایا تھا۔

اس کے اندر منتقمانہ سوچ پلنے لگی تھی۔ وحشت اتر آئی تھی۔ ضد اور انتقام نے یہ بھی بھلا دیا تھا کہ وہ کبھی اس کی محبت بھی رہی ہے۔ بعد میں اس نے اس سے شادی کر کے اس کی باتوں اور اپنی سوچوں کو عملی جامہ پہنا دیا تھا۔ اس نے اگرچہ یہ سب کچھ نفرت و انتقام کے منہ زور ریلے کی شدت میں بہہ کر کیا تھا مگر وہ اپنی ذات، اپنی سوچ، اپنے کردار اور اپنے اعمال کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ جہاں کچھ مشعال کی ضدی طبیعت، اکھڑ مزاج اور مغرورانہ فطرت کا قصور تھا وہاں وہ خود زیادہ قصور وار تھا۔ مشعال ایک لڑکی تھی۔ نرم و نازک سی۔ اس سے کئی گنا کمزور اور بے بس سی تھی مگر وہ خود تو ایک مرد تھا۔ اس کے مقابلے میں طاقت ور چھا جانے والا، خود پر کنڑول کر لینے والا۔ لیکن اس نے خود پر کنڑول نہیں کیا تھا۔ اپنی منفی سوچوں کو نہیں دبایا تھا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ وہ سب جان بوجھ کر کرتا رہا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا اعتراف تھا۔ وہ اسے کچھ نہیں دے سکا تھا۔ سوائے آنسوؤں کے، بے رنگ وحشت و بربریت سے مزین ظالمانہ و سفاکانہ لمحوں کے، اذیت و تکلیف دہ یادوں کے۔

مشعال کے مطالبے پر ساری رات سوچنے کے بعد ایک فیصلہ منٹوں میں ہو گیا۔ اس نے اپنی ذات کی ساری خامیوں اور خوبیوں کو غلطیوں سمیت قبول کر لیا تھا۔ وہ اپنے اعمال پر شرمسار

تھا۔ اپنے گناہوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار تھا۔ ان چند دنوں میں اس نے بہت گڑگڑا کر، رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔ وہ گناہ جو دانستہ کرتا رہا تھا۔ اسے حق حاصل نہیں تھا کہ ایک کمزور سی لڑکی کو تکلیف دے کر سکون حاصل کرتا۔ مشعال کو تو علیحدہ ہو جانے کا اختیار اس کے رب نے دیا تھا اور پھر وہ کون ہوتا تھا جو اسے سب کچھ عیاں ہو جانے کے بعد بھی باندھے رکھتا۔ اسے طلاق نہ دیتا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے اپنی زندگی سے دور کر دے گا۔ اسے اپنے گناہوں کی معافی صرف اسی ایک راستے پر چلنے سے حاصل ہو سکتی تھی۔ بس اسی ایک سوچ نے اسے ایک فیصلے پر پختہ کر دیا تھا۔

وہ ابھی تک شاہ کمال کو راضی کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ مشعال کی طرف سے دی گئی ایک مہینے کی مہلت بھی اب ختم ہونے کو تھی اور وہ اب پریشان ہو گیا تھا۔ مشعال سے کلام تو تقریباً اسی رات سے اپنا فیصلہ سنا دینے کے بعد سے بند تھی۔ دونوں کے تعلقات اب بس برائے نام تھے۔ وہ علیحدہ کمرے میں سوتی تھی۔ بس اس کے کپڑے اور دیگر اشیاء ابھی تک اسی کے کمرے میں تھیں۔ اسی لیے وہ کبھی کبھار اسے اپنے کمرے میں دیکھ لیتا تھا۔ وہ اپنی دنیا میں بہت خوش و مگن اور مست تھی۔ اس کی جانب سے ایک فیصلہ ہو جانے کے بعد اس نے فوراً برطانیہ جولف سے رابطہ کیا تھا۔ اسے شاہ زر کے فیصلے کے متعلق اس نے سب بتا دیا تھا تو وہ فوراً پاکستان آنے پر راضی ہو گیا۔ وہ آج کل کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ مشعال سے اس کی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور آج رات کا ڈنر بھی شاید اسی نوعیت کا تھا۔

شاہ زر نے سوچتے سوچتے کمرے کا جائزہ لیا تو مشعال اسے کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ وہ باہر جا چکی تھی۔ وہ بھی ایک گہری سانس کھینچے تکیہ ایک طرف پھینک کر لائونج میں آ گیا۔ مگر وہاں مشعال کو اماں کے ساتھ الجھتے دیکھ کر دروازے پر ہی رک گیا۔

‘‘مشعال! دیکھو بیٹی، تمہارا اس طرح روز کسی غیر مرد کے ساتھ کہیں باہر آنا جانا مناسب نہیں ہے۔ تم شادی شدہ لڑکی ہو۔ کم از کم شاہ زر سے ہی پوچھ لینا چاہیئے تھا۔ وہ جیسا بھی ہے بہر حال اب بھی تمہارا شوہر ہے۔ تم اب بھی اس کے نکاح میں ہو۔’’ اماں اونچی آواز میں مگر نرمی سے مشعال کو سمجھا رہی تھیں جب کہ وہ دونوں ہی شاہ زر کی موجودگی سے لاعلم تھیں۔ وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔

‘‘اماں پلیز! آپ ہر وقت مجھے ہی مت سمجھاتی رہا کریں کبھی یہ فرض اپنے اس لاڈلے پر بھی پورا کر لیا کریں۔ میں کسی غیر کے ساتھ نہیں جا رہی، وہ میرا دوست ہے۔ بہت شریف النفس اور اچھا لڑکا ہے۔ اور آپ کی تسلی کے لیے بتائے دیتی ہوں، آپ کا لاڈلہ میرے اس پروگرام سے باخبر ہو چکا ہے۔’’

‘‘مشعال! سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ اسلامی ملک ہے۔ یہاں کی کچھ حدود ہیں۔ یہاں یہ سب بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی لڑکے کی دوستیاں گناہ کے زمرے میں آتی ہیں۔ تم مسلمان عورت ہو، مسلمان باپ کی بیٹی ہو اور مسلمان شوہر کی بیوی ہو۔ ہمارا اسلام یوں

مسلمان عورتوں کو بن سنور کر غیر مردوں کے ساتھ پھرنے سے منع کرتا ہے۔ بلکہ انہیں تو سختی سے پردے کا حکم دیا گیا ہے۔" اماں نے اب بھی اسے سمجھانا فرض سمجھا تھا۔

نہ جانے آپ کیا سمجھ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔ بتایا تو ہے وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ ’ ’ ہمیشہ میرے ساتھ ایک حد میں رہ کر ملاقات کرتا ہے۔ کبھی اس نے کوئی نازیبا، غلط حرکت نہیں کی اور یہ بھی ذہن میں رکھیں وہ آپ کے شاہ زر جیسے لوگوں کی کیٹیگری میں شامل نہیں ہوتا۔ میں یوں کسی سے منہ اٹھا کر متاثر نہیں ہو جاتی۔ کسی میں کچھ گٹس ہوتے ہیں تو اسے منہ لگاتی ہوں۔" وہ اماں کی بات کا جو مطلب سمجھی تھی غصے سے بھنا کر کہتی گئی۔ شاہ زر نے بری طرح ہونٹ کاٹے۔

واقعی تم یونہی تو کسی سے متاثر نہیں ہوتی۔ میں شاہ زر جہانزیب جسے خود پر بڑا فخر تھا، ’ ’ جس پر بے شمار لڑکیاں مرتی تھیں اس سے تم متاثر نہیں ہوئیں اور وہ نہ جانے کیسا ہو گا جس کے لیے تم سب کچھ کر گزری ہو۔ ضرور بہت اعلیٰ انسان ہو گا۔" اس کے دل میں حسد کی بجائے رشک کروٹیں بدلنے لگا۔ پھر وہ دونوں کی گفتگو کو نظر انداز کیے اندر داخل ہو گیا۔

دونوں اسے دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

اماں! کھانا لگا دیں، آج بہت بھوک لگی ہے۔" مشعال کو نظر انداز کر کے اماں سے ’ ’ کہا۔

"کیوں نہیں۔ ابھی لگاتی ہوں۔" وہ فوراً مشعال کے پاس سے اٹھ گئیں۔ پھر اس سے مخاطب ہو کر کھانے کا پوچھنے لگیں۔ "تم بھی کھانا کھاؤ گی؟"

"نہیں اماں! میں جولف کا انتظار کر رہی ہوں۔ کہہ رہا تھا وہ مجھے پک کر لے گا۔" بہت آہستگی سے اس نے جواب دیا تھا۔ پھر اماں سر ہلا کر کچن کی طرف چلی گئیں۔ وہ بھی بہت اہتمام سے سجے اس کے سراپے پر ایک بھرپور نظر ڈال کر کچن میں آگیا۔

ؤؤ...ؤؤ

"کیا بات ہے، کچھ پریشان ہو۔ بہت چپ چپ سی ہو؟" وہ بہت دیر سے نوٹ کر رہا تھا۔ کھانے میں بھی اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اوپر سے اس کی خاموشی بھی بہت پراسرار بنا رہی تھی۔ اپنے حلیے اور چہرے کے برعکس وہ فریش نہیں تھی۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ جواباً اس نے کھل کر مسکرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی تھی۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" چاول منہ میں ڈالتے اس نے اسے ٹالنا چاہا۔

"پلیز مشعال! مجھ پر بھروسہ کرو اور مجھے بتاؤ کہ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔"

"پلیز جولف! میں نے کہا نہ کہ ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے کچھ جھنجلا کر کہا۔

"آر یو شیور؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، جواباً وہ شکایتی انداز میں دیکھنے لگی۔ وہ مسکرا دیا۔

شاہ زر سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟” اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ وہ واقعی ناراض ’ ’ ہو گئی۔

تم آرام سے کھانا کھاؤ اور مجھے بھی کھانے دو۔” اس نے ناراضگی سے جواب دیا۔ ’ ’

اچھا بتاؤ آج کس بات پر جھگڑا ہوا ہے۔” وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کا تفتیشانہ انداز دیکھ ’ ’ کر اس نے بھی بتا دینا مناسب سمجھا۔

نہیں جھگڑا تو نہیں ہوا مگر آج سارہ اماں نے مجھے تمہارے ساتھ یوں آنے سے منع ’ ’ ”کر دیا تھا بلکہ وہ تو ناراض ہو رہی تھیں۔

اور شاہ زر! کیا اس نے بھی منع کیا تھا۔” وہ نہ جانے کیا سننا چاہتا تھا۔ وہ سمجھ گئی۔ ’ ’

نہیں... وہ پہلے سے کافی بدل گیا ہے۔ وہ اب میری ذات میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ ’ ’

لیکن جولف! آج مجھے اماں کی ایک بات اچھی نہیں لگی تھی۔ انہوں نے نہ جانے تمہیں کیا ”سمجھا۔

اور اتنی دیر سے محترمہ اس بات پر کڑھ رہی تھیں۔ میں سمجھا شاید کہیں شوہر صاحب ’ ’ نے تو کچھ کہہ نہیں دیا۔” اس کے ساتھ رہتے ہوئے جولف کی اردو بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ وہ مسکرا دی۔

یہ اتنی سی بات نہیں ہے جولف! تمہارے بارے میں کوئی غلط سوچے یا کہے‘ مجھے ’ ’ ”بہت برا لگتا ہے۔

بس میڈم! زیادہ سر پر مت چڑھاؤ‘ بندہ آپے سے باہر ہو جائے گا۔” اس نے فوراً ’ ’ ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ وہ مزید مسکرا دی۔

لیکن مشعال! تمہیں اپنے شوہر سے پوچھ کر آنا چاہیے تھا۔ اسے یقیناً اچھا نہیں لگا ’ ’ ہوگا۔” وہ اسے پھر سمجھا رہا تھا۔ اسے اس کے یوں شاہ زر کا ذکر چھیڑنے پر کوفت سوار ہونے لگی۔

فار گاڈ سیک جولف! تم یہ شاہ زر نامہ بھول نہیں سکتے۔ کیا تم نے مجھے یہاں صرف ’ ’ ”اسے ہی ڈسکس کرنے کے لیے انوائٹ کیا تھا۔

سوچ لو‘ وہ تمہارا شوہر ہے۔ کچھ اور پوچھا تو تم کہو گی میرے شوہر کے بارے میں ’ ’ کیوں نہیں پوچھا۔” وہ پھر اسے چھیڑ رہا تھا‘ وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

”...تم بھی بس نا ’ ’

اچھا چلو‘ میں نے تو بس کھانا کھالیا ہے۔” اس نے فوراً کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ٹشو ’ ’ سے ہاتھ صاف کرتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جولف بھی کھڑا ہو گیا۔

تم چلو میں پے منٹ کر کے آتا ہوں۔” اس نے اسے چلتا کیا۔ ’ ’

وہ سر ہلاتی باہر نکل آئی۔ لان میں ماحول بہت پر سکون تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے پارکنگ میں گاڑی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور گاڑی سمیت موجود تھا۔ وہ گاڑی کے بونٹ پر بیٹھ کر دلچسپ نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ وہ سوائے گاؤں کے کسی اور جگہ کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ شاہ زر کے ساتھ بھی وہ سوائے دعوتوں کے اور کہیں نہیں گئی تھی۔ بس یہ جولف کے ساتھ ہی کہیں باہر آنے جانے کا موقع ملا تھا۔ اسے یکدم آزادی کا احساس ہوا۔ آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اسے اپنا یہ عمل بہت اچھا لگا۔ پھر جولف آ گیا تو اس نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ وہ بھی دلچسپ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

مشعال! تمہاری طرح تمہارا یہ پاکستان بھی بہت خوب صورت ہے۔" وہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں یں کچھ رنگ سے اترنے لگے۔ جولف نے ایک دم نظریں ہٹا دیں۔

اس لباس میں تم بہت دلکش لگ رہی ہو۔" وہ تعریف پر کنفیوژ ہونے کے بجائے ’ ’ پورے اعتماد سے مسکرائی۔ آنکھوں میں اترنے والے رنگ ابھی بھی برقرار تھے۔

اگر تم یہی بات میری آنکھوں میں دیکھ کر کہتے تو میں یقین بھی کرتی۔" اس کی بات ’ ’ پر وہ خاموش رہا۔ وہ ایک دم بات ہی بدل گئی۔ لگتا ہے جناب! پاکستان کی اچھی خاصی سیر "کر چکے ہیں۔

“نہیں... صرف لاہور اور کراچی سٹی دیکھے ہیں۔ آخری دفعہ جب مجھے بحیثیت سیاح پاکستان آنے کا موقع ملا تھا تو ہماری ٹیم کا پروگرام صرف کراچی کی سیر تھی اور اس دفعہ جو میں آیا ہوں تو سارا سارا دن لاہور کی تاریخی مقامات کی خاک چھانتا رہتا ہوں۔ بہت ہی حیرت انگیز مقامات ہیں۔” وہ انجانے میں ہی سہی بہت دلچسپی سے بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھے گئی۔

جولف نے اس کی محویت کو نوٹ کر کے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

“آئو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔”

“ابھی نہیں... ابھی تو میرا دل چاہتا ہے میں اس کھلی فضا میں تھوڑی دیر اور سانس لوں۔”

“اوکے... جیسے تمہاری مرضی۔” وہ بھی کندھے اچکا کر گاڑی کے بوٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

“مشعال! مجھے تمہیں ایک بہت اہم بات بتانی ہے اور اسی لیے میں نے آج تمہیں یہاں بلایا تھا۔” وہ بہت سنجیدگی سے مخاطب تھا۔ وہ ارد گرد سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔

“کیا؟” وہ پوری جان سے متوجہ تھی۔

میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ تین ماہ قبل، جب میں برطانیہ میں تھا اور اب میرا اسلامی نام ’ ’ حذیفہ ہے۔" وہ بہت آرام سے بتا رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر بے اختیار خوش ہو کر اسے دیکھا اور پوچھا۔

واقعی... آر یو رائٹ؟" اس نے گردن اثبات میں ہلا دی۔ مشعال کی آنکھوں میں ایک ’ ’ نمی سی اتر آئی۔ اس نے تشکر سے آنکھیں بند کر لیں۔ کئی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے گئے۔ وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگی۔ پھر آنکھیں کھولیں تو مسکرا رہی تھی۔

تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے۔ تمہیں پتا ہے میں نے یہ بات سننے کے لیے کیا کچھ ’ ’ سہا ہے، کتنا اذیت انگیز انتظار کیا ہے۔ آج تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے، تم یقین کرو میں بہت خوش ہوں۔"

مجھے اندازہ ہے مشعال! میں جانتا ہوں کہ تمہیں کتنی خوشی ہوئی ہے مگر میں نے بھی ’ ’ بہت کچھ سہا ہے۔ اپنے پیرنٹس اور فیملی (بہن بھائیوں) کو چھوڑ دیا ہے۔ میں جوان کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا تھا اللہ کی عطا سے جی رہا ہوں۔ میرے اسلام لانے کے بعد انہوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میرا ہر طرح سے بائیکاٹ کر دیا تھا۔ انہوں نے میرے خلاف ایک محاذ آرائی شروع کر دی۔ اسلام کے خلاف ان کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں، ان کے قرآن اور ہمارے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں نازیبا کلمات کہنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اتنی تنگ نظری، اتنی ایذا رسانی، شروع شروع میں مجھے یقین نہیں آتا تھا پھر رفتہ

رفتہ میرا دل ان کی محبت سے آزاد ہوتا گیا۔ میں نے اسلام کی خاطر ان سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ انہوں نے اتنی کوششیں کیں کہ مجھے اسلام سے ہٹا دیں مگر مشعال! میرے اللہ نے مجھے ثابت قدم رکھا۔ میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں۔ میں نے اولین مشکلات سر کر لی ہیں۔ ہر طوفان مخالفت کو شکست دے کر اس مقام تک پہنچا ہوں۔ اب نئی آزمائشوں کا منتظر ہوں۔ اپنے دل اور ایمان کو مضبوط کر رہا ہوں۔ میں جب ایمان لایا تو تب ہی سوچا کہ تمہیں ضرور آگاہ کر دوں مگر تم اپنے مسائل میں الجھی ہوئی تھیں۔ ہر بار تمہارا فون اٹینڈ کرتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہیں پاتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کسی مناسب موقع پر تمہیں آگاہ کر دوں گا اور پھر جب تم نے مجھے شاہ زر کے متعلق بتایا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ پھر میں یہاں چلا آیا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد بھی ہر دفعہ تم سے ملنے کے باوجود تمہیں کچھ نہ بتا پایا۔ مشعال! جہاں اسلام نے مجھے بہت مضبوط بنایا ہے وہاں مجھے بہت کمزور بھی کر دیا ہے۔ جہاں روحانی طور پر میرے اندر ایمان کی قوت بڑھی تھی وہیں میں کچھ بزدل سا بھی ہو گیا ہوں۔ مشعال! میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں مگر مجھے کوئی یہ کہے کہ میں نے کسی لڑکی کے لیے اسلام قبول کیا ہے تو پھر میں برداشت نہیں کر پاتا۔ اگر مجھے تمہاری خاطر اسلام قبول کرنا ہوتا تو میں بہت عرصہ پہلے خود کو مسلمان کہلوا رہا ہوتا۔ میں اتنے برس اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق بے چین و بے قرار نہ رہتا۔ ہاں یہ سچ ہے میں نے تم سے محبت کی تھی، تمہیں چاہا تھا، تمہارے ساتھ کی طلب کی تھی، یہ تب کی بات ہے مشعال! جب میں گمراہی میں بھٹک رہا تھا، جب مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اور اب میں ایک مسلمان سوسائٹی کا فرد ہوں۔ اسلامی رشتے سے بندھ گیا ہوں تو میں

اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں میں نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی ذات کی فلاح و عرفان کے لیے اور اپنی اخروی زندگی کی کامیابی و کامرانی کے لیے اسلام قبول کیا ہے۔ میں اللہ پر ایمان لایا ہوں مگر کسی لڑکی کے لیے نہیں۔ بس میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لایا ہوں یہ جان کر کہ آپ اللہ کے آخری نبیؐ ہیں۔ آپؐ کی محبت نے مجھے اندھیری نگری سے توحید و روشنی کا راہی بنا دیا۔ میں نے آپؐ جیسا کوئی کردار نہ دیکھا نہ پایا۔ بڑے بڑے اسکالرز، سیاسی شخصیات، مذہبی پرچار کرنے والے، کوئی بھی تو آپؐ جیسا نہیں تھا۔ میں نے لائبریریاں چھان ماریں، بڑی سے بڑی شخصیت آپ ﷺ کے قدموں کی دھول کے برابر بھی نہیں۔ اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں اس رب کریم، جس کے قبضے میں میری جان ہے، جس نے مجھے اپنی ذات کریمی کا عرفان بخشا، خود شناسی کی قوت دی، جس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں بغیر کسی ہچکچاہٹ اور دباؤ کے حضرت محمد ﷺ پر دل و دماغ کی پوری آمادگی سے ایمان لے آیا۔ مجھے خوشی ہے اس فیصلے پر۔ میرا ایمان ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نبوت کا وہ سلسلہ جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوا تھا وہ نبی آخری الزماں حضرت محمد ﷺ پر آ کر ختم ہو گیا اور تاقیامت اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور حضرت عیسیٰؑ بھی اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر تھے جو اس دنیا میں بنی اسرائیل کی فلاح کے لیے آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان پر اٹھا لیا۔ قرب قیامت وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ دین محمدی ﷺ کا پرچار کریں گے، تبلیغ کریں گے۔ میں ان تمام باطل خدائوں اور مظاہر فطرت کی بھی نفی کرتا ہوں جن کی لوگ عبادت اور پرستش کرتے ہیں۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت مریمؑ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ تھیں۔ ایک پاکباز اور نیک عورت تھیں اور حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے معجزانہ طور پر پیدا ہوئے تھے۔

ایک پاکباز اور نیک عورت تھیں اور حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے معجزانہ طور پر پیدا ہوئے تھے۔"

وہ بہت خوبصورت، مدھر و پرتاثر لہجے میں سب کہہ رہا تھا۔ وہ مبہوت بت بنی سب سنتی رہی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس گمراہ جولف کا سراپا سمایا جس کے کھلے گریبان میں زنجیریں لٹک رہی تھیں، آنکھوں میں بہکی بہکی مست بھری کیفیت تھی۔ کندھوں تک لمبے لمبے بال لڑکیوں کی کیٹیگری میں کاؤنٹ کرتے تھے۔ غیر متناسب لڑکھڑائی لڑکھڑائی چال اس کے کردار کی عکاسی کر رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں ایک واضح طلب لیے کسی لڑکی کے ساتھ کے لیے اس کی ٹیبل تک آیا تھا۔ اسے اپنے ساتھ چلنے کی آفر کی تھی۔ تب یہ اسے کتنا برا لگا تھا۔ انتہائی زہر۔ ان دنوں بڑی امی پاکستان سے بار بار فون کر کے اس کی اور شاہ زر کی شادی پر زور دے رہی تھیں۔ ماما اپنے بھانجے کو ترجیح دے رہی تھیں سو ماما اور پاپا کے درمیان بہت زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ وہ گھر کے تنے تنے خراب ماحول سے اور کچھ اپنے اندر کی بے چینی و کرب سے فرار پا کر اس نائٹ کلب میں گئی تھی مگر وہاں جا کر بھی وہاں کی رنگ و بو کی دنیا سے کٹ کر کونے کی ایک میز پر چپ چاپ خود میں مگن تھی جب جولف نے اسے متوجہ کیا تھا۔ یہ اس کی پہلی ملاقات تھی جولف سے۔ جس نے اس پر بہت برا تاثر چھوڑا تھا۔ وہ اس پر ایک غصیلی نگاہ ڈال

کر اٹھ گئی تھی۔ اگلی ملاقات سی سائیڈ پر ہوئی تھی۔ اس دن بھی وہ بہت افسردہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی بے خیالی میں گہرے نیلے پانی میں پتھر چھینکتی جا رہی تھی تب اس کی نگاہ ایک خوبصورت سفید خدوخال والی نو عمر لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے چہل قدمی کرتے جولف پر ٹھہر گئی۔ عین اسی لمحے اس نے بھی اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی لہر لہرائی تو وہ اس کی طرف چلا آیا۔ وہ اتنی بیزار تھی کہ ٹھیک سے ہیلو ہائے بھی نہ کر پائی۔ جولف بھی شاید جلدی میں تھا۔ اپنا کارڈ زبردستی اسے تھما کر چلا گیا تھا۔ ایک نظر سرسری سی کارڈ پر ڈال کر اس نے اسے پانی کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔ تیسری ملاقات اس کی شاپنگ پلازہ میں ہوئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بہت سے لڑکوں کی طلب ہے۔ اسے دیکھ کر مردوں کی نظروں میں ایک ستائش سی ابھرتی تھی۔ اس احساس نے اسے اور محتاط اور مغرور بنا دیا تھا۔ تیسری ملاقات میں بھی جولف اس سے فرینک ہونے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ اس کے الٹے سیدھے سوالوں کے غلط ملط جواب دے کر بمشکل اس سے پیچھا چھڑا کر نکلی تھی مگر گھر جاتے ہوئے بھی اسے یہ مستقل احساس رہا کہ وہ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

بعد میں جولف سے اکثر اتفاقیہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی کسی ہوٹل میں، کبھی یونیورسٹی میں، کبھی اپنے آفس میں جہاں وہ وقت گزاری کے لیے پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ پہلی نظر ڈالنے کے بعد اس کے ذہن میں جولف کا جو خاکہ تھا اس سے ملنے پر بدل گیا۔ حتیٰ کہ اس نے اس کی دوستی قبول کر لی۔ کچھ وہ خود بھی بہت اپ سیٹ تھی۔ جولف بلا کا باتونی اور گفتگو کے فن سے

آشنا تھا۔ خود بخود اس کی طرف بڑھتی گئی۔ وہ اس کی بے چین فطرت کی تسکین اور پروپیگنڈا ذہن کی ضرورت بنتا گیا۔ وہ جیسی بھی لائف گزارتا تھا اسے کوئی غرض نہیں تھی مگر وہ اس کے ساتھ ہمیشہ بہت اچھا رویہ رکھتا تھا۔ اسے اس کا یہ انداز اچھا لگتا تھا اور آج اس میں ماضی کے جولف کی ایک جھلک بھی نہیں تھی۔ وائٹ ٹی شرٹ، بلیک جینز اور بلیک ہی کوٹ میں ملبوس اپنے مردوں جیسے ہیئر اسٹائل میں وہ خاصا ڈیسنٹ، پر رعب و پر وقار مرد لگ رہا تھا۔ اب نہ تو اس کے گلے میں زنجیریں لٹک رہی تھیں نہ اس کا گریبان کھلا ہوا تھا۔ بال بھی کٹوا لیے تھے اور تو اور اس کی چال بھی کافی مہذب ہو گئی تھی۔ اس کے اندر خود بخود ایک فخر سا آن سمایا۔

جولف تم..." اچانک چونک کر اس نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے روک دیا۔

نہیں... میں جولف نہیں ہوں۔ حذیفہ ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا، مشعال! جب ایک دفعہ ہم دونوں اسلامک سینٹر گئے تھے تو وہاں موجود اسکالر لوگوں کو نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرامؓ کے بارے میں بریفنگ دے رہا تھا تو اس دوران ایک نام آیا تھا۔ حذیفہؓ۔ یہ بھی نبی اکرم ﷺ کے صحابی ہیں اور تم نے یہ نام سن کر فوراً کہا تھا۔ "جولف! اگر تم مسلمان ہو گئے تو میں تمہارا نام حذیفہ رکھوں گی۔" بس جب میں نے اسلام قبول کیا تو وہاں مسجد میں موجود مولوی صاحب نے مجھے اپنی پسند کا اسلامی نام بتانے کو کہا تھا۔ تب بے اختیار میرے لبوں سے

”حذیفہ“ نکل گیا جب کہ ذہن میں نبی اکرم ﷺ کے صحابہؓ کا کردار چھا گیا۔ اور وہاں موجود ”سب لوگوں نے مجھے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہا جیسا بننے کی دعا دی تھی۔

اب کیا پلان ہے؟ مسلمان تو ہو چکے ہو۔ زندگی کا ایک نصب العین تو تمہیں مل گیا ’ ’ ”ہے۔ پھر آگے کیا کرو گے، کیا پاکستان میں رہو گے؟

نہیں۔ فی الحال تو میں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ خود کو اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ البتہ میں ’ ’ اپنی جاب سے مستعفی ہو گیا ہوں۔ جس فرم میں، میں کام کرتا تھا وہ چونکہ عیسائیوں کی بہبود کے لیے کام کرتی تھی۔ میرے مسلمان ہونے سے میری صلاحیتیں بھی مشکوک ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ فرم کی طرف سے میرے مسلمان ہونے کی پاداش میں کوئی قدم اٹھایا جاتا، میں نے خود ہی ریزائن کر دیا۔ آج کل دبئی میں ایک انجینئرنگ ریسرچ کمپنی میں جاب کے ”لیے اپلائی کیا ہوا ہے۔ شاید کوئی مثبت جواب مل جائے۔

”تو تم دبئی چلے جاؤ گے؟ ’ ’

یس، یہ تو بعد پر منحصر ہے۔ اگر جاب مل گئی، اچھی ہوئی تو ویل۔“ اس نے کندھے ’ ’ اچکائے۔

تو تم پاکستان ہیں کیوں نہیں رہ جاتے۔“ اچانک اس نے کہا تو وہ ہنس دیا۔ ’ ’

ضرور سوچا تھا مگر چھوڑو اس بات کو، پہلے تم یہ بتاؤ تمہارے کیا ارادے ہیں۔ دو تین ’ ’ ہفتے تو مجھے بھی ہو گئے ہیں پاکستان آئے ہوئے۔“ وہ لاپروائی سے ٹالتا اس سے پوچھنے لگا تو وہ سمجھ گئی کہ وہ اسے کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ اس نے بھی مجبور نہ کیا۔

تم میرے ارادوں سے باخبر ہو۔ کچھ بھی تو تم سے چھپا ہوا نہیں میری زندگی کا ایک ’ ’ ”ایک لفظ۔

یہ دانش مندی تو نہیں، خود کو تباہ کرنے والی بات ہوئی۔ اگر تم میری بات مان لو ’ ’ ”تو...

اس نے کئی دفعہ کی کہی بات دہرانا چاہی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

نو حذیفہ! تم یہ لیکچر مت دینا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں جو سوچتی ہوں وہ کرتی بھی ’ ’ ”ہوں۔

چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ تو یہ طے ہے کہ تم میری بات نہیں مانو گی۔ میں جو ’ ’ تمہاری خاطر اتنی دور سے یہاں تک آیا تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ اس نے ناراضی سے ”دیکھا۔ ”تمہیں یقین ہے وہ تمہیں ڈائی ورس دے دے گا۔

مجھے نہیں معلوم حذیفہ! میرے دل میں عجیب و غریب سے وسوسے ابہام آتے ’ ’ رہتے ہیں اور شاہ زر نہ جانے کیا چاہتا ہے۔ اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے؟ بتایا تو تھا اس نے کہ پیپرز

تو تیار ہیں۔ جیسے ہی پاپا ایگری ہوئے وہ سائن کر دے گا۔ اس دن کے بعد تو اس نے جیسے خاموشی کی ردا اوڑھ لی ہے۔ کتنی مرتبہ چاہا کہ اس سے آئندہ کے بارے میں پوچھوں مگر وہ کچھ پوچھنے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔" وہ یک دم بہت الجھ گئی تھی۔

تو تمہارا مطلب ہے وہ اپنی بات سے بدل رہا ہے۔" وہ بغور اس کے الجھے چہرے کو ’ ’ دیکھنے لگا۔

نہیں... اتنا تو یقین ہے وہ اپنی بات سے نہیں بدلے گا۔ اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ ’ ’ مگر ایک خوبی ہے۔ وہ قول کا پکا ہے۔ کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ چاہے مقابل دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لوگ جو کہتے ہیں وہ ہر حال میں کرتے ہیں۔ چاہے خود کو بھی نقصان اٹھانا پڑ جائے۔ مگر حذیفہ ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ دیر کیوں کر رہا ہے۔ وہ پاپا کا بہت منظور نظر ہے۔ کبھی اس کی کوئی بات پاپا نے نہیں ٹالی۔ میں حیران ہوں وہ ابھی تک پاپا کو قائل ہی نہیں کر پایا۔"

تم اس سے ایک دفعہ پھر بات کرو۔" اس نے اسے مشورہ دیا تو وہ نفی میں گردن ’ ’ ہلانے لگی۔

نہیں حذیفہ ! اب ہمارے درمیان وہ تعلق نہیں رہا جس کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے پر ’ ’ پوچھ گچھ کا حق رکھتے ہوں۔"

’’تو پھر کیا چاہتی ہو؟ دیکھو مشعال! میں نے ہمیشہ تمہاری بھلائی چاہی ہے۔ ہمیشہ تمہارے لیے اچھا سوچا ہے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا یہ جو دیر ہو رہی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہے۔ شاید وہی ایسا نہیں چاہتا۔‘‘ حذیفہ کی بات پر وہ کچھ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

’’دیکھو ذرا ایک بات ہوتی ہے عقیدے کی۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں جب میں ایمان لایا تو مجھے اسلام کے بنیادی عقائد کی تعلیم دیتے ہوئے ایمان ’’مفصل‘‘ ’’صفت ایمان‘‘ کے متعلق گہرائی سے بتایا گیا جس کے مطابق ایک کامل مومن جہاں اللہ پر ایمان لانے‘ فرشتوں پر‘ اس کی کتابوں پر‘ اس کے رسولوں پر‘ قیامت کے دن اور مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر ایمان لانے کی گواہی دیتا ہے وہاں وہ تقدیر پر بھی ایمان لاتا ہے۔ اچھی یا بری تقدیر پر اللہ کی طرف سے ہے۔ ’’ایمان مفصل‘‘ اور ’’ایمان مجمل‘‘ صفت ایمان ہیں۔ یہ سب اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار ہمیں دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ سب باتیں تو عیسائیت اور یہودیت میں بھی ملتی ہیں مگر فرق یہ ہے کہ لوگوں نے مذہب کے نام پر آسمانی کتابوں کو بدل ڈالا ہے۔ احکام الٰہی اپنی مرضی سے بدل دیئے ہیں۔ چودہ صدیاں بیت جانے کے باوجود اگر کچھ محفوظ ہے تو وہ قرآن مجید ہے۔ تعلیمات نبی ﷺ ہیں۔ ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ تمہیں محسوس نہیں ہوتا تمہاری یہ بے چینی کیوں ہے۔ تم نے جو مجھے ہدایت کی طرف بڑھنے کے لیے میری رہنمائی کی تھی‘ تم خود کیوں ان اندھیروں میں بھٹک رہی ہو۔ کبھی سوچا تم نے کہ ایمان بالتقدیر کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا

ہیں؟ عقیدہ تقدیر ہم سے کیا ڈیمانڈ کرتا ہے؟" وہ عجیب الجھی الجھی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی جس کے لفظ لفظ میں تاثیر تھی۔ جس کی آنکھوں میں روشنی تھی ایمان کی' کچھ پا لینے کی لگن و سرشاری تھی۔ اس کو ہمیشہ سے لفظوں کو اظہار کا ذریعہ بنانا آتا تھا۔ یہ لفظوں کا جادوگر تھا۔ کسی کو اپنے حصار میں مقید کر لینے کا گر اسے اچھی طرح آتا تھا۔ اس کی گفتگو کا فن نرالا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس شخص سے ملنے کے بعد اسے پہروں یاد رکھتی تھی۔ اس کو سمجھانے اور بات کرنے کا ڈھنگ از بر تھا۔

مشعال! میں تمہیں بتاؤں تم تقدیر پر ایمان نہیں رکھتیں۔ اگر تم اللہ کی ذات پر یقین ' ' رکھتیں تو آج اس مقام پر نہ کھڑی ہوتیں۔ یہ سچ ہے بغیر کسی نصب العین' بغیر کسی مقصد' بغیر کسی ارادے یا خیال و خواب اور خواہش کے زندگی نہیں گزرتی۔ مگر ان سب کو خود پر حاوی کر لینا' صرف اور صرف اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے اندھے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگتے جانا۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا بنا کر اسی تک محدود ہو جانا اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے صرف جذباتی ہو کر سوچنا حتیٰ کہ اللہ کی ذات تک فراموش کر جانا ایمان بالتقدیر نہیں ہے۔ یہ تو سراسر شرک ہے گناہ ہے۔ اپنے دل میں بت کی پوجا کرنا ہے۔ کچھ لوگ مٹی کے بتوں کو پوجتے ہیں اور ہم اپنی خواہشوں اور خوابوں کے بتوں کو پوجتے ہیں۔ وہ بظاہر کافر ہیں اور ہم مسلمان ہونے کے باوجود کلمہ پڑھنے' نمازیں ادا کرنے' روزہ و زکوٰۃ ادا کرنے کے باوجود کافر ہیں۔ ان کے برابر ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں کوئی مقام نہیں۔ اللہ نے اگرچہ

ہمیں یہ اختیار دیا ہے کہ ہم خواب دیکھیں، خواہشیں پالیں، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے منصوبے بنائیں، ارادے باندھیں، کوششیں کریں لیکن یہ بھی تو کہا ہے کہ اس کی ذات کو مت بھولیں جہاں ہماری خواہشیں ہم پر حاوی ہو گئیں، ہم تباہ ہو جائیں گے مشعال! کسی کو سامنے رکھ کر کوشش و جہد مسلسل کرنا برا نہیں ہے لیکن اپنے آپ کو سب کچھ سمجھ لینا ہمارے لیے فنا ہے... میں جب بہت چھوٹا تھا تو میرے فادر مذہبی بلڈنگز کے نقشے بناتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو عیسائیت کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ یہ بات انہوں نے میرے ذہن میں بھی بٹھا دی تھی۔ میرا نصب العین ایک انجینئر آرکیٹیکچر بننا تھا۔ میری ماما کہا کرتی تھیں کہ مجھے بڑے ہو کر عیسائیت کی خدمت کے لیے کلیسا، گرجا گھر، چرچ وغیرہ بنانا ہوں گے۔ میرے والد فرم کے چیف تھے سو میری پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے اپنے ارادے بھی پختہ ہوتے گئے۔ میرے ارادوں نے مجھے کامیاب زندگی گزارنے کی راہ مہیا کی۔ لیکن مشعال میں آرکیٹیکچر تو بن گیا مگر میں نہ ہی کوئی گرجا بنا سکا اور نہ ہی کوئی چرچ۔ میں کبھی بھی تقدیر پر شاکر نہیں رہا تھا ہمیشہ اپنے ارادوں، ہمت، کوشش، خواہشوں اور منصوبوں کو اہمیت دی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے اندر الٹی سیدھی تحریکیں برپا رہتی تھیں۔ اپنی فیملی کا مذہبی ماحول ہونے کے باوجود میں مذہب سے ہمیشہ برگشتہ رہا تھا۔ اگرچہ میری تربیت خالص عیسائی پیمانوں پر ہوئی تھی مگر میں صرف نام کا کرسچن تھا۔ میرے اندر عیسائیت والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میرے والدین نے بہت کوشش کی کہ مجھے اسلام کی طرف بڑھنے سے روک دیں مگر مشعال! میں خود بخود بڑھتا گیا۔ میرے والدین

کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ ہر تدبیر رائیگاں ٹھہری۔ ہوا وہی جو حکم ربی تھا۔ میں جو قسمت اور تقدیر کو مذہبی تقاضے کہہ کر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا' ایمان لانے کے بعد مجھے ماننا پڑا کہ ایک انسان کی زندگی میں اس کی قسمت اور تقدیر کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ خواہشیں' خواب' خیال' ارادے' منصوبے تو اس کے تابع ہیں۔ میرے ایمان لانے میں میری ذات کا تو کوئی کمال ہی نہیں۔ اگر میرا رب چاہتا تو میں ساری عمر ان ہی تاریکیوں اور گمراہیوں میں بھٹکتا رہتا۔ لیکن نہیں مشعال! میرے اللہ نے میری تقدیر میں میرا مسلمان ہونا لکھ دیا تھا تو پھر میں کیوں نہ ہوتا۔ میں جو تمہیں پسند کرتا تھا' جنون و دیوانگی کی حد تک تم سے محبت کا خواہاں تھا..."

"یہ تم "تھا" کیوں یوز کر رہے ہو۔ کیا اب نہیں کرتے۔" وہ جو بہت غور سے سب سن رہی تھی اچانک ٹوک دیا تو وہ مسکرانے لگا۔

"تم خاموشی سے سنتی جاؤ تو تمہیں جواب مل جائے گا۔ میرا مقصد تم سے شادی کرنا تھا۔ یہ ایک فطری سی خواہش تھی۔ اس وقت میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ شاہ زر کی تمہاری زندگی میں کیا حیثیت ہے۔ تم نے پھر بھی میری آفر قبول کر لی۔ مسلمان ہونے کی شرط رکھی تو اس وقت میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ تمہاری شادی ہو جائے گی یا پھر میں اسلام قبول کر لوں گا۔ کوئی ذات ہے تو یہ سب ہو گیا۔"

"میں نے کبھی اللہ کے وجود سے انکار نہیں کیا۔" ایک دفعہ پھر وہ بہت الجھتے کہہ گئی تھی۔

’’ مشعال ! میں سب مانتا ہوں تم نے کبھی انکار نہیں کیا لیکن تم نے کبھی مانا بھی تو نہیں‘ اگر تم اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھتیں‘ اس کی رضا کا خیال رکھتیں تو آج کبھی بھی اتنی الجھی ہوئی نہ ہوتیں۔ میری باتیں تمہیں اچھی نہیں لگ رہیں مگر پھر بھی میں تمہیں سمجھانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کچھ غلط کرو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں تمہیں سمجھالوں گا‘ قائل کرلوں گا مگر تمہاری ضد نے میرے خیالات کی نفی کر دی ہے۔ بہر حال میں اپنا فرض ضرور پورا کروں گا کیونکہ مجھے ہدایت کی طرف لانے میں تمہارا بہت ہاتھ ہے۔ میں اس وقت سے شروع کرتا ہوں جب میں تم سے پہلی دفعہ ملا تھا۔

ہاں مشعال ! تمہیں میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ پہلی نظر نے مجھے تمہارے چہرے کے اس تاثر نے متاثر کیا تھا۔ سب سے الگ تھلگ‘ بظاہر سب دیکھ رہی تھیں مگر تم وہاں نہیں تھیں۔ میں خود بخود تمہاری طرف کھنچتا چلا گیا۔ میری آفر غیر متوقع نہیں تھی۔ وہاں موجود ہر لڑکی کسی نہ کسی شخص کے ساتھ مصروف تھی مگر تم نے مجھے جن نظروں سے دیکھا مجھے اپنا آپ ندامت کے گہرے سمندر میں اترتا محسوس ہوا۔ تم تو وہاں سے چلی گئیں لیکن میری سوچوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ تم سے دوبارہ ملاقات کی میں لاشعوری طور پر روز دعا کرتا تھا۔ پھر میری دعا قبول ہو گئی۔ میں نے تمہیں جب دوسری دفعہ اسی گم صم‘ افسردہ اور بے چین سی کیفیت میں دیکھا تو تمہیں جاننے کے بارے میں میرا فطری تجسّس ابھر آیا۔ تم مغربی لک رکھنے کے باوجود مغربی نہیں تھیں۔ تمہارے چہرے کا تاثر تمہیں بہت معصوم‘ خوبصورت بناتا تھا۔

مجھ جیسے بندے کا بہک جانا فطری امر تھا۔ بعد کی ملاقاتوں میں، میں مکمل طور پر تم سے اٹیچ ہو چکا تھا مگر تم پھر بھی ویسی ہی تھیں، بے چین، بے سکون، تلاطم خیز سمندر کی طرح شوریدہ سر، میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ تمہارے بارے میں سب جاننے کے بعد مجھے تم سے دلی ہمدردی بھی ہوتی تھی۔ تم نے بہت سینسیئر ہو کر مجھ سے دوستی کی۔ میں دوستی سے بڑھ کر چاہنے لگا۔ تم نے وعدہ کر لیا کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو تم مجھ سے شادی کر لو گی مگر نہ جانے کیوں تمہارے اس فیصلے سے خوشی نہ ہوئی۔ یہ تو مجھے اب آ کر علم ہوا کہ وہ فیصلہ تو تم نے صرف مجھے ہدایت کے راستے پر ڈالنے کے لیے کیا تھا۔ میں تو تمہاری زندگی میں کہیں بھی نہیں تھا۔ ہاں مشعال! یہ تقدیر کا چکر ہی تھا کہ میں بظاہر تم سے محبت کرتا تھا لیکن تم سے نہیں کرتا تھا۔ میں تو اس نقطے کو پانا چاہتا تھا جو میری بے چینی و بے قراری ختم کر ڈالتا۔ اور تمہاری شرط نے میری ساری بے چینی و بے قراری ختم کر ڈالی۔ میں بہت حیران ہوا۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ سچ تھا۔ جیسے جیسے میں نے اسلام کے متعلق جاننے میں دلچسپی لینا شروع کی، میں خود بخود سنورتا گیا۔ میری جذباتیت، میرا جنوں، میری دیوانگی یکسر ختم ہو گئی۔

اور تم نے مشعال! کتنی کوشش کی کہ تم واپس پاکستان نہ آؤ لیکن تمہاری کسی نے کوئی بات نہ سنی۔ تم کہتی ہو کہ تمہارے والدین اور بہن تمہیں زبردستی یہاں لائے تھے مگر میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں تمہارے والدین نہیں لائے تھے بلکہ تمہاری تقدیر یہاں لے آئی تھی۔ نمبر دو تم نے کتنی کوشش کی کہ واپس لوٹ جاؤ۔ تم نے اپنے والدین کو منانے کی کوشش کی مگر الٹا

انہوں نے تمہیں رام کر لیا اور تم نے مزید کچھ دن رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب سوچو ذرا وہ کیا بات تھی جس نے تم سے اپنا فیصلہ بدلوا دیا؟ ‘‘

وہ الجھ سی گئی۔ اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

حذیفہ...‘‘ اس نے پکارا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرا دیا۔ ’’

ابھی میری بات جاری ہے۔ تم اچھے بچوں کی طرح چپ ہو کے سنتی جاؤ۔ نمبر تین ’’ جب تمہیں علم ہوا کہ تمہاری شاہ زر سے شادی ہو رہی ہے تو تم نے پھر اپنی سی کوشش کی۔ تم نے قادر المطلق کے لکھے کو بدلنا چاہا۔ اگرچہ یہ فیصلے زمینی لوگوں نے کیے تھے لیکن لکھے تو اللہ نے تھے نا۔ تم نے شادی سے بچنے کے لیے فرار کا راستہ منتخب کیا اور حویلی سے نکل آئیں۔ تم نے آخری حد تک پوری کوشش کر لی کہ کسی نہ کسی طرح تم اس گاؤں سے نکل جاؤ، تم یہ ملک چھوڑ دو لیکن تم کچھ بھی نہ کر پائیں۔ اتنی محنت اور احتیاط کے باوجود شاہ زر کے مزارعے نے تمہیں دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ تمہیں واپس حویلی جانا پڑا۔ اپنی ناپسندیدگی کے باوجود شاہ زر سے شادی کرنا پڑی۔ تو پھر غور کرو وہ کون سی قوت تھی جس نے نکاح نامے پر دستخط کروا دیئے تھے۔ تم کہتی ہو تم اپنے پاپا کے الفاظ سے ہرٹ ہوئی تھیں لیکن اگر وہ یہ الفاظ استعمال نہ کرتے پھر بھی تمہاری شادی اسی سے ہونی تھی۔ پہلے ہی نمبر پر تم یہ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیتیں۔ اس سے مدد مانگتیں تو کیا وہ مدد نہ کرتا۔ نہیں مشعال! اس نے یونہی طے کیا ہوا تھا۔ بس تم غلط کرتی رہی ہو۔ حق خودارادیت کا حق ہر ایک کو حاصل ہے مگر یہ بھی تو سوچو وہ

اللہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی کیا مرضی ہے۔ کیا ہماری خواہشیں' ہمارے ارادے' ہمارے منصوبے اس سے بڑھ کر ہیں... نہیں کبھی بھی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

پھر شادی کے بعد تم لاہور نہیں آنا چاہتی تھی مگر شاہ زر تمہیں زبردستی لے آیا۔ تم نے کوشش کی کہ تم یہاں سے نکل جانے کی کوئی سبیل نکال لو مگر تمہارے کچھ کرنے سے پہلے ہی تمہارے شوہر کو سب علم ہو گیا۔ کبھی اندازہ لگایا کہ اس نے وہ پوائنٹ کیوں اٹھایا تھا۔ بقول تمہارے بل کی زیادتی کبھی بھی اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہی۔ اس نے کبھی بھی پیسے کو اہمیت نہیں دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیسے بے دریغ خرچ کرنے والا بندہ ہے تو پھر اس نے بل کی زیادتی پر سوال کیوں اٹھایا تھا۔

مشعال! تم نے سوچا وہ شخص تمہارا ہر منصوبہ اور ہر حربہ ناکام بنا رہا ہے مگر یہ کیوں نہ سوچا کہ جب تم بالکل موت کے دہانے پر تھیں تو وہ کون سی ہستی تھی جس نے تمہیں حرام موت سے بچا لیا۔ یہاں پر بھی تم نے شاہ زر کے خلوص کو غلط نگاہ سے دیکھا۔ اسے تم نے برا بھلا کہا۔ بعد میں تم نے اپنی حسب خواہش اس سے طلاق کا مطالبہ بھی کر دیا مگر تم نے کبھی غور کیا کہ اس نے تمہارا مطالبہ فوراً کیوں نہیں مان لیا۔ بلکہ اس کے برعکس اس نے تمہیں انتظار کرنے کو کہا تھا۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ فوراً تمہیں طلاق دے دیتا۔ یہاں تم نے صرف اتنا سوچا کہ وہ اذیت پسندی کی حد تک پہنچا ہوا ہے اسی لیے اس نے تمہیں فوراً طلاق نہیں دی۔ وہ تمہیں اب بھی اذیت دینا چاہتا ہے۔ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے تمہیں چھوڑنے پر تیار

نہیں۔ نہیں مشعال ! تم صرف شاہ زر کو الزام دے کر غلط کر رہی ہو۔ اپنی ذات ' اپنی خواہشوں ' اپنے منصوبوں سے ہٹ کر ذرا سوچو تو تمہیں صاف راستہ دکھائی دے گا۔ جب تک اپنے ذہن کو خود میں الجھائے رکھو گی یوں ہی میری طرح بھٹکتی رہو گی۔ تم اپنے بی ہیویئر کی بدولت نہ صرف خود کو نقصان پہنچا رہی ہو بلکہ اپنے والدین شاہ زر اور دوسرے رشتوں کو بھی پریشان کر رہی ہو۔ ایک صاف شفاف راستے کا تعین کرو اور دیکھو کس راستے پر چلنے میں تمہاری بھلائی ہے۔ میں نے تمہارے سامنے کھول کر ہر بات رکھ دی ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہوں میں اب تم سے محبت نہیں کرتا۔ عشق مجازی کی بجائے اگر عشق حقیقی کو دیکھا جائے تو زیادہ فائدہ مند ہے۔ ذہنی و جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے۔ میرا اور تمہارا تعلق تو اور ہی قسم کا تھا۔ بے غرض اور پر سکون سا۔ میں جو تمہاری طرف کھینچتا چلا گیا تھا تو یہ محبت نہیں تھی ' بس ہم دونوں ایک دوسرے کے راہبر بنے رہے۔ تم بھٹکنے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے مجھے تم سے ملا دیا اور میں جو بھٹک رہا تھا تو تم نے میری راہیں آسان کر دیں۔ تمہاری شرط نے مجھے سنوار دیا۔ میں نے اپنے رب اور نبی ﷺ کو پا لیا اور اسی بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ ہمارے ارادوں ' سوچوں ' منصوبوں اور خواہشوں سے بڑھ کر بھی ایک پاور فل اتھارٹی ہے جس کے ہاتھ میں ہماری ساری زندگی کا اختیار ہے۔ ہمارے ساتھ جو اچھا برا ہوا یا ہو گا یہ سب اسی کی مرضی سے ہو گا۔ اس کے پاس ہماری زندگی کی ایک ایک بات لکھی ہوئی ہے جو ہماری تقدیر ہے۔ وہ قسمت جسے انسان اپنے اچھے اعمال ' اچھی سوچوں اور اپنے کردار کی خوبیوں سے سنوار لیتا ہے مگر خدا کے لکھے کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ ہوتا وہی ہے جو پیدا کرنے والی ہستی نے لکھ دیا

ہے۔ تدبیر انسان کو سنوارتی ہے اور تقدیر انسان کو زندگی گزارنے کے لیے کمربستہ رکھتی ہے۔ اگر تقدیر پر ایمان نہ ہو تو سب کچھ ملیامیٹ ہو جائے۔ ہماری اپنی ذات بھی' یہ دنیا بھی۔ ہمارے اعمال اس قابل نہیں کہ ہم اللہ کے سامنے سر اٹھا کر بڑی شان سے کھڑے ہو سکیں۔ مشعال! تمہیں خود کو بدلنا ہو گا۔ اپنی سوچ کو اپنے نفس کا غلام مت بناؤ۔ یہ سوچو کہ ہماری تقدیر' ہمارے کردار' سوچوں' اعمال' ارادوں' خواہشوں اور فیصلوں حتیٰ کہ پوری زندگی کو کس حد تک سنبھالے ہوئے ہے۔" وہ اتنی دیر تک مسلسل بولا تھا پھر رک گیا۔ ایک گہری طویل سانس لی پھر بولنے لگا۔

میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ میرے خواب' خیال' سوچیں' خواہشیں اور منصوبے میری اپنی ذات کے گرد گھومتے تھے۔ میں نے جو منصوبے بنائے تھے وہ سارے کے سارے ایک پر آسائش' خوشحال زندگی کے تھے جس میں والدین کے ساتھ ساتھ ایک محبت بھرے جیون ساتھی کا بھی وجود تھا۔ میں نے تم سے شادی کا سوچا تھا۔ میں نے اور بھی بہت سے خواب دیکھے تھے۔ بے شمار ارادے باندھے تھے مگر میرے اللہ نے میری خواہشوں کا مرکز بدل دیا۔ مجھے ایک روشن راستہ دکھادیا جو میری تقدیر میں رقم تھا۔ جس پر مجھے ہر حال میں چلنا تھا۔ میرے والدین نے نہ جانے میرے بارے میں کیا کیا خواب دیکھے تھے مگر میں مشعال! پچھلے ماہ ایک مسجد کا نقشہ بنا کر آیا ہوں اور میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی ہے کہ وہ مجھے نیک کام کرنے میں میری مدد فرمائے۔ یہ مسجد

بنوانے میں مجھے استقامت بخشے اور میرے ارادوں کو پختہ کرے کیونکہ جہد مسلسل، عمل مستحکم، یقین پیہم ارادے اور تقدیر سب مل کر ہی زندگی سنوارتے ہیں۔ میں نے پاکستان آنے کا کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ اس وقت میں یہاں موجود ہوں۔ آگے بھی زندگی جہاں لے گئی میں چلا جاؤں گا کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہے۔ ہمارے لاکھ رونے، گڑگڑانے، دعائیں مانگنے سے تقدیر بدلے گی نہیں البتہ سنور جائے گی۔ ہم اللہ سے دعائیں مانگ کر زندگی پر سکون بنالیں گے مگر تقدیر وہی رہے گی جو اس نے لکھ دی ہے یہ اور بات ہے کہ ہماری دعائیں ہماری تقدیر کو سنوار دیتی ہیں۔" حذیفہ اب خاموش ہو گیا۔

تم یہ مت کہو کہ میں اللہ پر بھروسہ نہیں رکھتی۔ مجھے اس پر بھروسہ ہے۔ میں سب مانتی ہوں لیکن تمہاری یہ باتیں میری کچھ سمجھ نہیں آرہیں۔ نہ جانے کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شاہ زر میرے ساتھ جو کچھ بھی کرتا رہا ہے ارادتاً بلکہ انتقاماً کرتا رہا ہے۔ باقاعدہ پلاننگ کے تحت۔ تم کم از کم اس کے سلوک کو خدا کی رضا اور تقدیر کا لکھا نہ کہو۔ اس نے جان بوجھ کر مجھ سے شادی کی۔ وہ میرے ساتھ بدترین سلوک کرتا رہا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں نے فرار کی ہر ممکن کوشش کی مگر میری وہ ہر کوشش شاہ زر نے ناکام بنادی۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو تم کیوں مجھے زور دے رہے ہو کہ میں اس جیسے غلط بندے کے ساتھ زندگی گزاروں۔ خود کو یہ باور کرواؤں کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تقدیر کا لکھا ہے۔ ان جاہل عورتوں کی طرح پٹتی رہوں۔ نہیں حذیفہ! پھر مجھ میں اور ان دیہاتی ان پڑھ

جاہل عورتوں میں تو کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے خود کو پٹوا رہی ہیں یہ کہہ کر ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے تقدیر کا لکھا ہے۔ اللہ کی رضا ہے۔ اللہ نے تو عورت کو ایسے مردوں سے علیحدہ ہو جانے کا اختیار دیا ہے تو تم یہ تقدیر کو درمیان میں کیوں لا رہے ہو۔" وہ بہت الجھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بھی ایسا ہی ہو گیا تھا۔ حذیفہ بغور دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی ویسی ہی تھی جیسی اس کو پہلی نظر میں لگی تھی۔ وہی چہرے کا دل پرور تاثر' آنکھوں کی الوہی سی چمک' وہی انداز' وہی اطوار' وہی بات کرنے کا اسٹائل اور مایوسی و ناامیدی کی کیفیت۔ جس نے اس کا اتنا طویل لیکچر بھی بے اثر کر دیا تھا۔ البتہ اس کے اندر وہی بے سکونی و اضطراب کی سی کیفیت کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس کے برعکس بظاہر الجھی سی دکھائی دینے کے باوجود بہت پر سکون تھی جیسے اس کے اندر کی دنیا بدل گئی تھی۔ وہ کئی لمحے اس کے روشن روشن' صبیح چاندی سے پرنور چہرے کو دیکھے گیا پھر گہری سانس اندر کھینچتے اس نے نظروں کا زاویہ بدل دیا۔

"تم نہیں سمجھو گی مشعال! دراصل تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ جب میں لندن میں تھا اور تم نے مجھے فون پر بتایا کہ تم شاہ زر سے طلاق لے رہی ہو تو ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے اعصاب پر بم پھوڑ دیا ہو۔ میں تمہیں اتنا احمق اور جذباتی تصور نہیں کرتا تھا۔ اس دن میرے خیالات بدل گئے۔ تم نہ صرف احمق ہو بلکہ جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ خود غرض بھی ہو۔"

وہ ہونٹوں کو بھینچے چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ صرف حذیفہ کی ہی ہمت تھی کہ وہ اس کے منہ پر اسے یہ سب کہہ رہا تھا ورنہ اس نے کسی کو بھی اتنا کچھ کہہ سن لینے کا حق نہیں دیا تھا۔

کوئی مسافر راستہ بھولے تو خضر رہنمائی کو آتا ہے۔ بس اچانک میں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب کچھ آناً فاناً تیار ہو گیا۔ پاسپورٹ بن گیا، سیٹ کنفرم ہو گئی مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں یہاں کیوں آ رہا ہوں۔ بس ایک ان دیکھی جستجو تھی جو مجھے یہاں کھینچ لائی اور جب پہلی ملاقات میں، میں نے تمہیں شاہ زر سے طلاق لینے سے منع کیا تو مجھے پتا چلا کہ اس احساس نے مجھے یہاں لا کھڑا کیا ہے۔ مگر تم وہی احمق ہو۔ خود کو اپنے ہاتھوں سے برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ وہاں سے جہاز میں بیٹھتے ہوئے میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں وہی کرے جو تمہارے لیے بہتر ہے۔ جس میں تمہاری خوشی ہے اور مجھے یقین ہے بلکہ ایمان ہے کہ اللہ وہی کرے گا جو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ اگر شاہ زر کا ساتھ مستقل تمہاری زندگی میں لکھا ہے تو تمہاری ہزار ہا مخالفتوں کے باوجود یہ رشتہ آخری سانس تک قائم رہے گا ورنہ میرے بہت سمجھانے کے باوجود وہی ہو گا جو اللہ نے لکھ دیا ہے۔

”وہ کبھی بھی اپنے بندوں کے ساتھ برا نہیں کرتا۔

کار ڈرائیور نہ جانے کب کا سو چکا تھا۔ اس نے ارد گرد دیکھا اور پھر گھڑی دیکھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ مشعال سر جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

کار ڈرائیور نہ جانے کب کا سو چکا تھا۔ اس نے ارد گرد دیکھا اور پھر گھڑی دیکھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ مشعال سر جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

کیا سوچ رہی ہو؟" اس کے استفسار پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' ایک گہری سانس ’ ’ لی اور گاڑی سے اتر گئی۔

"کچھ نہیں... کافی دیر ہو گئی ہے' مجھے گھر چھوڑ دو' اماں پریشان ہوں گی۔ ’ ’

وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ وہ بھی بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو جگا کر اسے گاڑی ڈرائیو کرنے کو کہا۔

وٗوٗ...وٗوٗ

وہ جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اسی کی طرف سے اس نے گاڑی بھی ہائر کی ہوئی تھی۔ اسے جدھر بھی جانا ہوتا تھا کار ڈرائیور بآسانی اسے لے جاتا تھا۔

میں نے تمہیں جو باتیں سمجھانے کی کوشش کی ہے غور ضرور کرنا۔" راستے میں اس ’ ’ نے مشعال کو کہا تو اس نے غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔ حذیفہ کی باتوں نے اسے بہت پریشان اور الجھا دیا تھا۔ وہ دل گرفتگی سے حذیفہ کو اور پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ وہ شاہ زر کی بیوی تھی مگر اس وقت حذیفہ کے ہمراہ تھی۔ کتنی عجیب بات تھی اور اس کے ہاتھ کی لکیریں بالکل صحیح تھیں۔ اپنی اپنی جگہ پر پرفیکٹ' نہ جانے جھول کہاں ہے اور حذیفہ! وہ قسمت' تقدیر اور

عقیدے کی بات کر رہا تھا جب کہ وہ خود سوچ' ارادوں' خواہشوں' منصوبوں کو ہاتھ مار رہی تھی۔ اور وہ تقدیر پر شاکر ہو کر اپنی منزل کو پا گیا تھا جبکہ وہ ابھی تک بے کنار' بے سمتی بے چینی و کشمکش اور اضطراب کا شکار تھی۔ امید و بیم کی کیفیت میں غرق اپنے نفس کا شکار ہو رہی تھی۔ برا تو اس نے کبھی بھی نہیں چاہا تھا۔ ہمیشہ اپنے لیے اچھا سوچا تھا۔ بہتری کی دعا کی تھی۔ پھر کمی تھی تو کہاں؟ وہ بہت بری طرح الجھ گئی۔ گزشتہ ملاقاتوں میں بھی حذیفہ کچھ ایسی ہی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس وقت چونکہ وہ خود بھی اس کے مسلمان ہونے سے بے خبر تھی اسی لیے خاص دھیان نہیں رہا تھا مگر اب اس کی تمام باتیں خود بخود اس کے دماغ میں گھستی چلی جا رہی تھیں۔ حتی کہ اسے سب کچھ گڈمڈ سا محسوس ہونے لگا۔ اپنے ہاتھ کی لکیریں' اپنی قسمت اللہ کا لکھا' خواہشیں' ارادے' خواب' منصوبے... سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ صاف شفاف تھا تو صرف ایک عکس تھا۔ وہ دم سادھے اسے پہچاننے لگی۔ بند آنکھوں میں وہ عکس گھستا اس کی آنکھوں کو چندھیاتا جا رہا تھا۔ وہ تصور کس کا تھا۔ وہ بغور جانچنے لگی۔

شاید شاہ زر کا۔" اس نے خود کلامی کی لیکن نہیں وہ تصور شاہ زر کا نہیں تھا۔ اس نے '' بے تابی سے آنکھیں کھول کر پھر بند کیں۔ پھر وہی دھندلا دھندلا سا عکس سامنے آ رہا تھا۔ تیز روشنی کی بدولت عکس واضح نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بدستور بند رکھیں۔ حتی کہ وہ عکس واضح ہونے لگا تھا۔ وہ تصور کر کے حیران رہ گئی۔

اس کی آنکھوں کی سطح پر واضح ہونے والا عکس نہ تو شاہ زر کا تھا اور نہ ہی حذیفہ کا۔ ماما‘ پاپا اور ابیشا کے تصور بھی نہیں تھے۔ یہ عکس اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ پھر یکدم وہ تصور ختم ہو گیا۔ آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ اس نے بے اختیار گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ پوری طرح سے پسینے سے نہائی ہوئی تھی۔ پیشانی پر آبدار موتی چمک رہے تھے۔ حذیفہ جو اسے بغور دیکھ رہا تھا اس کے یوں بے اختیار آنکھیں کھولنے پر مسکرانے لگا۔

کیا نظر آیا...؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ اسے تو خود کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ’ ’

‘ ‘ ...حذیفہ ’ ’

گھبراؤ نہیں... جب تم نے مجھے مسلمان ہونے کو کہا تھا تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ’ ’
“معاملہ ہوا تھا مگر پھر سب کچھ واضح ہوتا گیا۔ مجھے یقین ہے تم بہت جلد اپنی منزل کو پالو گی۔

ۇۇ...ۇۇ

“مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ اگر تم گاڑی بھیج دو تو میں اور اماں چلی جائیں گی۔ ’ ’

وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب وہ کمرے میں اچانک چلی آئی۔ جب سے وہ گاؤں سے یہاں آئی تھی شادی کے کپڑوں سے ہی گزارہ کر رہی تھی۔ موسم بدل رہا تھا۔ سردی پڑنے لگی تھی اور موسم کی مناسبت سے اس کے پاس کوئی کپڑے نہیں تھے اور جب تک وہ اس کے گھر

میں تھی وہ اس کی ذمہ داری تھی اسی لیے اب اس کے سامنے کھڑی شاپنگ کا کہہ رہی تھی۔ وہ سن کر چپ ہو گیا۔

ہوں... ٹھیک ہے۔" بہت مختصر جواب دے کر وہ خاموش بھی ہو گیا۔ وہ جس خاموشی ’ ’ سے داخل ہوئی تھی اسی خاموشی سے اپنا تاثر چھوڑے چلی بھی گئی۔

بعد میں تقریباً وہ دوپہر تک گاڑی کا انتظار کرتی رہی۔ مگر گاڑی نہیں آئی تھی۔ انتظار کی کوفت سے تھک ہار کر منہ بسورتی وہیں لائونج میں رکھے صوفوں میں سے ایک پر لیٹ گئی۔ شاہ زر پر بے پناہ غصہ آ رہا تھا جو کہہ کر بھول گیا تھا۔ ایک دفعہ تو اس کے آفس اور موبائل کے نمبرز پر بھی ٹرائی کر چکی تھی۔ آفس میں وہ نہیں تھا اور موبائل بھی آف تھا۔ اماں نے اس کے غصے کو دیکھتے کہا بھی تھا کہ وہ ٹیکسی لے کر چلی جائیں گی مگر اس اجنبی شہر میں تنہا اماں کے ساتھ جانے کو اس کا دل نہیں مانا تھا۔

وہ اس وقت پوری طرح نیند میں غرق تھی جب شاہ زر گاڑی سمیت لوٹ آیا تھا۔ اسے سامنے ہی صوفے پر لیٹے ہوئے دیکھا تو اسے صبح کی کہی گئی بات بھی یاد آ گئی جسے وہ ایک اہم کام میں الجھ کر بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔ اب گھڑی دیکھی تو ساڑھے چار بجے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ اسے اپنے بھولنے پر افسوس نے آ گھیرا۔

مشعال نے گاڑی کا بہت انتظار کیا تھا۔ کہاں تھے تم؟" اماں اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ ’ ’

معاف کیجئے گا اماں! ایک بہت اہم کیس آپڑا تھا۔ سارا دن اسی میں الجھتے کچھ بھی یاد ’ ’ ”نہیں رہا تھا۔ آپ اسے اٹھائیں میں ذرا چینج کرلوں پھر اسے شاپنگ کے لیے لے چلتا ہوں۔

وہ اماں کو ہدایت دیتے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اماں مشعال کو اٹھانے لگیں۔ اٹھنے کے بعد جب اسے علم ہوا کہ وہ شاہ زر کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہی ہے تو دل مسوس کر رہ گئی۔

”لیکن اماں! اس وقت... میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا اب۔ ’ ’

لیکن ویکن کچھ نہیں۔ شاہ تیار ہو رہا ہے۔ تم بھی تیار ہو جاؤ۔ چلو شاباش جلدی ’ ’ کرو۔” وہ اسے زبردستی بازو سے پکڑ کر کھڑا کرنے لگیں۔ مردہ دلی سے وہ تیار ہونے کو چل دی تھی۔ جب تیار ہو کر باہر آئی تو شاہ زر گاڑی کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے اس کا منتظر تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

ایم سوری! میری وجہ سے تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ ایکچوئلی جاتے وقت مجھے اچھی طرح ’ ’ یاد تھا مگر بعد میں بالکل بھول گیا۔” گاڑی ریورس کرتے ہوئے وہ اس سے معذرت کر رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ حیران ہوئی۔ اس نے اس سے اپنی بھول پر معذرت کی تھی۔ حیرت کا مقام تھا۔ کسی سے معذرت کرنا یا معافی کے الفاظ بولنا' شاہ زر کا خاصانہ تھا۔ وہ اسے بہت اچھی طرح جانتی اور سمجھتی تھی۔ وہ چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی جو بہت مہارت اور توجہ سے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔ وہ اس کے معافی پر بالکل خاموش رہی۔ اس کی خاموشی محسوس کر کے اس

نے بھی چہرے کا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ پھر رسماً مسکرا دیا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اس کی مسکراہٹ سے خائف ہوئی باہر دیکھنے لگی۔

’’پہلے کہاں جانا ہے؟‘‘ اس کی آواز پر اس نے ایک دفعہ پھر چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ پھر گردن نفی میں ہلانے لگی۔

’’آئی ڈونٹ نو... مجھے یہاں کے نوٹیکز اور شاپنگ مالز کا کچھ علم نہیں۔ اسی لیے تو کہا تھا کہ ڈرائیور ساتھ ہو گا تو شاپنگ کرنے میں سہولت رہے گی ورنہ میں تو اماں کے ساتھ ٹیکسی پر بھی جا سکتی تھی۔‘‘ اس نے گویا جتا دیا۔

مشعال کی بات پر شاہ زر نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد اس نے گاڑی شاپنگ مال کے سامنے روک دی۔ شاپز میں اس قدر رش تھا کہ وہ کچھ لمحے بھونچکا رہ گئی۔ وہ بہت عرصے بعد اس قدر پر ہجوم ماحول کا حصہ بنی تھی۔ دماغ میں سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ یہ سب کچھ اسے بہت نیا نیا مختلف و منفرد لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ خریداری تک کرنا بھول گئی۔ بس خوشی و شوق، حیرت و انبساط سے ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنے ہونے کا یقین کر رہی ہو۔ پھر جب دماغ کچھ سیٹ ہوا تو بہت یقین اور آرام سے اپنی پسند کی شاپنگ کرنے لگی۔ جن میں کچھ ٹی شرٹس تھیں، جینز تھیں، شلوار قمیص کے علاوہ اس نے موسم کی مناسبت سے جوتے، شالز اور جرسیز بھی لی تھیں۔ ہم رنگ کپڑوں کی میچنگ جیولری بھی تھی۔ وہ تھوڑی بہت حیران بھی ہوئی۔ جس چیز کی طرف اشارہ کرتی گئی تھی جو چیز بھی پسند

آتی گئی تھی شاہ زر لے کر دیتا گیا تھا۔ خاص طور پر اس نے شرٹس اور جینز صرف اسے چڑانے کے لیے لی تھیں اور کمال حیرت یہ تھی کہ اس نے بغیر کسی اعتراض کے لینے دی تھیں۔ شاپنگ سے فارغ ہوتے ہوئے رات کے دس بج گئے تھے۔ شاپنگ سے فراغت کے بعد شاہ زر اسے گھر لے جانے کی بجائے ہوٹل میں لے آیا تھا۔ یہ اس کے ساتھ ہوٹل میں کوئی پہلا ڈنر تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے لگی۔ کھانے کا آرڈر دے کر شاہ زر اسے دیکھنے لگا۔ شاپنگ کے لیے آنے سے پہلے وہ بالکل چپ چاپ اور خاموش تھی مگر اس وقت بہت ہی فریش، ہشاش بشاش اور تروتازہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ چہرے پر موجود تاثر ہوٹل کے اس خوبصورت حساس ماحول میں کچھ اور بھی نکھر کر سامنے آیا تھا۔ چمکتا دمکتا، موتیوں کی طرح روشن و صاف شفاف، چاندنی کی طرح بہت پر نور، سورج کی نقرئی کرنوں کی طرح اجلا اور معصوم۔ وہ بہت محویت سے اس کے چہرے کے نقوش کی جاذبیت و ملائمت ییں کھویا رہا۔ ویٹر کھانا سرو کرنے لگا تو وہ اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔

فیملی کیبنز میں اس وقت بہت چہل پہل اور رونق تھی۔ خوبصورت، ہنستے، مسکراتے، جھلملاتے، دلفریب چہروں والے پر سکون و مطمئن کپلز اور بچے۔ اسے یہ ماحول بہت مکمل اور مانوس سا لگا۔ مشعال پوری طرح ارد گرد کے لوگوں کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

بہت خوش ہو؟” کھانا کھاتے ہوئے اس سے رہا نہ گیا تو اس سے پوچھ لیا۔ جواباً وہ بے ’ ’ ساختہ ہنستی چلی گئی تھی۔ جیسے اس نے شاہ زر کے سوال کو انجوائے کیا۔

تمہیں کیسا لگتا ہے؟” فرائیڈ فش سے کانٹوں کے ساتھ طبع آزمائی کرتے الٹا اسی سے ’ ’ دلکشی سے ساتھ پوچھنے لگی۔ بہت خوبصورت مسکراہٹ رقصاں تھی اس وقت مشعال کے چہرے پر۔

یہی کہ تم بہت خوش ہو۔” اس نے خود پر قدغن نہیں لگائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ’ ’ دیکھ کر بولا۔

واقعی... پھر یقین کر لو کہ میں بہت خوش ہوں۔ رئیلی مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ ’ ’ ”میں تمہاری موجودگی میں اس قدر آزادی سے اپنی مرضی سے سانس لے رہی ہوں۔

وہ طنزیہ کہہ رہی تھی۔ اس کی اس استہزائیہ مسکراہٹ پر وہ چپ ہو گیا۔

تم نے ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک ماہ سے اوپر ہو چلا ہے۔ آخر کیا ارادہ ’ ’ ہے تمہارا؟” کچھ دیر بعد کھانا کھاتے اس نے پوچھا تو وہ کچھ لمحے بالکل چپ رہا پھر بتانے لگا۔

بس چند دن اور انتظار کر لو پلیز... میں نے چچا جان سے بات کی تھی۔ ان کا ردعمل ’ ’ ”بہت سخت ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ انہیں ایک دو دن میں ہی قائل کر لوں۔

تم ماما پاپا کو درمیان میں لائے بغیر بھی تو مجھے چھوڑ سکتے تھے۔" کچھ تیکھے پن سے کہا گیا۔

ہاں چھوڑ سکتا ہوں اور چھوڑ بھی دوں گا۔ اگر چچا جان ان دنوں میں راضی نہ ہوئے۔" اس نے نظر بھر کر مشعال کے چہرے پر چھائی ہوئی ناگواری دیکھی۔ "مشعال! یہ ایک فارملیٹی ہے۔ ایسی بہت سی باتیں جو ہمیں ناگوار گزرتی ہیں' وہ ہمیں کرنا پڑتی ہیں کیونکہ یہ حقیقت ہے جن کو ہم رسم و رواج' فرسودہ واحمقانہ باتیں کہہ کر ریجیکٹ کر دیتے ہیں وہ ہمارے اندر تک اپنی جڑیں گاڑھے ہوئے ہوتی ہیں۔ ہم بہت چاہنے کے باوجود ان کو ایک دم اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتے۔ ان رسم و رواج' اصول و قواعد کو مٹانے اور ختم کرنے میں کچھ عرصہ لگے گا۔ تم میری نیت پر شک مت کرو۔ وقت گزرنے کے بعد تمہیں خود بخود احساس ہو جائے گا کہ یہ تاخیر کیوں فائدہ مند تھی۔ میں بہت جلد تمہیں چھوڑ دوں گا۔" مشعال کی طنزیہ مسکراہٹ نے اگرچہ اسے بہت تکلیف دی تھی مگر وہ پھر بھی بہت رسانیت سے مخاطب تھا۔

تم یہاں سے چلے جانے کے بعد کیا کرو گی۔ میرا مطلب ہے چچا جان کے پاس جاؤ گی یا پھر..." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے پھر دیکھنے لگا۔

تم کچھ زیادہ پرسنل نہیں ہو رہے۔" اس نے تیکھے انداز میں اسے دیکھتے ٹوک دیا۔

"میں کیا کروں گی اور کہاں جاؤں گی تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔ اور نہ ہی میں نے اس

بابت خود کچھ سوچا ہے مگر یہ بھی سچ ہے میں اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کروں گی۔ خاص طور پر تمہارے ساتھ گزارے گئے یہ تلخ پل میری ساری زندگی پر حاوی رہیں گے۔ میں جہاں کہیں بھی جاؤں گی تمہارا سلوک مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔" سرد لب و لہجے میں کہتے گویا اس نے شاہ زر کو گونگا ہی کر دیا تھا۔ وہ مزید کوئی بات کہے' نظر ملائے بغیر کھانا کھانے لگا۔ اندر ہی اندر اس سے یہ سب پوچھنے پر عجیب افسوس بھی ہوا۔ دونوں طرف سے خاموشی تھی جب کہ ہوٹل کا ماحول بہت سحر انگیز ہو رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی چند لقمے مزید لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر مشعال بھی فوراً کھڑی ہو گئی۔

واپسی کا سفر پہلے کی نسبت زیادہ بے سکونی اور تلخی میں گزرا تھا۔ بہت رش ڈرائیونگ کرتے مشعال کو گھر پہنچا کر وہ خود سڑکیں ناپنے نکل گیا تھا۔

وِوِ...وِوِ

حذیفہ کے ساتھ مشعال کا مینار پاکستان دیکھنے کا پروگرام طے تھا۔ شاہ زر کے آفس چلے جانے کے بعد وہ حذیفہ کے آنے پر تیار ہو کر اماں کو بتا کر نکل آئی۔ اس دن کے برعکس وہ آج اپنے مخصوص لباس میں تھی۔ یعنی پینٹ شرٹ اور اسکارف میں۔ حذیفہ اسے اس لباس میں دیکھ کر ٹھٹکا ضرور تھا لیکن کچھ کہا بہت دیر بعد۔

' ' تم پر شلوار قمیص اور دوپٹہ زیادہ سوٹ کرتا ہے۔" مینار پاکستان کی سیڑھیاں طے کرتے اس نے کہا تھا۔ وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ چہرے کی طرح اس قدر نقرئی ہنسی تھی کہ پاس

سے گزرتی دو لڑکیاں پلٹ کر دیکھنے لگیں۔ خوبصورت سراپے اور چمکتے چمکتے سجے چہرے کا حسن عروج پر تھا۔

“آئی نو... اسی لیے تو میں وہ لباس پہن کر نہیں آئی۔ اگر کسی کا دل مجھ پر آجاتا تو بھلا میں کیا کرتی۔” وہ شرارت سے حذیفہ کو دیکھتے کہہ رہی تھی۔ پہلے تو وہ اس کی بات پر گھورتا رہا پھر خود بھی ہنسنے لگا۔ وہ ایسی ہی بے باک تھی۔

“شرم کرو۔ آج یہی بات تمہارے شوہر صاحب نے سن لی تو وہ تمہیں قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔” وہ لہجے میں مصنوعی خفگی سموئے اسے دھمکا رہا تھا۔ وہ ڈھیٹ بنی ہنستی رہی۔

“اوں... ہوں... اب کبھی قتل نہیں کرے گا۔ لگتا ہے سارا دم خم نکل گیا ہے۔ جو بھی کہہ جاؤں ہر کڑوی کسیلی آرام سے سن لیتا ہے جیسے اس کے فیورٹ موضوع پر اس کے سامنے اظہار خیال کیا جارہا ہے۔” شاہ زر کا ذکر آتے ہی وہ سنجیدگی سے بتانے لگی۔

“اوہ... تو ترس کھایا جارہا ہے۔ بھئی یہ تو پہلے سے زیادہ خطرناک علامات ہیں۔ میرا خیال ہے تمہیں حفاظتی اقدامات کے طور پر دو تین لیڈی کانسٹیبلز اپنے ساتھ رکھ لینی چاہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پاگل نہ ہو گیا ہو۔” وہ ابھی تک مذاق کے موڈ میں تھا۔ وہ اسے گھورنے لگی۔

بے فکر رہو۔ اول تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور میں بھی کوئی ترس ورس نہیں ’ ’ کھا رہی۔ جہاں تک لیڈی کانسٹیبلز کی بات ہے تو اس کے لیے میں اکیلی ہی کافی ہوں۔“ وہ اسے چڑاتی سیڑھیاں تیزی سے چڑھنے لگی تھی۔ پھر وہ جیسے ہی آخری سیڑھی پر پہنچی اسے بہت تیزی سے بڑے زور کا چکر آیا۔ اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے پاس سے گزرتی خاتون کا کندھا بے اختیار تھام لیا۔

کیا ہوا بیٹی؟“ خاتون نے فوراً اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ اس نے بمشکل ’ ’ آنکھیں کھول کر اپنے سامنے کھڑی خاتون کو دیکھنے کی کوشش کی جو بڑی پر شفقت نگاہوں سے اس کا سراپا جانچ رہی تھیں۔ اس دوران حذیفہ بھی اوپر آ گیا تھا۔ اسے خاتون کے بازوؤں میں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

واٹ از پرابلم مشعال! آر یو آل رائٹ؟“ مشعال کو سر تھامے کھڑا دیکھ کر وہ بہت ’ ’ متفکر ہو رہا تھا۔ وہ بمشکل اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا پائی۔

یس... نتھنگ... آئی ایم آل رائٹ۔“ مگر مشعال کا جملہ اس کی پریشانی دور نہیں کر پایا ’ ’ تھا۔ فکر مندی بدستور اس کے چہرے پر منجمد تھی۔ بلکہ اب ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ایسی ہی کچھ خاص صورتحال اس کے اپنے چہرے پر بھی تھی۔ ہفتہ ہو گیا تھا اس کی ایسی حالت ہو رہی تھی۔ اس دن شاپنگ کرتے اس کا دماغ مسلسل سر سراتا رہا تھا اور آج پھر اچانک وہی حالت ہو گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتی خاتون اور حذیفہ کو ریلیکس کرنے لگی۔

اوکے... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بہت عرصے بعد اتنی ساری سیڑھیاں ایک ساتھ ’ ’
چڑھی ہوں ناں تو اسی لیے چکر آگیا۔‘‘ وہ خود کو ٹھیک ظاہر کر رہی تھی۔ حذیفہ کو یقین دلانے
کو دانتوں کی نمائش بھی کرنے لگی تھی۔ خاتون مطمئن ہو کر اپنے بازو ہٹا کر اسے دیکھنے لگیں۔

ہو سکتا ہے بیٹا یہ ٹھیک ہوں مگر آپ اپنی بیگم کا چیک اپ کروائیں کیونکہ یہ چکر ’ ’
بلاوجہ نہیں آتے۔‘‘ خاتون حذیفہ کو دیکھتے ہوئے آرام سے کہہ کر ایک طرف چلی گئی تھیں۔
اسے بلاوجہ کی شرمندگی نے آ گھیرا۔ خاتون کا جملہ دماغ سے چپک گیا تھا۔ اوپر سے حذیفہ کو
مخاطب کر کے ’’اپنی بیگم‘‘ کہنا اس کا چہرہ سرخ کر گیا۔ شاید حذیفہ نے اس کی فکرمندی میں
خاتون کی بات پر توجہ نہیں دی تھی مگر اسے جو شرمندگی ہو رہی تھی وہ اپنی جگہ پر برقرار تھی۔
وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ایک طرف ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ حذیفہ تقریباً بھاگ کر اس کے پیچھے
آیا۔

صحیح کہہ رہی ہیں خاتون۔ تمہیں اپنا چیک اپ کروانا چاہیے۔ بہت ویک اور کمزور ’ ’
دکھائی دے رہی ہو۔ اپنا چہرہ دیکھا ہے۔ کیسا پیلا پھٹک ہو رہا ہے۔‘‘ وہ مسلسل اس کی پریشانی میں
ہلکان ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

تم تو خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ تم جانتے تو ہو ایک عرصہ یہ باہر کی دنیا نہیں دیکھی ’ ’
تھی۔ پہلے گاؤں کا ماحول اور پھر یہاں شاہ زر کا گھر ہی میرے لیے پوری دنیا تھا اب جو اچانک
اتنی ساری سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی ہوں تو چکر تو بہرحال آنے ہی تھے۔ ٹانگیں علیحدہ شل

ہو رہی ہیں۔ پتا نہیں اس ونڈر فل بلڈنگ کے آرکیٹیکچر کو کس پاگل نے اتنی ساری سیڑھیاں بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ سمپل سا طریقہ استعمال کرتا' دو تین لفٹس لگواتا کم از کم ٹورسٹ اور وزیٹریوں میری طرح ہلکان ہونے اور چکرانے سے تو بچے رہتے۔'' وہ لاپروائی کا عظیم الشان مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس قدر ''ڈونٹ کیئر'' والا انداز دیکھ کر حذیفہ بھی قدرے پرسکون ہوا۔ پھر گلے میں ڈالا کیمرہ سیدھا کر کے ارد گرد کے نظارے اس کے اندر قید کرنے لگا۔ اس دوران وہ بالکل خاموش رہی تھی۔ در حقیقت وہ اندر ہی اندر متوحش ہو گئی تھی۔

☆...☆...☆...☆...☆...☆...☆

ایک بات تو بتاؤ۔ اس رات میں نے تمہیں جو کچھ سمجھانے کی کوشش کی اس کا کچھ '' تمہارے فیصلے پر بھی اثر ہوا ہے یا نہیں۔'' وہ اچانک کیمرہ چھوڑ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

میں شاہ زر سے طلاق لوں گی۔ میرا فیصلہ جوں کا توں برقرار ہے۔'' '' وہ بھی کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اٹل' ضدی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ وہ صرف دیکھتا رہا۔ اس نے اپنا فرض پورا کیا تھا وہ اسے سمجھا سکتا تھا مگر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

تمہاری باتوں سے مشعال! ایک بات میں نے بہت شدت سے محسوس کی ہے۔ '' شاہ زراب بھی تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ یہ اس کی محبت ہی تو ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ رہا ہے۔ نہیں تو جس طرح غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے تم سے شادی کی تھی۔ وہ چاہتا تو ساری عمر تمہیں اپنے ساتھ رکھتا۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

ہاں۔ میں نے محسوس نہیں کیا۔ چار حروف پر مشتمل لفظ "محبت" پر اب مجھے کوئی اعتبار نہیں رہا۔ بہت ناپائیدار سا لگنے لگا ہے مجھے یہ جذبہ۔ جھوٹ اور ہوس کی دیواروں سے بنا صرف ایک خول ہے۔ جب چاہے کوئی اس لفظ کو استعمال کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے اور جب چاہے اپنی محبت سے منکر ہو جائے۔ شاہ زر نے ایسا ہی کیا تھا۔ ڈھال بنایا تھا اس لفظ کو۔ محبت کا لبادہ اوڑھ کر وہ انتقام کا درخت پروان چڑھاتا رہا۔ یہ محبت تو نہیں ہے ایک وقت تھا کہ تم مجھے دیوانوں کی طرح چاہتے تھے۔ تم کہتے تھے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور اس دن تم نے کہا کہ وہ محبت نہیں تھی۔ میری شاہ زر کے ساتھ کبھی بھی کوئی کمٹمنٹ نہیں رہی تھی۔ صرف بزرگوں کا فیصلہ تھا جب کہ تمہارے ساتھ میں نے وعدہ کیا تھا۔ تم سے کمٹمنٹ تھی اور جب تم اپنی محبت سے منکر ہو سکتے ہو تو شاہ زر کے جذبے بھی جھوٹے ہو سکتے ہیں۔ ہوس کی دیواروں کے اندر بنے انتقام اور ضد سے تعمیر شدہ ناپائیدار جذبے۔ مجھے نہ تمہاری محبت چاہیے اور نہ ہی شاہ زر کی... خالی خولی محبت سے تو پیٹ نہیں بھرا کرتے۔"

میں منکر نہیں ہوا تھا مشعال! میں نے تمہیں حقیقت بتائی تھی۔ میں واقعی تم سے محبت نہیں کرتا تھا اور جو محبت تھی وہ کسی اور جذبے میں ڈھل گئی۔"

بس کرو حذیفہ! میں اتنی کم عقل نہیں ہوں۔" اس نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ "کیا سمجھ رکھا ہے تم دونوں نے مجھے؟ کٹھ پتلی... ایک جانور؟ یا ایک احمق وجود؟ ایک وہ ہے جو جانوروں جیسا سلوک کر کے معصوم بن رہا ہے اور ایک تم ہو جو محبت کے کبھی دعوے

دار تھے۔ آج راہبر بنے پھر رہے ہو۔ تم صرف اس لیے اپنی محبت سے منکر ہو رہے ہو کہ تم نہیں چاہتے کہ میں تمہاری وجہ سے شاہ زر سے طلاق لوں۔ اس لیے تم یہ سب جھوٹے الفاظ بول رہے ہو کہ کوئی تمہیں یہ نہ کہہ دے کہ تم نے کسی لڑکی کے لیے اسلام قبول کیا ہے۔ ہونہہ... جو لوگ صرف اللہ کے لیے اسلام قبول کرتے ہیں ان کے نزدیک تو ایسی باتیں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتیں اور تمہیں لوگوں کی پرواہ ہے۔ میں تمہارے خلوص کی قدر کرتی ہوں مگر خدارا تم میرے سامنے یہ جھوٹے الفاظ مت بولو۔ تم بھلے مجھے چھوڑ دو۔ کوئی تعلق نہ رکھو مگر میں شاہ زر سے ہر حال میں طلاق لوں گی۔ چاہے تم مجھے تقدیر کے الجھاؤ میں الجھانے کی کوشش کرو یا پھر کسی اور بات میں۔ اس دن میں نے تمہاری باتیں سنیں تو مجھے لگا جیسے تم سچ کہہ رہے ہو اور میں مسحور ہو گئی مگر اب میں مسحور نہیں ہوں۔ میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔" تلخی سے کہتے اس نے بات ہی ختم کر دی تھی۔

نہیں مشعال! تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ اس رات میں نے تمہیں جو بھی کہا سمجھانے ’ ’ کے لیے کہا تھا۔ تمہارے ساتھ سب سے بڑا پرابلم یہ ہے کہ تم نہ اپنے دل کی مان رہی ہو اور ”نہ اپنے دماغ کی۔ تم وہ کر رہی ہو جو تمہیں تمہارا نفس کہہ رہا ہے۔

کیا دل اور دماغ نفس سے ہٹ کر ہیں؟" چبھتے ہوئے مشعال نے پوچھا۔ ’ ’

’’نہیں... مگر تم نے اللہ کی ذات کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ ذرا دل و دماغ کو چھوڑ کر بغیر نفس کی مانے صرف اس نقطے پر غور کرو کہ اللہ کیا چاہ رہا ہے۔ تم ایک دفعہ خود کو خدا کے فیصلوں پر چھوڑ دو۔ وہ ضرور بہتر کرے گا۔‘‘

’’ہم دونوں اس موضوع کو بھول نہیں سکتے۔‘‘ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا تو اس نے فوراً سر ہلا دیا۔ مشعال اس وقت کچھ بھی سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے اس کی بات فوراً مان لی۔ وہ اسے سمجھانا چاہ رہا تھا۔ مشعال وہ نہیں سمجھ رہی تھی۔ سو اس نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا بلکہ موضوع ہی بدل دیا۔

’’مشعال! میں کچھ ہفتوں کے لیے پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے جا رہا ہوں۔ دراصل میں یہاں کے مقامات، عمارتیں اور تاریخی مقامات پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ یوں سمجھو ایک پروجیکٹ ہے جو مکمل کر رہا ہوں۔ لاہور کے اہم مقامات پر اپنا کام مکمل کر چکا ہوں۔ اب شمالی علاقہ جات کے کچھ مقامات ہیں جو دیکھنے کے لیے جا رہا ہوں۔‘‘

حذیفہ نے بتایا تو وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ فطری طور پر اسے دکھ ہوا تھا۔ ان دنوں میں اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ پھر نظریں ہٹا کر وہ غیر محسوس طریقے سے حذیفہ کی جانب سے رخ موڑ کر بلندی سے نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگی جہاں لوگ کیڑوں مکوڑوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ آنکھوں

پر ایک دھند سی اٹ گئی تھی۔ اندر باہر کچھ عجیب عجیب سی آوازیں ابھرنے لگیں۔ اس کا دل ایک دم یہاں سے بھاگ جانے کو چاہنے لگا۔

’’چلو حذیفہ! نیچے چلتے ہیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے اور پھر مجھے گھر بھی جانا ہے۔" پلٹ کر دیکھے بغیر کہ وہ آرہا ہے یا نہیں وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی جب تک حذیفہ اس کے پیچھے آتا وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔

’’کیا بات ہے ناراض ہو گئی ہو؟" آتے ہی وہ پوچھنے لگا۔

’’نہیں... بھلا میں کیوں ناراض ہوں گی؟" اس نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔ بالکل عام سے لب و لہجے میں کہہ رہی تھی۔ حذیفہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے گاڑی میں بیٹھ گیا

’’نہیں... بھلا میں کیوں ناراض ہوں گی؟" اس نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔ بالکل عام سے لب و لہجے میں کہہ رہی تھی۔ حذیفہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

’’اگلی دفعہ میں تمہارے ساتھ کسی بھی ایسی جگہ پر نہیں آؤں گا۔ عجیب ہو تم بھی۔ ابھی میں نے کچھ دیکھا بھی نہیں اور تم چلنے پر بضد ہو۔" وہ مصنوعی خفگی سے کہہ رہا تھا مگر وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اڑ کر گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اپنے اندر باہر ایک عجیب سی بے کلی محسوس کر رہی تھی۔

’’میں شمالی علاقہ جات جانے سے پہلے تم سے ملنے آؤں گا‘ ملو گی؟" اس کے گھر کے سامنے گاڑی رکی تو وہ پوچھنے لگا۔

’’نہیں... شاہ زر کہہ رہا تھا کہ وہ آج کل میں فیصلہ کر دے گا شاید میں گاؤں چلی جاؤں۔ تم ملنے مت آنا۔ بعد میں میں خود تم سے رابطہ کر لوں گی۔" انکار کر کے اللہ حافظ کہہ کر وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی۔ اماں پریشانی میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔ اسے سامنے دیکھ کر رونے لگیں۔

’’اماں! کیا ہوا ہے؟ کیوں اتنی پریشان ہیں اور یہ رو کیوں رہی ہیں؟" اس کا دل گویا پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب تھا کہیں کچھ ہو گیا تھا اس کا دل کہہ رہا تھا۔

’’حویلی سے آذر میاں کا فون آیا ہے۔ تمہارے ابّو کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ان کی "طبیعت.بڑی خراب ہے۔ گاؤں سے باہر نزدیکی ہسپتال میں داخل ہیں۔

’’کیا...؟" وہ حیران پھٹی پھٹی آنکھوں سے اماں کو دیکھنے لگی۔ دماغ میں سنسنی خیز لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا سر پھر چکرانے لگا۔ ایک دم پورے قد سے صوفے پر گری تھی۔ اماں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اپنا رونا دھونا بھول کر اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگیں۔ ملازمہ کو آوازیں دے کر پانی منگوایا۔ بار بار منہ پر چھینٹے مارے‘ پانی پلایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اماں کو دیکھ کر پاپا کا خیال آتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کیسے ہوا... کب فون آیا...؟ اور آپ نے شاہ زر کو اطلاع دی؟“ حالت کچھ سنبھلی تو اماں ’ ’ سے سوال کرنے لگی۔

ہاں... تھوڑی دیر پہلے فون آیا تھا۔ میں نے شاہ زر کو فون کر دیا ہے۔ وہ آتا ہی ہو گا۔“ ’ ’ اماں کے بتانے پر وہ خوفزدہ ہو کر اماں کے گلے لگ کر آنسو بہاتی رہی پھر جیسے ہی شاہ زر آیا وہ فوراً بھاگ کر اس کے پاس پہنچی۔

شاہ زر پلیز! مجھے پاپا کے پاس لے چلو۔ پلیز... انکار نہیں کرنا۔“ وہ جو کہتی تھی کہ ’ ’ اس کا اپنے والدین سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے ماں باپ اس کے لیے مر گئے ہیں۔ وہ اس کا بازو ہاتھوں میں دبوچے بری طرح روتی جا رہی تھی۔ شاہ زر نے ایک دم سے اسے بازو کے حصار میں لیا تھا۔ اسے ساتھ لگائے اندر آیا۔ اماں سے فون کی بابت پوچھنے کے بعد خود اپنے سیل سے دوسری طرف رابطہ کیا۔ ادھر سے نجانے کیا کہا گیا تھا کہ وہ بے حد پریشان ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دونوں گاؤں کے راستے پر تھے۔ وہ اس قدر پریشان تھی کہ بار بار مڑ کر ڈرائیو کرتے شاہ زر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتی۔

شاہو! پاپا ٹھیک تو ہیں؟ انہیں کچھ ہوا تو نہیں پلیز بتاؤ؟“ اس قدر ہراساں تھی کہ کسی ’ ’ پل صبر نہیں ہو رہا تھا۔ شاہ زر سے پوچھنے لگی۔ وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر گاڑی چلاتا رہا۔

“پاپا کو کیا ہوا تھا؟ ان کا ہارٹ اٹیک کیوں ہوا؟” اسے اپنے پہلے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ دوسرا پوچھنے لگی۔ شاہ زر بری طرح ہونٹ کاٹنے لگا۔ یہ حرکت وہ اب اکثر کرنے لگا تھا۔ اس وقت اسے اس کا یہ عمل بہت برا لگا۔

“تم بتاتے کیوں نہیں؟ چپ کیوں ہو؟ کیسے ہوا ہارٹ اٹیک؟” اس کا بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے اس سے الجھنے لگی۔ وہ چہرہ موڑ کر ایک عجیب سی نگاہ ڈال کر دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔ مسلسل گریہ زاری سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

“چچا جان ہارٹ کے مریض ہیں۔ انہیں پہلا اٹیک برطانیہ میں ہوا تھا۔” اچانک بتایا۔

“کیا...؟” اس کے اعصاب پر بم پھٹا تھا۔ وہ بے یقینی سے گردن نفی میں ہلانے لگی۔

“میں غلط نہیں کہہ رہا۔ چچا جان کو پہلا اٹیک تب ہوا تھا جب انہیں علم ہوا کہ تم کسی عیسائی جولف نامی شخص سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ دوسرا اٹیک ہماری شادی کے بعد ہوا تھا جن دنوں تم کہتی تھیں کہ تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارے والدین مر گئے ہیں۔ ان دنوں تمہیں یاد ہو گا چچا جان ہاسپٹلائز ہوئے تھے۔ ان ہی دنوں وہ اپنی بیماری سے لڑ رہے تھے۔ انہوں نے اگرچہ زبردستی تمہاری شادی تو کروا دی تھی مگر اندر ہی اندر وہ تمہاری فکر میں گھلتے رہتے تھے اور تیسرا اٹیک اب ہوا ہے جب انہیں بتایا ہے کہ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔”

وہ سب بتا کر چپ ہو گیا۔ وہ بس بہتی آنکھوں سمیت شاہ زر کو دیکھے گئی۔ وہ بالکل انجان تھی

اور کسی نے اسے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ عالم تحیّر میں غرق تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ شاہ زر سچ کہہ رہا ہے۔ وہ اس کی بے یقینی نوٹ کرتے پھر کہنے لگا۔

رات میری چچا جان سے تفصیلی بات ہوئی تھی۔ تمہیں بتایا تو تھا کہ میں انہیں قائل ’ ’ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر وہ مان گئے تو ٹھیک ورنہ میں تمہیں فیصلہ سنا دوں گا۔ رات کو بھی فون پر میری ان سے اسی موضوع پر بات ہوئی تھی۔ میں نے صاف لفظوں میں انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی طرح راضی نہیں ہو رہے تھے۔ مجھے ان کی طبیعت کا بھی خدشہ تھا۔ سخت لہجے میں بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے آخر میں، میں نے انہیں اپنا فیصلہ سنا کر فون بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی بار انہوں نے فون کیا مگر میں نے ایک دفعہ بھی فون ریسیو نہیں کیا تھا۔ آذر بھائی اور بڑی امی نے بھی فون پر مجھے سمجھانے کی کوشش کی ” تھی۔ میں نے انہیں بھی اپنا فیصلہ بتا دیا تھا اور اب سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر اور شدت سے رونے لگی۔

اسے ماما پاپا اور ابیشا سے بہت محبت تھی۔ وہ جو کچھ بھی کرتی تھی۔ وہ سب صرف ردِ عمل کے طور پر تھا۔ اس نے یہ کبھی بھی نہیں چاہا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی تکلیف میں مبتلا ہو۔ پاپا نے جس قدر غیر جانب داری کا مظاہرہ کر کے اس کی شادی شاہ زر سے کروائی تھی وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔ اس دن حویلی میں واپس لانے سے پہلے انہوں نے جو جو الفاظ استعمال کیے تھے۔ انہوں نے اس کو روح تک چھلنی کر دیا تھا اور آج تک وہ جو کچھ بھی کرتی

رہی تھی صرف اور صرف تلملاہٹ اور ضد تھی۔ وہ ماما، پاپا سے اب بھی اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی ابیشاان سے کرتی تھی۔

''یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ جب سے تم ہماری زندگی میں داخل ہوئے ہو تم نے زہر گھول دیا ہے۔ پہلے تمہاری وجہ سے ماما پاپا آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ پھر تمہاری وجہ سے میرے پاپا مجھ سے دور ہو گئے۔ تم نے مجھے ان سے دور کر دیا۔ صرف تمہاری وجہ سے میں ان سے نفرت کا اظہار کرنے لگی۔ تم نے میرے ارد گرد نفرت ہی نفرت بو دی حتیٰ کہ محبتوں کی پہچان کھو بیٹھی میں۔ جب میں نے تم سے کہا کہ تم مجھے چھوڑ دو تو کیا ضرورت تھی ماما پاپا کو آگاہ کرنے کی۔ سچ تو یہ ہے کہ تم خود ہی نہیں چاہتے کہ تم مجھے چھوڑو۔ کھوٹ تو تمہارے اپنے دل میں ہے اور اب تم نے جان بوجھ کر دیر کی تا کہ پاپا دنیا سے چلے جائیں اور تمہارے راستے میں حائل ہر رکاوٹ ختم ہو جائے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ تم بدل گئے ہو۔ تم پہلے جیسے نہیں رہے مگر تم تو پہلے سے زیادہ گھٹیا ہو گئے ہو۔ محبت تو تم نے کبھی کی ہی نہیں تھی۔ آخر ہو نا اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے جنھوں نے کبھی محبت نہیں کی۔ دولت کے پیچھے بھاگتے رہے۔ بھلا تم ان سے کیسے مختلف ہو سکتے ہو۔ دوغلے جھوٹے دہرے چہرے والے۔ یاد رکھو اگر میرے پاپا کو کچھ ہوا تو میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ پھر سے الزام دینے لگی تھی۔ پھر وہی جملے، پھر وہی اذیت ناک باتیں، وہی طعنے۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر بدستور اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھے ہوئے تھا۔

وہ دونوں سیدھا اسپتال پہنچے تھے۔ پاپا کافی سیریس حالت میں تھے۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔ ویٹنگ روم میں سب کو دیکھ کر ماما کے گلے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔ ساری ناراضگی منٹوں میں ہوا ہو گئی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ اس کے پاپا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

’’بس صبر کرو مشعال بیٹی! دعا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے ابّو کو زندگی دے۔‘‘ بڑی امی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ماما سے الگ کرنا چاہا تو اس نے مضبوطی سے انہیں جکڑ لیا۔

’’ماما! میں پاپا سے ناراض نہیں ہوں۔ کسی سے بھی نہیں ہوں۔ آپ بس ان سے کہیں وہ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ میں ان سے کبھی بھی ناراض نہیں ہوں گی۔‘‘ اس کی بات پر ماما بھی بہت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ بیٹی کو سامنے پا کر وہ ایک دم بکھری تھیں۔ ابیشا جو بمشکل خود کو سنبھال رہی تھی۔ ماں اور بہن کو زار و قطار روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔ اس نے ماما کو چھوڑ کر ابیشا کو گلے لگا لیا تو وہ اور بلک بلک کر رو دی۔ کتنی دیر بعد دونوں بہنیں ایک دوسرے سے ملی تھیں۔ وہ بھی اس قدر نازک صورت حال میں سنبھالنے سے بھی نہیں سنبھل پا رہی تھیں۔ شاہ زر بڑی امی کے اشارہ کرنے پر مشعال کو ابیشا سے جدا کرنے لگا۔

’’آئو میں تمہیں چچا جان کے پاس لے چلتا ہوں۔‘‘ وہ اسے زبردستی ابیشا سے جدا کر کے باہر لے آیا۔ آئی۔ سی۔ یو روم بند تھا۔ وہ دروازے میں لگے شیشے کے اس پار مشینوں اور ڈرپس میں جکڑے سانس لیتے پاپا کے چوڑے بھرپور وجود کو دیکھ کر پھر بے اختیار ہو گئی۔ شاہ زر کے ساتھ لگ کر بری طرح روئی۔

شاہو! میرے پاپا کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ پلیز! میرے پاپا کو بچالو کسی بھی قیمت ’’ پر۔ خدا کے لیے انہیں بچالو۔" وہ بچوں کی طرح اس کے سامنے ہاتھ جوڑے خود سے بے گانہ ہو رہی تھی۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرنے لگا۔

ہوں... روئو نہیں... بس دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ چچا جان کو نئی زندگی دے۔" وہ اس کے ’’ آنسو پونچھ کر دلاسا دینے لگا تو وہ چپ ہو گئی۔

ہماری خواہشوں، سوچوں، ارادوں اور منصوبوں سے بھی بڑھ کر کوئی ہستی ہے اور وہ ’’ اللہ تعالیٰ ہے جو جب چاہے رلا سکتا ہے جب چاہے ہنسا سکتا ہے۔ وہی اللہ جس نے روزاوّل سے انسان کی تقدیر لکھ دی ہے۔ اچھی یا بری اسی کی طرف سے ہے جس میں ردوبدل کی گنجائش نہیں ہے۔ جس طرح انسان اپنی سیاہ کاریوں بداعمالیوں اور شر انگیزیوں سے اپنی زندگی بگاڑ لیتا " ہے اسی طرح اپنی دعائوں اپنے آنسوئوں اور گڑگڑانے سے سنوار سکتا ہے۔

کوئی آواز اس کے اندر پکار رہی تھی۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ اسے لگا جیسے وہ آج منٹوں میں زمین بوس ہو گئی ہو۔ شاہ زر نے اسے دعا کرنے کو کہا تھا۔ بڑی امی نے بھی یہی کہا تھا۔ حذیفہ تقدیر کی بات کرتا تھا اور تقدیر کس نے لکھی تھی۔ اس قادر المطلق ذات نے اللہ تعالیٰ نے۔ اس کا دل کانپنے لگا۔ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ آنکھوں کے سامنے آسمایا۔ ہر بات، ہر عمل، ہر سوچ وہ ریزہ ریزہ ہوتی گئی۔ اسے لگا وہ آج تک اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔

پھر وہ دروازے کے سامنے چکر پہ چکر لگاتے درود شریف کا ورد کرنے لگی۔ بہت عرصے بعد اس کے لبوں پر اللہ تعالیٰ کا ذکر آیا تھا۔

صدق دل سے مانگی گئی دعائیں عرش الٰہی تک ضرور پہنچتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سب کی دعائیں سن لی تھیں۔ رو رو کر گڑگڑا کر عاجزی وانکساری سے مانگی گئی دعا ضرور قبول ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے پاپا کو اک نئی زندگی دی تھی۔ وہ کئی دن ہاسپٹل میں گزار کر حویلی میں آ گئے۔ چند ہفتوں تک عیادت کرنے والوں کا خوب تانتا بندھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ بات مدھم پڑی تو لوگوں اور رشتہ داروں کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی۔

شاہ کمال کی طبیعت سنبھلتے ہی شاہ زر واپس شہر چلا گیا تھا۔ بعد میں سارہ اماں کے ساتھ دوبارہ آیا تھا ایک دن گزار کر دوبارہ اماں کے ہمراہ واپس چلا گیا تھا اور وہ وہیں حویلی میں رہ گئی تھی۔ ہر وقت پاپا کی پٹی سے لگی رہتی تھی۔ ایک لمحہ کو بھی ان سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ جتنی غفلت برتی تھی اب اتنی ہی ان کی خدمت کر رہی تھی۔ ماما' پاپا اس سے بہت خوش تھے۔ پاپا نے ٹھیک ہونے کے بعد اس سے کچھ نہیں کہا تھا سوائے چند جملوں کے۔

'ضروری تو نہیں مشعال بیٹا! بڑوں کے فیصلے ہمیشہ درست ہوں۔ کبھی کبھی وہ بہت زیادہ زیرک ہونے کے باوجود غلط فیصلے کر جاتے ہیں۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ شاہ زر سے تمہاری شادی بھی ایک غلط فیصلہ ہے تو تم دونوں کو اب اختیار حاصل ہے۔ تم دونوں فیصلہ کرنے میں آزاد ہو۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے وہی کیا جو مجھے تم دونوں اور اس خاندان کی

بھلائی کے لیے اچھا اور مناسب لگا اور تم بھی وہی کرو جو تمہیں مناسب لگتا ہے۔ میری طرف سے اب تمہیں اجازت ہے کہ تم شاہ زر سے علیحدہ ہو جائو۔" وہ ان کی ساری بات سن کر جواب میں زبان تک نہ ہلا سکی۔ شاہ کمال نے اسے زبان سے اجازت تو دے دی تھی مگر وہ دل سے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے اور یہ بات اور سچائی ان کے چہرے' آنکھوں بلکہ پورے جسم پر لکھی ہوئی تھی۔

[...خ...]

وہ رہائش والے حصے میں سنگی بینچ پر بیٹھی لامتناہی سوچوں میں غلطاں تھی اور نجانے کیا سوچ رہی تھی جب ابیشا اس کے پاس چلی آئی۔

مشعال آپی! آذر بھائی نے پیغام بھیجا ہے کہ مردان خانے میں آپ سے کوئی ملنے آیا ' ' ہے۔"

کون ہے؟" اسے حیرت ہوئی۔ اس کے جاننے والوں میں ایسا کون تھا جسے مردان ' ' خانے میں بٹھایا گیا تھا اور وہ بطورِ خاص اس سے ملنے آیا تھا۔

حذیفہ۔" وہ نام بتا کر رکی نہیں تھی' واپس پلٹ گئی۔ وہ وہیں بیٹھی کئی لمحے ورطۂ ' ' حیرت میں غرق رہی۔ اس سے حذیفہ ملنے آیا تھا وہ بھی حویلی میں۔ وہ تو گائوں کا ایڈریس تک نہیں جانتا تھا۔ اس نے اسے گائوں کا فون نمبر تک نہیں دیا تھا۔ پھر اس وقت اس کی آمد ناقابلِ یقین تھی۔ وہ جلدی جلدی بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں درست کرتی ہوئی مردان

خانے میں چلی آئی۔ جیسے ہی دستک دے کر اندر کمرے میں داخل ہوئی۔ حذیفہ اور آذر بھائی اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

’’السلام علیکم!‘‘ حذیفہ نے سلام میں پہل کی تھی۔

’’وعلیکم السلام!‘‘ اس نے بھی حذیفہ کو جواب دیا۔ پھر آذر بھائی کو دیکھنے لگی۔ اس نے سارہ اماں، شاہ زر، ماما پاپا، ابیشا سب کو حذیفہ کے اسلام قبول کرنے کے متعلق بتا دیا تھا۔

’’آپ لوگ بیٹھیں۔ میں کچھ کھانے پینے کو بھجواتا ہوں۔‘‘ وہ دونوں کو اشارہ کرتے باہر نکل گئے تو وہ بھی ایک گہری سانس لیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر حذیفہ کو دیکھنے لگی۔

’’تمہیں یہاں کا ایڈریس کہاں سے ملا؟‘‘ جس سوال میں وہ ابھی تک الجھی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے وہی سوال ہونٹوں سے ادا ہوا۔

’’شاہ زر جہانزیب سے۔ ایک ہفتہ پہلے میں واپس لوٹا تو تم سے رابطہ کیا۔ تم نے خود رابطہ کرنے کو کہا تھا لیکن کیا ہی نہیں۔ میں تھوڑا سا پریشان بھی تھا۔ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ شاید تم نے طلاق لے لی ہو مگر فون کرنے پر شاہ زر نے ریسیو کیا تھا۔ پھر اس سے تمہارے فادر کی طبیعت کا علم ہوا۔ ایڈریس وغیرہ بھی اسی نے دیا اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔‘‘ وہ سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔ وہ بے یقینی سے سن رہی تھی۔ شاہ زر نے ایڈریس دیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

کیسی طبیعت ہے اب انکل کی؟" اس کی آواز اسے بے یقینی کے سمندر سے باہر کھینچ ’ ’ لائی۔ وہ خالی خولی نظروں سے دیکھتی اثبات میں گردن ہلانے لگی۔

اب ٹھیک ہے پاپا کی طبیعت مگر جو کمزوری ہوئی ہے وہ بہر حال اپنی جگہ پر ابھی تک ’ ’ برقرار ہے۔ سارا دن بستر پر ہی لیٹے رہتے ہیں۔" وہ اسے پاپا کے متعلق آگاہ کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ چائے اور دیگر لوازمات ٹرالی میں سجائے چلی آئی۔ وہ خود ہی اسے چائے بنا کر دینے لگی۔ ملازمہ چلی گئی۔

مشعال ! انکل کو ہارٹ اٹیک کیوں ہوا؟" چائے پیتے اس نے پوچھا۔ ’ ’

"...شاہ زر نے پاپا کو طلاق دینے کے متعلق بتا دیا تھا۔ بس اسی وجہ سے ’ ’

وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ حذیفہ نے کچھ کہنا چاہا پھر ہونٹ بھینچ لیے۔

وہ اس وقت اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اسے کچھ سمجھاتا۔ پھر وہ چائے پیتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ مشعال نے کھڑے ہونے کی بجائے اسے صرف دیکھا تھا۔

مشعال ! میں تمہارے شوہر کے آفس میں گیا تھا۔ وہ مجھ سے بہت خوش اخلاقی سے ملا ’ ’ تھا۔ میری اس سے بات چیت ہوئی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ وہ تمہیں چند دنوں کے اندر اندر طلاق کے پیپر بھیج دے گا مگر مشعال ابھی بھی وقت کی لگامیں تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ تم چاہو تو اسے روک سکتی ہو۔ میں نے محسوس بھی کیا ہے اور دیکھا بھی ہے وہ شخص تم سے بہت شدت

سے محبت کرتا ہے۔ تمہارے بغیر وہ کچھ بھی نہیں اور تم بھی اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی نہیں گزار پاؤ گی۔ محبت سے سمجھوتا کر لینا اور بات ہے اور محبت ہونے کے باوجود اس سے انکاری ہو کر کسی اور کی زندگی میں شامل ہونا خود پر ظلم کرنے کے مترادف ہی ہے۔ یہ بات میں اب نہیں کہہ رہا بلکہ یہ بات میں نے بار بار نوٹ کی ہے۔ اس وقت بھی جس میں نے تم سے محبت کی تھی اور تمہیں پرپوز کیا تھا۔ تم برطانیہ میں بظاہر میرے ساتھ ہونے کے باوجود میرے ساتھ نہیں ہوتی تھیں۔ تمہاری آنکھیں کسی اور کو ہی تلاش کر رہی ہوتی تھیں۔ بات کرتے کرتے تم کہیں کھو سی جاتی تھیں۔ ایسا لگنے لگتا تھا جیسے کوئی پیاسی روح ہو اور میں تمہاری کیفیت کا اصل محرک تلاش کرنے کی جستجو میں ہلکان ہوتا رہتا تھا۔ اصل میں مجھے اسی جستجو نے تمہاری جانب راغب کیا تھا اور اب جب سے میں پاکستان میں ہوں۔" میں نے تمہاری وہ کیفیت محسوس نہیں کی۔ تمہاری آنکھیں جیسے شانت سی ہو گئی ہیں۔ پھر بھی تم اپنے من کو مار کر کوئی فیصلہ کرو گی تو سراسر نقصان اٹھاؤ گی۔ اچھے دوست کی طرح میرا مشورا قبول کر لو جو بھی فیصلہ کرو مجھے ضرور آگاہ کرنا تم ہر حال میں مجھے اپنے پاس پاؤ گی۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست تھے اور ہمیشہ رہیں گے یہ کبھی مت بھولنا اوکے... اللہ حافظ۔" دھیمے انداز میں کہتا جس طرح اچانک آیا تھا چلا بھی گیا۔

وہ خالی الذہنی کیفیت میں وہی بیٹھ گئی۔ پاپا اس کی وجہ سے اس حال تک پہنچے تھے۔ یہ احساس اسے کسی بھی لمحہ سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ وہ خاموشی سے رہائش والے حصے میں آ گئی۔

تھوڑی دیر تک حویلی کے لان میں ٹہلتی رہی۔ پھر جب اندر آئی تو ابیشا کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے اشارے سے اسے پاس بلایا وہ جیسے ہی اس کے پاس پہنچی اس نے اس کے ہاتھ میں ریسیور تھما دیا۔

“شاہ زر بھائی کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔” اس کے سوالیہ دیکھنے پر وہ سکون سے جواب دے کر وہاں سے ہٹ گئی۔ چند لمحے ریسیور کو گھورتی رہی۔ پھر کان سے لگا لیا۔

“ہیلو۔”

“السلام علیکم۔” شاہ زر نے سلام کیا تو وہ تھوک نگلتے ہوئے وعلیکم السلام کہہ گئی۔

“کیسے فون کیا؟” وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لہجے میں در آنے والی تلخی نہیں روک پائی تھی۔ شاہ زر سے بات کرتے کرتے اس پر بے شمار تلخ یادوں اور تکلیف دہ باتوں کے کئی در وا ہو جاتے تھے۔

“تمہیں صرف یہ آگاہ کرنے کے لیے کہ تین چار دن پہلے میری چچا جان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تقریباً ساری قانونی کارروائی مکمل ہو چکی ہے اور قانونی کارروائی کے بعد ہی اس ماہ پہلی طلاق تمہیں مل جائے گی۔” وہ بہت ٹھہرے ٹھہرے صاف لہجے میں بتا رہا تھا۔ وہ خاموش، لب کاٹتی رہی۔

سنو شاہ زر! ابھی کچھ بھی مت بھجوانا۔ میں نہیں چاہتی کہ پاپا کو میری وجہ سے کوئی ’ ’ تکلیف پہنچے۔ وہ ابھی تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئے اور نہ ہی مجھے ابھی کوئی جلدی ہے۔ تم کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ پاپا ذہنی و جسمانی لحاظ سے اس حقیقت ”کو قبول کرنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ میں تمہیں خود بتا دوں گی۔

لیکن مشعال! تم...” وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر چپ ہو گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ’ ’ ہے۔

مجھے یقین ہے تم میری یہ بات مان لو گے۔ میں نے کہا نا میں جب بھی پاپا کی طرف ’ ’ ”سے مطمئن ہو گئی۔ تم سے طلاق لے لوں گی۔ پلیز ابھی تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔

اپنی بات مکمل کر کے اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ یک دم بہت حبس کا احساس ہونے لگا۔ پہلے حذیفہ کی آمد‘ اس کی باتوں اور اب شاہ زر کے فون نے اسے عجیب سی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ اس حویلی کی چار دیواری سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ یہاں تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ قدم قدم پر زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے کہیں رشتوں کی زنجیریں تھیں تو کہیں نام نہاد عزت و غیرت و انا مردانگی کی۔ وہ یہ سب زنجیریں توڑ کر مکمل رہائی سے جینا چاہتی تھی مگر وہ خود میں یہ زنجیریں توڑنے کی ہمت نہیں پا رہی تھی۔ اک انجانا سا خوف تھا جو اسے اب اپنے حصار میں کھینچنے لگا تھا۔ کچھ حذیفہ کی الجھی الجھی باتیں اسے یاد آ کر ہمیشہ الجھا دیتی تھیں۔ اسے اللہ پر پورا یقین تھا۔ وہ تقدیر کو مانتی تھی مگر اسے حویلی کے رسم و رواج اور شاہ زر کا رویہ

الجھانے لگتا تھا۔ وہ جب جب شاہ زر کے بارے میں سوچتی اس کی سوچ پھر منفی ہونے لگتی تھی۔ پاپا کی خراب طبیعت کے دوران وہ بالکل خاموش ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار جب بھی سوچ حذیفہ کی باتوں کی طرف جاتی لمحوں میں وہ پاپا کی بیماری' حویلی کی باتوں' لوگوں کی آمدورفت میں الجھ جاتی اور وہ سوچ وہیں کہیں دماغ کی کسی گرہ میں اٹکی رہ جاتی۔

گھٹن اور حبس کا احساس شدید ہوا تو حویلی سے باہر نکلنے کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ بڑی امی کو بتا کر وہ چہل قدمی کی غرض سے حویلی کی چار دیواری سے باہر نکل آئی۔ کافی دور تک وہ سرسبز کھیتوں میں چلتی رہی۔ آج کل دھان کی فصل کھڑی تھی۔ ہر کھیت سرسبز وشاداب خوشوں سے لہرا رہا تھا۔ وہ بے دھیانی میں چلتے کافی دور تک نکل آئی۔ اب اسے یہاں کے سب راستے ازبر ہوگئے تھے۔ اسی لیے وہ نہ ہی تو بھولتی اور نہ ہی بھٹکتی تھی۔ سورج مغرب میں ڈوبنے لگا تو وہ بھی واپسی کے لیے مڑ گئی۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اسے چکر آنے لگے۔ قدم من من بھر کے ہوگئے۔ وہ وہیں سڑک کنارے گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

اب اسے پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی یہ کیفیت اور طبیعت خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ہر وقت جی متلاتا رہتا۔ تھوڑا بہت چلنے سے تھک کر چُور چُور ہو جاتی تھی مگر چکر ہر وقت تنگ کرتے رہتے تھے۔ دوسری طرف کچھ کھانے پینے کو بھی جی نہیں کرتا تھا۔ سڑک کنارے بیٹھے بیٹھے اس کا جی اس بری طرح متلایا کہ اسے منہ بھر کر قے آئی۔

یااللہ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے ؟'' دم بدم بڑھتا اندھیرا اور دور تلک کسی ذی روح کا ’ ’ وجود تک نہیں تھا۔ وہ بے اختیار ہولنے لگی۔ خود پر بھی بے پناہ غصہ آنے لگا کہ وہ اس وقت حویلی سے ہی کیوں نکلی تھی۔ اگر یہ حماقت کر ہی بیٹھی تھی تو اتنی دور تک آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ٹانگوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ چل کر حویلی پہنچتی۔

یااللہ میری مدد فرما دے۔'' ارد گرد پھیلتا اندھیرا اور سناٹا اس کی جان نکالنے کو تیار تھا۔ وہ ’ ’ رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے لگی۔

اس دن جب پاپا بیمار تھے۔ مشینوں کے ذریعے سانس لے رہے تھے تو اچانک اسے اللہ یاد آیا تھا۔ اس دن سے اللہ کا ڈر اس کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اب بھی جب وہ بالکل تنہا تھی تو اسے اللہ ہی یاد آیا تھا۔ شاید اس کی دعا کا ہی کرشمہ تھا یا اللہ تعالیٰ کو اس کے تنہا و بے بس وجود پر رحم آگیا تھا جو دور سے کوئی بوڑھی عورت سر پر اپلوں کا ٹوکرا رکھے چلی آ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اس کے قریب پہنچی ٹوکرا ایک طرف رکھ کر اس کے پاس بیٹھ کر اس کی پشت سہلانے لگی۔

کیا ہوا؟'' اسے پریشانی اور تکلیف کی شدت سے آنسو پیتا دیکھ کر بوڑھی عورت پوچھنے ’ ’ لگی۔ اسے تو کچھ بتانے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ دل بار بار بری طرح متلا رہا تھا۔ عورت کافی زیرک نگاہوں سے اس کی حالت دیکھ کر بہت کچھ سمجھ گئی۔

‘‘تمہیں اس حالت میں گھر سے باہر ایسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ کہاں رہتی ہو تم۔ اٹھو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئوں۔’’ کسی اور بات پر غور کیے بغیر ذہن ایک لفظ ‘‘اس حالت’’ میں اٹک گیا۔ یک دم مینار پاکستان کی سیر کے دوران اس خاتون کی کہی گئی بات یاد آگئی۔

‘‘ہو سکتا ہے بیٹا! یہ بالکل ٹھیک ہوں مگر آپ اپنی بیگم کا چیک اپ کروائیں کیونکہ یہ چکر بلاوجہ نہیں آتے۔’’

‘‘نہیں... میں ٹھیک ہوں۔ میں چلی جائوں گی۔’’ ایک انجانا سا خیال دل میں سمایا تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی جب کہ ٹانگیں ساتھ دینے سے قاصر تھیں مگر وہ ہمیشہ خود پر جبر کرتی آئی تھی۔ بوڑھی عورت کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر وہ لرزتی ٹانگوں سے حویلی کی طرف ہو لی۔ اس عورت کی نگاہوں نے کافی دور تک مشعال کا پیچھا کیا تھا۔ پھر وہ بھی اپنے راستے کی طرف مڑ گئی۔۔۔

‘‘نہیں... میں ٹھیک ہوں۔ میں چلی جائوں گی۔’’ ایک انجانا سا خیال دل میں سمایا تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی جب کہ ٹانگیں ساتھ دینے سے قاصر تھیں مگر وہ ہمیشہ خود پر جبر کرتی آئی تھی۔ بوڑھی عورت کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر وہ لرزتی ٹانگوں سے حویلی کی طرف ہو لی۔ اس عورت کی نگاہوں نے کافی دور تک مشعال کا پیچھا کیا تھا۔ پھر وہ بھی اپنے راستے کی طرف مڑ گئی۔

جیسے تیسے کر کے وہ حویلی پہنچی تھی۔ شاہ زر کے کمرے میں بند ہو کر وہ اپنا سراپا جانچنے لگی۔ ایک انجانا سا خیال جس کی چند لمحے پہلے اسے آگہی ملی تھی۔ اپنی حالت کا تجزیہ کرتے کرتے وہ انجانا خیال یقین کی منزل تک پہنچتا جا رہا تھا۔ جب دماغ کو پوری طرح اس نئی حقیقت کا ادراک ہوا تو وہ بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”نہیں... یہ نہیں ہو سکتا؟“ وہ ٹھٹھک تو اسی دن گئی تھی مگر پہلا خیال یہی آیا کہ اتنی ساری سیڑھیاں چڑھنے سے چکر آ گئے ہیں۔ بعد میں مسلسل چکر آتے رہے اور طبیعت خراب ہوتی رہی۔ وہ ہر دفعہ یہی خیال کرتی رہی کہ وہ ان دنوں پاپا کے بارے میں بہت حساس ہو کر سوچ رہی ہے اسی لیے ایسی کیفیت ہو گئی ہے مگر آج کے اس واقعے نے اس کے جسم سے جان تک نکال لی تھی۔

”ہو سکتا ہے یہ صرف میرا وہم ہو۔ مجھے اپنا چیک اپ کروا لینا چاہیے۔“ کافی دیر تک رونے اور سوچ سوچ کر ہلکان ہونے کے بعد دل کچھ ہلکا ہوا تو اک نئی سوچ ذہن میں چلی آئی۔ پھر جیسے ہی اس نئی سوچ پر خیال پختہ ہوا تو وہ تھوڑی بہت پر سکون ہو گئی۔ کھانے پینے کو اس کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا سو مطمئن ہوتے ہی نیند کی پری آنکھوں کی زمین پر آ بیٹھی۔ پھر اسے چند لمحے لگے تھے بے خبر ہونے میں۔ ایسی میٹھی نیند آئی کہ وہ اگلے دن چڑھے تک سوتی رہی۔

[...خ...]

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ لاؤنج میں آکر لیٹ گئی۔ اٹھنے کے بعد سے وہ پاپا سے باتیں کرتی رہی تھی۔ ان سے باتوں کے دوران بھی ایک جھجک تھی۔ اب جو آکر لیٹی تو ذہن پھر کل شام والے واقعے کی طرف چلا گیا۔ اندر باہر پھر بے چینی پھیلنے لگی۔

’’خورشیدہ! ادھر آئو۔‘‘ برتن اٹھا کر ادھر سے گزرتی ملازمہ کو اس نے آواز دی۔ وہ برتن کچن میں رکھ کر اس کے پاس آگئی۔ پاس بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دبانے لگی تو اس نے فوراً ٹانگیں کھینچ لیں۔ سیدھی ہو کر اٹھ بیٹھی۔

’’یہاں گائوں میں جو عورتیں بیمار ہوتی ہیں وہ کیا کرتی ہیں؟‘‘ فی الحال کسی اور سے پوچھنا اچھا نہیں لگا تھا سو اس سے ہی پوچھنا بہتر سمجھا۔

’’مشعال بی بی! ہمارے گائوں میں عورتوں کے واسطے ایک علیحدہ کلینک ہے۔ سرکاری اسپتال بھی ہے۔ ایک دو ڈاکٹروں کی دکانیں بھی ہیں مگر یہ جو کلینک ہے ناں وہ شاہ زر صاحب نے بنوایا ہے۔ وہ ہی شہر سے ڈاکٹرنی اور ڈاکٹر کو لے کر آئے تھے۔ دونوں میاں بیوی ہیں۔ ایک دو نرسیں بھی ہیں۔ مہنگی مشینیں بھی ہیں چوکی دار بھی ہوتا ہے۔ وہ جی جن عورتوں کے ہاں بچے ہوتے ہیں وہ کلینک سے ہی کیس کرواتی ہیں۔ جب سے یہ کلینک بنا ہے بہت سہولت ہو گئی ہے۔ لوگ تو شاہ جی کو دعائیں دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی کا گھر شاہ جی نے کلینک کے پچھواڑے ہی بنوا دیا تھا۔ وہ وہیں رہتے ہیں۔‘‘ ملازمہ کی بات پر وہ سر ہلاتی اسے

جانے کا اشارہ کر کے سوچنے لگی۔ کسی اور کو کچھ بتانے کی اس نے ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ وہ یک دم ایک فیصلہ کر کے بڑی امی کے پاس آ گئی۔

بڑی امی! میں باغ والے گھر جانا چاہتی ہوں۔ شام تک آ جاؤں گی۔" بڑی امی ہی ’ ’ حویلی کے اندر کے معاملات کی کرتا دھرتا تھیں جو کچھ ہوتا تھا ان کی اجازت سے ہی ہوتا تھا جب کہ باہر کے معاملات مردوں کے سپرد تھے۔

ہاں چلی جاؤ مگر اس وقت جاؤ گی کس کے ساتھ؟ گھر میں تو کوئی مرد نہیں ہے۔ آذر ’ ’ "تو باہر ڈیرے پر گیا ہوا ہے شاہ میر بھی ساتھ ہی گیا تھا۔

مجھے گاڑی ڈرائیو کرنا آتی ہے۔ خورشیدہ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" اس نے فوراً حل ’ ’ پیش کیا۔

ہاں لے جاؤ مگر تنہا اسے نہیں ساتھ میں علیشہ یا ابیشا میں سے کسی ایک کو لے ’ ’ جاؤ۔" انہوں نے اجازت دیتے ہوئے بھی ایک حد مقرر کر دی وہ کوفت سے انہیں دیکھنے لگی۔

میں کوئی ملک فتح کرنے نہیں جا رہی جو پوری فوج ساتھ لے جاؤں۔ البتہ خورشیدہ ’ ’ کو لے کر جا رہی ہوں۔ شام تک آ جاؤں گی۔" وہ ناگواری سے بتا کر ان کے کمرے سے نکل آئی۔ بڑی امی تاسف سے اس کی باغی طبیعت پر سر ہلاتی رہیں۔

وہ خورشیدہ کو لے کر باغ والے گھر میں پہنچی تھی مگر خورشیدہ کی بہن کا گھر ساتھ والے گائوں میں تھا اس نے اسے وہاں بھیج دیا تو خود بخود موقع مل گیا۔ کلینک باغ والے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ صرف اسے پندرہ منٹ گاڑی ڈرائیو کرنا پڑی تھی۔ ویسے بھی چند ایک بار وہ گائوں آتے جاتے باہر سے کلینک دیکھ چکی تھی۔ سڑک پر واقع تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں بالکل مشکل نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک اپنی باری کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ جب باری آئی تو لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں چلی آئی۔ اس کی طبیعت کا سن کر اس نے اس کے چیک اپ کے بعد اس کے شک کی تصدیق کر دی تھی۔

"آپ امید سے ہیں۔"

وہ منہ کھولے آنکھیں پھیلائے ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔

"اب تو آپ کو دو ماہ ہونے والے ہیں۔" اس نے اسے مزید خبر دی۔

"کیا نام ہے آپ کا؟" نوٹ بک اٹھا کر کچھ لکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"مشعال۔"

"آپ اس گائوں کی تو نہیں لگتیں۔ نئی آئی ہیں کیا؟" ڈاکٹر اس کے چہرے کو دیکھ کر یوں ہی پوچھنے لگیں۔ دوسرا مشعال کا حلیہ بھی کسی دیہاتی عورت جیسا نہیں تھا۔

جی میں لاہور سے آئی ہوں۔ یہاں میرے کچھ رشتہ دار رہتے ہیں ان ہی کے ہاں کچھ دنوں کے لیے مہمان ہوں۔" مزید کسی سوال سے ڈرتے ہوئے اس نے سوچا سمجھا جواب دے کر ڈاکٹر کو مطمئن کر دیا تھا۔

ڈاکٹر اسے اپنی صحت کی خیال رکھنے، وقت پر دوا لینے خوراک پھل استعمال کرنے اور باقاعدہ چیک اپ کروانے کی ہدایات جاری کرتی رہیں۔ وہ خاموشی سے بے دھیانی سے سب سن کر جلدی سے ڈاکٹر کے ہاتھ سے دوائی والا پرچہ لے کر ادویات والا شاپر تھام کر کلینک سے باہر آ گئی۔ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ایک نظر دوائیوں اور نسخے کو دیکھا۔ پھر اضطراری انداز میں اس نے نسخے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اندر اس قدر دھواں بھرا ہوا تھا کہ آنسو بہتے چلے آئے۔

باغ والے گھر میں پہنچ کر کمرے میں داخل ہو کر کمرہ لاک کرتے ہوئے اس کے اندر اتنی وحشت بھرتی گئی کہ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹتی گئی۔ جو کچھ بھی اس کے ہاتھ لگا وہ مٹاتی گئی۔ ایک ایک چیز تہس نہس کرتی گئی۔ گلدان، کشنز، بیڈ شیٹس، تکیے، کتابیں، میگزنز، الماریوں میں موجود کپڑے سب کچھ اس کی وحشت کا نشانہ بنتا گیا۔ اب یہ خبر اس کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آئی تھی۔ جب وہ رہائی کے بالکل قریب تھی۔ ایک نئی آزمائش اس کی منتظر تھی۔ جب وہ اپنا ہر راستہ ہموار کر آئی تھی۔ وہ یہ سب قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ لاچاری و بے بسی کی انتہاؤں کو پہنچ کر وہ شدت سے روتی گئی۔

یااللہ میں اس شخص کا نام بھی نہیں لینا چاہتی اور تو نے اس کی اولاد میرے مقدر میں ’’ ’
لکھ دی۔

رورو کر وہ بے حال ہو گئی تھی اور اب سب منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔ سارے ارادے ‘ ساری خواہشیں ملیا میٹ ہو گئی تھیں۔ اگر کچھ باقی تھا تو اللہ کا لکھا باقی تھا۔ جس پر وہ ابھی تک شاکر نہیں ہوئی تھی۔

اس شخص کو اپنا شوہر اس نے ابھی تک نہیں مانا تھا اور اس شخص کی اولاد اللہ کا فیصلہ بنی اس کے سامنے تھی۔ اللہ نے تو اسے موڑ موڑ پر باور کرا دیا تھا کہ تم میرے لکھے ہوئے سے کیوں کر منکر ہو سکتی ہو۔ میری رضا سے کیسے بھاگ سکتی ہو کیسے میرے فیصلوں سے انحراف کر سکتی ہو۔ اب سب کچھ واضح ہوتا جا رہا تھا۔

پاپا کو اچانک ہارٹ اٹیک ہو جانا‘ حذیفہ کا آنا‘ اسے سمجھانا‘ شاہ زر کو پیپر سائن کرنے سے منع کرنا اور اب یہ نئی خبر... وہ کس کس بات سے آنکھیں بند کرتی؟ کس کس حقیقت کو جھٹلاتی؟ کس کس فیصلے سے ناشکری کرتی؟ کون کون سی بات غرور سے ٹالتی؟ سب کچھ تو سامنے تھا۔ دل نے تو اللہ کی حقّانیت‘ مقدر کے لکھے کو رب کریم کے فیصلوں کو اسی دن مان لیا تھا جب پاپا کو زندگی اور موت کی جنگ لڑتے دیکھا تھا۔ خوف تو اسی دن دل میں امڈ آیا تھا۔

اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ چاہے کچھ بھی کر لے۔ شاہ زر کو جتنا مرضی الزام دے لے‘ جتنی مرضی فرار کی کوشش کر لے‘ جتنا چاہے رو لے‘ کچھ بھی تو نہیں ہو گا جب تک اوپر بیٹھی وہ

ذات نہیں چاہے گی جب تک اس کی مرضی نہیں ہو گی۔ وہ اللہ ایسی ذات ہے جو جب چاہے بندے کو اپنے آگے جھکا سکتی ہے' غرور سے اٹھا ہوا سر جھکا سکتی ہے' فخر سے تنی ہوئی گردن مروڑ سکتی ہے۔ وہ جب چاہے پتھر دل کو رونے پر مجبور کر سکتی ہے' وہ جب بھی چاہے کسی کو اس قدر محتاج کر سکتی ہے کہ بندے کو اس کے در کے سوا کوئی اور در دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اس نے اس دن جتنی بھی دعائیں پاپا کی زندگی کے لیے مانگی تھیں شاید ہی کبھی زندگی میں اتنی دعائیں مانگی ہوں۔

قالین پر بیٹھی وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ ہاتھ کی لکیریں اب بھی اتنی واضح اور سیدھی تھیں جتنی ایک ماہ پہلے تھیں۔ کوئی الجھاؤ' کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر اسے اپنی زندگی میں الجھاؤ ہی الجھاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ چند ہفتے پہلے وہ آزاد ہو جانے کے احساس سے کس قدر خوش تھی حتیٰ کہ حذیفہ کی باتوں اور شاہ زر کے نرم رویے کی بھی پروا نہیں کی تھی۔

اور اب جب آزادی اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی تو پاپا کے ہارٹ اٹیک نے سب کچھ بدل دیا۔ سب ارادے ڈانواں ڈول ہو گئے۔ وہ تو صرف پاپا کے مکمل طور پر صحت یاب ہو جانے کی منتظر تھی اور اب قسمت نے اک نئی زنجیر اس کے قدموں میں ڈال دی تھی۔

تقدیر کیا ہے؟'' اسے آج اپنا سارا علم' سارے دعوے' سب عقل و خرد کی باتیں بے کار ’ ’ لگیں۔ اس کا علم بھی اس کے کسی کام نہ آیا۔ اس کی ذہانت نے بھی اسے پچھتاوے کے بھنور میں پھنسنے سے نہ بچایا۔ وہ نادان تھی جاہل بھی تھی۔ خوش گماں اور خود پسند بھی تھی' پھر خود

کو عقل کے سب سے اونچے درجے پر فائز کر کے وہ جاہل کم عقل، ناسمجھ اور خود غرض تھی۔

وہ تقدیر میں الجھی بس اتنی ہی سمجھ رہی تھی کہ آزمائش کے بعد ایک اور آزمائش نے اسے جکڑ لیا ہے۔

رشتوں کی زنجیر میں ایک اور نئی کڑی پیدا ہو گئی ہے۔

انا، خودداریت، عزت و وقار اور ضد کی زنجیروں نے دیارِ غیر میں بھی اس کے پاؤں کو آزاد نہیں کیا تھا مگر اب یہاں لوٹ آنے کے بعد وہ نئے سرے سے ان دیکھی زنجیروں میں جکڑی گئی تھی۔

انا، غرور، عزت و مردانگی کے دعوؤں پر تو وہ کل بھی ہار ہی گئی تھی مگر اب قسمت نے جو نیا رنگ دکھایا تھا وہ نظریں ملانے کو تیار نہیں تھی۔

جب آزادی کی دیوی دونوں بازو پھیلائے منتظر کھڑی تھی۔ ایک نئے رشتے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ارادہ، خواہش، عزم، یقین، ولولہ، منصوبہ، مقصد نجانے وہ سب کیا تھے وہ تو لفظ ”تقدیر“ پانچ حروف پر مشتمل لفظ کو نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ وہ تقدیر جسے خدا نے لکھا تھا مگر اپنے اعمال سے بد ظن ہو چکی تھی۔

حذیفہ نے کہا تھا کہ گھبراؤ نہیں۔ تم بہت جلد اپنی منزل کو پا لو گی مگر وہ حوصلہ ہار رہی تھی۔

دل تو انجانی خواہشوں کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ وہ اتنا واضح اور اٹل حکم ربّی ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اگرچہ اسی ذات پاک کا خوف اس کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔

یااللہ میں کیا کروں؟ اے میرے اللہ تو ہی بتا میں کیا کروں؟ مجھے سیدھی راہ دکھا۔ ’ ’ اندھیری نگری سے باہر نکال لے۔ میں روشنی میں زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتا میں کیوں ‘‘الجھ گئی ہوں اے اللہ میری رہنمائی فرما۔

اس دن کے بعد جو اس کے دل میں اللہ کا خوف بیٹھا تھا تو وہ اب دن رات اللہ کو ہی لاشعوری طور پر یاد کرتی رہتی تھی۔ اب دن رات اسی ایک ذات پاک کا تصور دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔

وہ دونوں بازوؤں میں سر دیے بری طرح روتی رہی۔ بہت سے اسرار اس پر واضح ہوتے گئے۔ بہت سی عیاں باتیں اس کی سمجھ میں آتی گئیں۔ بہت سے اسرار اپنا بھید کھولتے گئے۔ وہ اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کرنے لگی۔ تقدیر پر یقین ہوتا گیا۔ وقت بیتتا گیا۔ کمرے میں اندھیرا پھیلتا رہا حتی کہ اس کا دل اطمینان پکڑنے لگا۔ دماغ روشن ہو گیا اس کی ذات کچھ سوچ کر مطمئن ہو گئی۔

[...خ...]

میں نے تو اس سے کچھ نہیں کہا۔ آپ کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ انکل یقین کریں ’ ’ آپ اس سے خود پوچھ لیں۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ یہ پہلے کی طرح مجھ سے بات ‘‘کرے، لڑے، جھگڑے، چھوٹی چھوٹی بات پر الجھے مگر یہ تو بالکل چپ سی ہو گئی ہے۔

وہ پورے انہماک سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں کس احساس میں گھر کر اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے تھے۔

میں کیا بولوں؟ اب میرے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب کس بنیاد پر میں یزدانی سے جھگڑا کروں؟ پہلے تو میرے پاس "ٹوٹو" جیسا جواز موجود تھا۔ اسی بنیا پر میں اس سے جھگڑتی تھی' لڑتی تھی۔ ہمارے تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے "ٹوٹو" کا وجود موجود تھا جو یزدانی کو کوئی فیصلہ کرنے نہیں دیتا تھا اور نہ ہی مجھے طلاق کا لفظ سننے۔ ٹوٹو ہی وہ ہتھیار تھا جس کی وجہ سے میں اس سے لڑا کرتی تھی مگر اب وہ ہتھیار مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ اسی لیے اب میں چپ رہتی ہوں۔ میاں بیوی کے تعلق کو اولاد ہی مضبوط بناتی ہے اور اب ہمارے درمیان "اولاد کا وجود نہیں ہے۔

ڈرامے کی ہیروئن ہیرو کے جواب میں کہہ رہی تھی۔ مشعال کے اندر بھی ایک سسکی بلند ہوئی۔ اس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ صرف ایک دن کے اندر اس کی سوچ' احساسات اور خیالات بدلے تھے اور اب رات کے پونے نو بجے ٹی وی کے سامنے بیٹھی ڈرامہ دیکھتے جو "سعادت حسن منٹو" کے عالمی ایوارڈ یافتہ افسانے سے ماخوذ تھا۔ وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ اس کے اندر کا موسم بدلنے لگا۔ یک دم ممتا بھرے جذبات بیدار ہونے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ ڈرامے کا آخری سین مکمل ہوتا وہ تیزی سے لائونج سے نکل کر کمرے میں آکر بند ہو گئی۔ آنکھیں شدت سے بہہ رہی تھیں۔ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے؟ اسے اب احساس ہوا تھا۔

اس رات جب وہ حذیفہ کے ساتھ واپس گھر آرہی تھی تو اس نے حذیفہ کی کہی گئی باتوں کے سحر میں آکر آنکھیں بند کر لی تھیں اور پھر بند آنکھوں میں ایک عکس اترتا چلا گیا تھا۔ اس وقت وہ اس تصور کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ اس رات وہ کچھ الجھتے ہوئے رو پڑی تھی مگر کل سے لے کر اب تک اسے اپنی گزشتہ زندگی کی ایک ایک بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ عکس ایک گول مٹول بچے کا تھا۔ اس وقت تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح کبھی سوچنے پر مجبور ہو جائے گی۔ وہ عکس اور حذیفہ کی باتیں کچھ بھی تو غلط نہیں تھا۔ اگر غلط تھی تو وہ اس کی اپنی سوچ تھی جو نجانے کن سرابوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ تقدیر کا کیا چکر ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ایک ایک بات کھل کر سامنے آگئی تھی۔

"واقعی میاں بیوی کے تعلق کو اولاد ہی مضبوط بناتی ہے۔"

اس کے سامنے ماما پاپا کی ساری زندگی ایک اسکرین پر فلم کی طرح چلنے لگی۔ ماما، پاپا کے ساتھ پاکستان نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ انہیں یہاں کا ماحول پسند نہیں تھا حتیٰ کہ انہوں نے اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے طلاق تک کا مطالبہ کر دیا تھا اور وہ پاپا انہوں نے اپنی بیٹیوں کے لیے سمجھوتا کر لیا۔ وہ ماما کی بات مانتے ہوئے ان کے ساتھ برطانیہ چلے گئے۔ انہیں تقدیر پر بھروسہ تھا وہ اچھی یا بری اللہ کی طرف سے لکھی گئی تھی۔ اس کی سوچ بہت پختہ تھی۔ ماما پاپا کے تعلق کو قائم رکھنے کے لیے اولاد کا وجود اہم ثابت ہوا۔

اب جب کہ سب کچھ نارمل ہو چکا تھا۔ پاپا نے اجازت دے دی تھی۔ شاہ زر اسے طلاق دے رہا تھا تو اولاد کا روپ دھارے ایک نئی زنجیر دونوں کو باہم جوڑے رکھنے کے لیے درمیان میں آ موجود ہوئی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر یقین آگیا تھا۔ اس کی شادی اللہ کا ایک فیصلہ تھا۔ اس نے مان لیا تھا۔ اسی لیے اب اس کے سامنے اپنے وجود کے برعکس ایک اور نیا وجود اہم ہونے لگا تھا۔ اسے اس نئے وجود کی فکر ستانے لگی تھی جس کا وجود وہ اپنی سانسوں میں محسوس کر رہی تھی۔ اس کے سوا کسی کو بھی اس نئی حقیقت کا علم نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ شاہ زر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی اس حقیقت سے قطعی ناواقف تھا جس کی امانت اس کے وجود میں پل رہی تھی سانسوں میں رچی بسی تھی۔

ہر جذبے کو چھوڑ کر، ہر احساس کو بھلا کر، شاہ زر کے سلوک کو نظرانداز کیے ہر بات کو ذہن سے نکالے وہ کل سے لے کر اب تک صرف اور صرف اک نئے وجود کے بارے میں سوچ رہی تھی جو ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا مگر اس کی زندگی کی حقیقت بدل دینے کو کافی تھا۔ کل سے لے کر اب تک شیطان نے اسے بارہا بہکانے کی بھی کوشش کی تھی کہ یہ تو شاہ زر کی اولاد ہے جس نے اس کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا تھا تو وہ پھر وہ خود کو کیوں ہلکان کرتی ہے۔ آرام سے اپنے بارے میں فیصلہ کرے اور شاہ زر سے علیحدہ ہو جائے مگر ہر بار دماغ نے اس شیطانی خیال کو جھڑک دیا تھا۔

وہ صرف شاہ زر کی اولاد نہیں تھی۔ دونوں کی سانجھی اولاد تھی۔ اگرچہ وہ شاہ زر کی خواہش کا نتیجہ تھی مگر اس کے اپنے وجود کا تو ایک حصہ تھی۔ پھر وہ اس کے لیے خود غرض کیسے ہو سکتی تھی؟ اس نئے وجود کی آئندہ زندگی کا انحصار باہم دونوں کی بقا میں تھا۔ دونوں کے فیصلوں پر تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے کبھی بھی اپنی اولاد کو دنیا کے ستم سہنے کے لیے پیدا نہیں کرے گی اور نہ ہی پیدا کر کے تنہا چھوڑ دے گی جس طرح بن ماں کے شاہ زر ممتا سے محروم ہو کر جذبات واحساسات سے عاری انسان بن گیا۔ وہ ہر جذبے کو نفرت وانتقام اور ضد کی کسوٹی پر پرکھنے لگا۔ ہر محبت کو بھول بیٹھا۔ وہ بظاہر نارمل ہونے کے باوجود نارمل انسان نہیں تھا۔ اس نے بارہا اس کے سلوک سے یہ محسوس کیا تھا۔ اس کا وحشی پن' اس کا ظالمانہ سلوک اس کے اندر اب ہمت نہیں تھی کہ وہ اب شاہ زر جیسا کوئی بچہ پیدا کرے۔ وہ صرف اپنی ضد اور خواہش کی تکمیل کے لیے زندہ ہونے کے باوجود اپنی اولاد کو شاہ زر جیسا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ وہ کل سے لے کر اب تک بار بار سوچ رہی تھی اور اپنے اس فیصلے پر مضبوطی سے قائم رہنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگ رہی تھی۔

یہ تو طے ہے مشعال شاہ کمال تمہیں اب ساری عمر اسی ایک ناپسندیدہ انسان کی معیت ’’ میں گزارنا ہو گی جس کے بارے میں تمہاری رائے ہے کہ وہ وحشت وبربریت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جسے تم انسان نہیں جانور سمجھتی رہی ہو۔ جب تم نے تقدیر کا حکم مان لیا کہ یہ شخص تمہاری زندگی میں اللہ کی طرف سے آیا ہے تو تمہیں اب اس کے ساتھ ساری عمر گزارنا ہو

گی۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کیسا انسان ہے؟ ہاں تمہیں یہ سب برداشت کرنا ہوگا۔ اپنے لیے نہیں تو اپنے بچے کے لیے۔ ڈرامے کی بہترین ہیروئن صرف اس لیے چپ ہوگئی تھی کہ اس کے ہاتھ سے لڑنے والا ہتھیار چھین لیا گیا تھا اور مشعال تمہارے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے یہ ہتھیار پکڑا کر تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف لے آیا ہے۔ وہ بات جو تم ایک عرصہ دراز سے نہ سمجھ سکیں وہ ایک نقطے نے تمہیں سمجھا دی۔" وہ سوچتی رہی۔

'تمہیں اب مشعال اپنے وجود سے ہٹ کر ایک اور وجود کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ ' فیصلہ کرنا ہوگا۔ وہی وجود جس کی زندگی کی ضمانت تمہارے فیصلے پر ہے۔" اللہ نے جو نئی بات سمجھائی تھی وہ اس کی ناقص عقل میں آگئی تھی۔

ایک فیصلہ کر لینے کے بعد وہ بالکل شانت سی ہوگئی تھی۔ وہ جہاں بیٹھتی سوچوں میں غرق رہتی۔ ہر وقت چپ چاپ' نہ کبھی ابیشا کی پکار کا کوئی جواب دیتی اور نہ ہی علیشا اور بھابی کی کسی بات پر سر اٹھاتی۔ ہر وقت گم صم سب نے اس کے انداز میں نئی تبدیلی محسوس کی تھی اور خوش بھی تھے کہ وہ ہر وقت غصہ کرنے 'لڑنے الجھنے یا ناراض ہونے کی بجائے صرف اور صرف چپ رہتی تھی۔

وہ اس وقت پاپا کے کمرے میں موجود ان کو سوپ پلا رہی تھی۔ ماما بھی قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب ابیشا نے آکر اسے حذیفہ کی آمد کی اطلاع دی۔ پاپا کا رنگ یک دم متغیر ہوگیا۔ وہ جو بغور انہیں دیکھ رہی تھی فوراً اس نے محسوس کر لیا۔

’’اچھا آذر بھائی کو کہو اسے بٹھائیں میں پاپا کو سوپ پلا کر آتی ہوں۔‘‘ ابیشا کی طرف منہ کر کے پہلے اس نے اسے چلتا کیا۔ پھر پاپا کو سوپ پلانے لگی مگر انہوں نے چند گھونٹ لیتے ہی اسے مزید پلانے سے منع کر دیا۔

’’اب تم جاؤ۔ میرا دل نہیں مان رہا۔ جب دل چاہا میں خود پی لوں گا۔‘‘

’’جی اچھا...‘‘ وہ سوپ والا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر باہر آئی۔

حذیفہ مردان خانے میں تنہا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ سلام دعا کے بعد دونوں کئی لمحے چپ چاپ بیٹھے رہے۔

’’حذیفہ! تم چاہتے ہو نا کہ میں شاہ زر سے طلاق نہ لوں۔ تم نے مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اب اس دن تمہارے چلے جانے کے بعد اگلے دن ہی مجھے اللہ کی رضا اور تقدیر کے لکھے پر یقین آگیا۔ تمہیں یاد ہے ‘‘ناں تم نے مجھے ارادہ، خواہش اور تقدیر کے متعلق کچھ کہا تھا۔

’’ہاں... مجھے سب اچھی طرح یاد ہے۔‘‘ وہ مشعال کے رویے پر الجھتے ہوئے اسے بغور دیکھنے لگا جو اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اضطراری انداز میں انگلیاں مروڑتی کمرے میں چکر لگانے لگی۔

حذیفہ ! ان چند دنوں میں میں نے اپنا موازنہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں بچپن سے لے کر آج تک خواہشوں کے پیچھے بھاگتی رہی ہوں۔ ایک پریکٹیکل سوچ رکھنے کے باوجود میں خواب دیکھنے سے آسودگی حاصل کرتی تھی۔ ارادوں اور منصوبوں کو سب کچھ سمجھتی تھی۔ جب میں ماما، پاپا اور ابیشا کے ہمراہ برطانیہ گئی تھی تو اس وقت میں صرف دس سال کی تھی۔ تم جانتے ہو ایک دس سالہ بچی جس کا دماغ و دل کورے کاغذ کی طرح صاف و شفاف ہو اور اس پر رنگ چھوڑنے والی کچھ یادیں بہت انمٹ سی ہوتی ہیں۔ میرے اندر باہر دل و دماغ، روح و بدن، سوچ اور گفتار احساسات و جذبات ہر چیز پر پاکستانی کلچر خاص طور پر یہاں اس گاؤں کی روایات، رسم و رواج محبتوں کے بندھن اور یہاں کے قوانین و فیصلوں کی ایک گہری چھاپ تھی۔ یہاں کے لوگوں کی محبتوں کا ایک بہت بڑا قرض تھا جو لے کر میں برطانیہ گئی تھی۔ ان محبتوں میں ایک محبت شاہ زر کی تھی۔

بالکل میری عمر کی طرح کم عمر سی۔ اچھوتے سے لمس، بے قرار سے جذبے، کسک دیتے الوہی سے پلے، میں نے ہر وقت خود نے کو شاہ زر کی محبت کے حصار میں مقید پایا۔ یہ سب کم عمری میں باندھے گئے رشتے کی دین تھا۔ ماما کے فیصلے، پاپا کی بے بسی اور وہاں کے لوگوں کے سلوک نے ذہنی طور پر مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ میری سوچ جو خاصی مادہ پرست سی تھی وہ میرے جذبات و احساسات کا ساتھ نہ دے پائی اور وہ جو ایک جذبہ تھا وہ ضد اور بغاوت و سرکشی میں بدل گیا۔ ماہ و سال بیتتے گئے تو میں خود سے لڑتے لڑتے اپنے ہر جذبے و احساس کو شکست دینے،

ہر رشتے سے منکر ہوتے ہوئے' ہر خواہش' ارادے اور منصوبے کے یقین پر ایمان لاتی گئی حتیٰ کہ مجھے اپنے ان احساسات سے چڑ ہوتی گئی جو میری سوچ کے خلاف برسرپیکار رہتے تھے۔

میرے اندر برطانیہ کے رنگ چھانے لگے۔ میں خود کو بدلنے لگی۔ درحقیقت میں اپنے رویوں سے خود بھی مطمئن نہیں تھی۔ اندھی تقلید نہ تو میری تربیت میں شامل تھی اور نہ ہی میرے خون میں۔ میں نے اپنی اندھی خواہشوں سے پیچھا چھڑانا چاہا تو وہ آسیب کی طرح میرے ساتھ چمٹ گئیں۔ میں نے خود کو ابیشا جیسا بنانا چاہا تو مجھے ماما' پاپا کے رویوں نے ہر چیز سے برگشتہ کر دیا۔

پاکستان تو ایک طرف مذہب کے متعلق میری سوچ منفی ہونے لگی۔ پاپا کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مجھے آزاد معاشرے کی برائیوں سے دور رکھیں۔ میری سوچ کو آلودہ نہ ہونے دیں۔ آزاد فضاؤں کا باسی نہ بننے دیں کیونکہ انہیں شاید یہ یقین تھا کہ پلٹ کر ہمیں یہیں آنا ہے۔ خاص طور پر مجھے۔ جب پاپا مجھے اللہ کی ناراضی کا کہتے' نماز پڑھنے کی تلقین کرتے تو میں ضد میں آکر قرآن پاک کو ہاتھ تک نہ لگاتی تھی۔ پاپا نے مذہب اور پاکستان کا ڈراوا دے کر مجھے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کی تو میں نے ضد میں آکر جینز اور شرٹس پہننا شروع کر دیں۔ میں نے ہر کام جان بوجھ کر کیا۔ ماما پاپا اور پاکستان کی ضد میں۔ میں نے ہر کام' ہر حکم کو' ہر بات کو چیلنج کیا۔ ناشکری کی۔ شکوے کیے۔

یہ ایسا دور تھا حذیفہ جب میں واقعی بھٹک گئی تھی۔ درحقیقت میں نے خود اپنے آپ کو پستی میں گرالیا تھا۔ اللہ نے تو مجھے مسلمان بنا کر بھیجا تھا مگر اس کا شکر ادا نہ کیا۔ میں سکون ڈھونڈنے کلبوں میں جانے لگی۔ پاپا کو لڑکیوں کی لڑکوں سے دوستی کرنا بہت زہر لگتا تھا مگر میں نے دوستیاں بڑھانا شروع کر دیں۔ مسلم و غیر مسلم دونوں سے۔ میں نے گمراہی کی طرف قدم بڑھائے تو اللہ نے مجھے ڈھیل دے دی۔ وہ اتنا رحیم و کریم اور غفور و مہربان ہے کہ میرے ہر کام، ہر غلطی کو ایک سرکش، کم عقل، ناسمجھ لڑکی کی خطا کہہ کر ٹال گیا۔ وہ چاہتا تو پہلی ہی غلطی پر مجھے سزا دیتا مگر اس نے مجھے میری لغزشوں پر کوئی سرزنش نہیں کی نہ کوئی سزا دی۔ میں نے جو خود گناہ کو دعوت دی تھی۔ وہ ذات مجھے ہر گناہ سے بچاتی رہی۔ اس نے وقتی طور پر میرے دل، میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا مگر میں مکمل طور پر نہیں بھٹکی تھی۔ کوئی احساس تھا جو مجھے اندر ہی اندر جھنجھوڑتا رہتا تھا۔

تم کہتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہونے کے باوجود تمہارے ساتھ نہیں ہوتی تھی تو حذیفہ یہ سچ تھا میں تمہارے ساتھ ہونے کے باوجود میری روح یہیں پاکستان میں ہوتی تھی۔ میں تم سے باتیں کرتی تھی تو تصور میں یہاں کے لوگ ہوتے تھے۔ میں بظاہر مغربی تاثر رکھنے کے باوجود اندر سے وہی مخصوص سوچ رکھنے والی مشرقی لڑکی تھی جو نائٹ کلب میں جانے کے باوجود وہاں کی گندگی سے بچتی رہی جو گناہ کی دلدل میں اترنے کے باوجود سراپا گناہ بننے سے

بچی رہی۔ اس میں تو میرا کمال نہ تھا۔ یہ اللہ کی کرم نوازی ہی تو تھی جسے میں آج تک غرور وخود پسندی کے لبادے میں وصولتی رہی۔

جو عمر میری خیر اور شر میں تمیز کرنے کی تھی وہ میں نے خود سے الجھتے' ماما پاپا کو الزام دیتے اور ماضی کو یاد کرتے کڑھتے گزرادی۔ وہ ایک ایسا ہی موڑ تھا جب میں بھکی تھی راستی وسلامتی کو بھول گئی۔ جب سب نے میری آزادی' بے باکی اور خود پسندی کو غلط نگاہ سے دیکھا تھا۔ ایسے میں تم مل گئے۔ تم میں ایک ایسی خاص بات تھی جو مجھے وہاں کسی مرد میں دکھائی نہ دی۔ میں نہ نہ کرتے ہوئے بھی تمہاری طرف کھنچتی چلی گئی۔ اس میں بھی تمہارا ہاتھ تھا ورنہ میں خود سے کبھی بھی کسی کی طرف نہیں بڑھتی۔ میں جو محبت کرنے کا رنگ ڈھنگ بھول گئی تھی۔ تم نے مجھے محبت کرنا سکھایا مگر حذیفہ میں نے صرف اپنے وجود سے محبت کرنا شروع کر دی۔

پھر یہاں آنے کے بعد سب حالات بدل گئے۔ بچپن کی کوئی پڑھائی دکھائی نہ دی۔ سب نے مجھے ایک بگڑی ہوئی مغربی پروردہ لڑکی جانا اور مجھے بھی ان سب سے ضد ہو گئی۔ میں بھی ان کی ہر سوچ کی نفی کرنے کی بجائے برملا تصدیق کرتی گئی۔ انھوں نے مجھے محبت دینے کی کوشش کی مگر میں اپنے دل میں اتنی گنجائش نہ کر پائی کہ محبت اس میں سما سکے اور شاہ زر جس کی نہ بھولنے والی محبتیں' نفرتوں کا لبادہ اوڑھ گئیں۔ نرم و نازک حساس سے جذبے انتقام کی آگ میں جھلسنے لگے اور اب جب کہ شاہ زر مجھ سے طلاق دینے کا وعدہ کر چکا تھا تو تم آگئے اور

جب میں سب کچھ ٹھان چکی تو اللہ نے میرے ارادوں کو بدل دیا اور جب وہ مجھے چھوڑ رہا تھا۔
۔۔۔ پھر سب کچھ بدل گیا ''

وہ بہت دیر بولنے کے بعد اچانک کہتے کہتے رک گئی۔ پھر حذیفہ کی طرف دیکھا جو ٹکٹکی باندھے اس پر ہی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ وہ ہنس دی۔ اسے خود اپنی آواز بہت اجنبی لگی۔ ٹوٹی پھوٹی ہنسی والی آواز بہت سے کانچ بکھرے محسوس ہوئے کسی چیز کی چبھن، کچھ ٹوٹنے، کسی گہرے ملال کی جھلک بہت واضح تھی۔ ایسی ہی چبھن آنکھوں میں بھی اتر آئی۔ تکلیف کی شدت سے آنکھیں بھی جگمگانے لگی۔

''حذیفہ! صرف ایک دفعہ میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی جب میں نے برطانیہ میں تمہیں اسلام قبول کرنے کو کہا تھا۔ اس وقت کسی نے میرے اندر سے مجھے باور کرانا چاہا کہ میں خود کتنی پکی مسلمان ہوں جو تم پر مسلمان ہونے کی شرط عائد کر رہی ہوں مگر میں نے اپنی سوچ کو اسی وقت جھٹک دیا تھا۔ اس گمان پر کہ میں پیدائش مسلمان ہوں کلمہ گو ہوں۔ اسلام سے تعلق رکھتی ہوں تو پھر میرے لیے ایک پکی مسلمان ہونا کیا جواز ہے۔ میں ایک مسلمان کی بیٹی ہوں کیا یہ جواز کافی نہیں۔ کاش میں اس وقت سوچ لیتی...؟ ''

وہ اب بالکل خاموش تھی درمیانی کئی لمحے یوں ہی گزر گئے۔

''یہاں آنے کے بعد میں عورت کی انکساری پر ہنسی تھی۔ میں نے اس کا مذاق اڑایا تھا اور برملا کہا تھا کہ میں یہ سب نہیں کروں گی۔ مجھے یہ زعم تھا کہ یہ میری اپنی زندگی ہے۔ پھر میں

اپنی زندگی اپنی والدین کے فیصلوں پر کیوں قربان کروں؟ اپنے بارے میں فیصلے کرنے کا ہر اختیار صرف مجھے حاصل ہے تو کوئی دوسرا کیونکر میری ذاتی زندگی میں مداخلت کر سکتا ہے۔ اس زعم میں، میں یہ بھول گئی کہ میں بندوں کو تو بدل سکتی ہوں اپنے ہاتھوں کے لکھے مقدر کو نہیں۔

آج مجھے اپنی ہر سوچ، ہر خیال اور ہر ضد پر ندامت ہو رہی ہے۔ میرے ساتھ سابقہ برسوں سے وہی ہوتا آرہا ہے جو میرے اعمال کا نتیجہ تھا۔ اس میں میری تقدیر کا کتنا قصور ہے میں یہ بھی جان گئی ہوں اور اس پر بھی ایمان لے آئی ہوں کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو وہ مجھے ہمیشہ بھٹکائے رکھتا مگر اس کی محبت دیکھو اس نے مجھے ہر گناہ سے بچائے رکھا۔ میری ضد، ہٹ دھرمی، اور خود پسندی کے باوجود اس نے مجھے سیدھی راہ دکھادی۔

میں نے صرف ایک دفعہ صدق دل اور خلوص زبان سے اندھیری نگری سے نکلنے کا راستہ اس سے مانگا تھا اور اس نے میری ساری راہیں روشن کر دیں۔ میرے ذہن کی تاریکی کو جھلملاہٹ بخش دی اور پھر ہر بات واضح ہوتی گئی۔ اس میں موجود سب گرہیں خود بخود کھلتی چلی گئیں۔ میرے دل، میری اندھی سوچ اور میری گمراہ آنکھوں پر بندھی پٹی جب اتری تو میرا راستہ روشن ہو گیا۔ میں نے جان لیا کہ جو کچھ اس کی رضا سے ہوا اور اب کبھی اس سے شکوہ نہیں کروں گی۔ ہاں یہ بھی سچ ہے اللہ نے انسان کو زمین پر جب بھیجا تو اسے کچھ اختیارات دیتے

ہوئے ان کی حد بندی بھی کر دی تھی اور شاہ زر اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا غلط کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کچھ اختیارات ضرور دیے تھے مگر یہ حکم تو نہیں دیا تھا کہ وہ ان اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھائے۔ غلط سمت چلے۔ میں غلط تھی تو وہ درست تھا۔ ہمیشہ پاکستان میں رہا' اسلام کے قریب پھر وہ کیوں یہ سب کرتا رہا؟ کیوں میرے معاملے میں غلط طریقہ اپنایا اس نے؟"

حذیفہ اسے بغور دیکھ رہا تھا وہ چپ ہوئی تو اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا جب کہ دوبارہ سننے کا منتظر ضرور رہا۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر کہنے لگی۔

'' حذیفہ! تم نے مجھے کہا کہ میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کروں تو میں نے بہت سوچا۔ دن رات سوچنے میں گزار دیے۔ اب کہیں جا کر میں یہ فیصلہ کر پائی ہوں کہ انسان اپنے اصل کی طرف لوٹتا ہے۔ چاہے دیر سے سہی۔ اب جو میں لوٹی ہوں تو میں کچھ دیر سکون چاہتی ہوں۔ خود کو یہاں کا ایک حصہ بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں مسلسل ایک سراب کے پیچھے بھاگنے سے چکنا چور ہو گئی ہوں۔ ابھی مجھے خود کو جوڑنا ہے۔ نئے سرے سے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔

میں تب تک اندھیرے میں بھٹکتی رہی جب تک میں صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتی رہی اور جب سے میں نے صرف اپنی ذات کے حصار سے نکل کر کسی اور ذات کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے تو سب عیاں ہوتا گیا ہے۔ بہت سی گرہیں کھل گئی ہیں۔ میں اب ایک ایسی زندگی جو کبھی بھی میری پسند نہیں رہی تھی صرف اس لیے گزاروں گی کیونکہ اللہ کی یہی

مرضی ہے اور میں نے اکثر پاپا شاہ زر کو کہتے سنا ہے کہ جو فیصلہ آئندہ نسلوں کی بھلائی کے لیے کیا جائے۔ اس پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوتا۔" وہ اب بالکل ہی خاموش ہو گئی تھی۔ نجانے کب آنسو آنکھوں سے بہنا شروع ہو گئے تھے۔ حذیفہ جو اسے بغور دیکھ رہا تھا اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں بہت سی روشنی تھی۔ بہت اچھے جذبے مچل رہے تھے۔

''میرے اس فیصلے سے تم خوش ہو نا حذیفہ؟''

''ہاں بہت زیادہ۔ میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ تم بہت خوش رہو۔ میں تمہاری ذات کی بے سکونی، اضطراب اور اسرار میں الجھا ہوا تھا۔ پہلی ملاقات سے لے کر یہاں آنے تک بعد میں جب میں نے تم سے محبت کی بہت خلوص سے کی اور شاہ زر سے شادی کے بعد تمہارے بارے میں ایسی کوئی سوچ رکھنے کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تم کہو نہ کہو مگر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم شاہ زر کے بغیر بالکل ادھوری، ایک بھٹکی ہوئی روح کی مانند ہو اور میں نے پورے خلوص کے اس بھٹکی ہوئی روح کو اس کے جسم سے ملانے کی اپنی سی کوشش کی اور مجھے اپنی اس کوشش پر کوئی ندامت نہیں۔ نہ کوئی پچھتاوا ہے نہ ہی تمہارے فیصلے پر افسردہ ہوں کیونکہ جو فیصلہ اچھے دنوں کی آس میں کیا جائے وہ ضرور پھل لاتا ہے۔"

اس نے آخر میں اس کی کہی بات کو مختلف انداز میں کہا تھا۔ وہ بہتی آنکھوں سمیت بے اختیار مسکرا دی۔ حذیفہ جیسے لوگ بلکہ مخلص دوست بہت کم لوگوں کو ملتے ہیں۔ اگر مل جائیں تو

بہت کم کو ان کی پر خلوص رہنمائی میسر آتی ہے۔ اسے خود پر فخر ہوا۔ اللہ کی اس عنایت پر دل سرشار ہو گیا۔

’’تم میری ایک بات مانو گے؟ تم پلیز کسی اچھی سی لڑکی سے شادی ضرور کر لینا تم خود اتنے اچھے اور صاف ستھری سوچ کے مالک ہو تمہیں تو اتنی اچھی سی پیاری خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔‘‘

’’کیوں نہیں۔ ظاہر ہے شادی تو کروں گا۔ یہ زندگی کا اہم حصہ ہے مگر بہت ساری سے نہیں بلکہ کسی ایک سے جو تم جیسی ہو مگر ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے سیٹل ہونے میں کچھ سال درکار ہیں۔ میں اپنے والدین کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ ایسی صورت حال میں مجھے ایک فیملی کی اشد ضرورت ہے لیکن مشعال ابھی تو میں دونوں ہاتھوں سے خالی ہوں۔ خود کو پہلے سیٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں نے دبئی جاب کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے۔ میری درخواست قبول ہو گئی۔ دبئی میں انجنیئرنگ پروجیکٹ پر فیلڈ ورک کے لیے جوائن لیٹر مل گیا ہے۔ انشاء اللہ اب میں بہت جلد دبئی چلا جاؤں گا۔‘‘

’’کیا واقعی؟ تو تم یہاں پاکستان میں نہیں ٹھہرو گے؟‘‘ اس نے ایک دم پوچھا تو اس نے مسکرا کے سر نفی میں ہلا دیا۔

’’پاکستان بہت اچھا ہے۔ مجھے یہاں رہنے سے انکار نہیں مگر مشعال! میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ غم روزگار کے لیے مجھے ہر حال میں یہاں سے جانا ہے اور قسمت سے مجھے دینی کام

کرنے کے لیے موقع مل رہا ہے تو میں اسے نظرانداز نہیں کر سکتا کیونکہ زندگی گزارنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔" وہ رک گیا ایک لمحہ کو مشعال کو دیکھا۔ "مشعال! مجھے ہمیشہ یہ فخر حاصل رہے گا کہ میں نے کسی ایسی لڑکی کو چاہا تھا جو اب خود سے زیادہ اوروں کا خیال کرنے لگی ہے۔

اکثر مجھے تمہاری اس عادت سے بہت گھبراہٹ ہو جاتی تھی مگر اب تمہیں یوں بدلا بدلا دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ کوشش کرنا شاہ زر کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ بس وقت اور حالات نے اسے بہکا دیا۔ اگر تم دونوں ایک دوسرے کی دل سے عزت کرو گے تو بہت اچھی زندگی گزرے گی اور ہاں میری طرف سے کبھی کچھ مت سوچنا نہ میرا خیال کبھی اپنے دل و دماغ میں لانا جو ہمارے درمیان کبھی تھا وہ اب نہیں رہا اور جواب ہے وہ کبھی بھی نہیں تھا۔ میری تمام دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میں جب کبھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤں گا میری دعاؤں میں تمہارا حصہ ضرور ہو گا۔"

مشعال نے اس کی بات پر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانا چاہی۔ اس اعتماد اور فخر سونپے جانے پر اس نے خوش ہونا چاہا مگر ناکام ہو کر وہ بے اختیار رو پڑی۔ پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ حذیفہ اس کا ایک بہت اچھا دوست تھا اس نے ہمیشہ ایک اچھا انسان ہونے کا حق ادا کیا تھا۔

’’شاید پاکستان سے جاتے ہوئے میں تم سے مل نہ پاؤں اسی لیے میری طرف سے یہ آخری ملاقات سمجھو۔‘‘

’’تو تم واقعی چلے جاؤ گے؟‘‘ بہت ہی آس سے اس نے دوبارہ پوچھا۔ بہت شدت سے دل چاہا کہ وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں روک لے۔ اسے ابھی اس کی بھرپور پر خلوص دوستی کی ضرورت تھی مگر وہ اب خود غرض نہیں بننا چاہتی تھی۔

’’ہاں مجبوری ہے۔‘‘ وہ بھی دھیمی مسکراہٹ لبوں پر لا کر مسکرایا۔

’’اوکے مشعال! اب میں چلتا ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے اپنا ہمیشہ خیال رکھنا۔ شاہ زر کے ساتھ خوش رہنا اور اللہ حافظ۔‘‘

’’اللہ حافظ۔‘‘ اس نے بھی کہا وہ جلدی میں قدم اٹھاتا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ وہ دیر تک وہاں تنہا کمرے میں بیٹھی اپنے آنسو صاف کرتی رہی۔ کافی دیر بعد اپنا سرخ رویا چہرہ ٬ متورم آنکھیں صاف کر کے وہ واپس پاپا کے کمرے میں آ گئی۔

وہ لیٹے لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ وہ ان کے پاس ہی بستر پر بیٹھ گئی۔ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ جب کہ پاپا اس کا رویا رویا چہرہ اور سرخ متورم آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔

پاپا! اب آپ پر سکون ہو جائیں۔ میں آج حذیفہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ آئی ہوں۔ وہ واپس جا رہا ہے۔ اب آپ کو پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اگر آپ سختی کی بجائے مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے تو یقینا بیچ میں کھڑی آپ کو یہ سب نہ کہہ رہی ہوتی۔ اب کوئی بھی ہماری زندگی میں دخل اندازی کر کے زہر نہیں گھول سکتا اور پاپا نہ ہی کبھی حذیفہ نے گھولنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو میرا ایک مخلص رہنما اور دوست تھا جو کچھ بھی ہوا میری اپنی وجہ سے ہوا۔ وہ تو بالکل بے قصور ہے۔" وہ کافی دیر تک باتیں کرنے کے بعد جب باہر نکلنے لگی تو دروازے پر ہی رک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مشعال..." وہ بے یقینی اور حیرت سے بولے۔ وہ پلٹ کر دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔

[...خ...]

وہ لاؤنج میں صوفے پر لیٹی ہوئی تھی جب وہ سب اندر داخل ہوئیں۔ بھابی‘ چچی‘ زینب اور ابیشا چاروں تھیں۔ گاؤں میں کوئی مدرسہ تھا وہ سب وہیں جاتی تھیں۔ کبھی کبھار ان سب کے درمیان بڑی امی اور ماما بھی چلی جایا کرتی تھیں۔ جب سے اس نے اپنی ذات سے باہر نکل کر ارد گرد دیکھنا شروع کیا تو علم ہوا کہ اس گاؤں میں بھی کوئی اسلامی انسٹی ٹیوٹ ہے جہاں گاؤں کی خواتین تعلیم و تربیت کے لیے جایا کرتی ہیں۔

آ گئیں آپ...؟" اس نے مسکرا کر سب کو دیکھا۔

جی ہاں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلی چلا کریں۔ سارا دن اکیلی ہوتی ہیں چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں۔ آپ یقیناً وہاں جا کر بہت اچھا محسوس کریں گی۔" علیشہ اسے آفر کر رہی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر سوچتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اگلے دن جب ابیشا' علیشہ اور بھابی جانے لگیں تو انہوں نے اسے بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تو وہ فوراً تیار ہو گئی۔ وہاں کا ماحول بہت دینی اور سکون بخش تھا۔ وہاں وقت گزار کر اسے بہت دلی سکون ملا۔ مدرسہ دیکھ کر اسے بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ یہ اسلامک اکیڈمک قسم کا کوئی منظّم ادارہ ہے اس مدرسے کی منظّم اعلیٰ ایک نیک سی خاتون تھیں۔

جب انہیں علم ہوا کہ وہ شاہ زر کی بیوی ہے تو وہ بہت خلوص سے ملیں۔ ان کا انداز اچھا تھا۔ مشعال ان سے مل کر بہت متاثر ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن پاک کی کلاس ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ ان عورتوں کے سوالوں کے جوابات اور مسئلہ و مسائل کے حل قرآن و حدیث کی رو سے بتانے لگیں۔ شانزہ کا انداز اگرچہ تبلیغی تھا مگر بہت ہی پُر حکمت پُر اثر اور دل کو متاثر کرنے والا تھا۔ وہ جیسے جیسے سنتی گئی مزید گرویدہ ہوتی گئی۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب جب وہ واپس لوٹ رہی تھی تو دل میں پکا ارادہ باندھ چکی تھی کہ وہ کل یہاں دوبارہ آئے گی۔

وہ ہر روز مدرسے جانے لگی تھی۔ شانزہ کی باتیں سنتے سنتے قرآن و حدیث کی تعلیمات پر غور کرتے کرتے وہ اندر تک بدلنے لگی تھی۔ پاپا نے ان دونوں بہنوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ زبردستی ہی سہی انہوں نے انہیں نماز کلمے قرآن پاک کا ترجمہ اور اسلام

کی بنیادی تعلیمات ضرور سکھا دی تھیں۔ شانزہ کو جوائن کرنے کے بعد وہ مزید بہت کچھ سیکھنے لگی۔ پہلے دن جب وہ وہاں گئی تھی تو ٹرائوزر اور شرٹ میں تھی اگرچہ چادر اوڑھے ہوئی تھی مگر وہاں جا کر وہاں کا مذہبی ماحول دیکھ کر اسے شرمندگی ہوئی تھی۔ حقیقی معنوں میں اسے پہلی دفعہ اپنی ڈریسنگ قابلِ اعتراض لگی۔

اگلے دن وہ مکمل طور پر شلوار قمیص اور دوپٹے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی گفتگو میں بھی ایک خاص ٹھہراؤ آگیا تھا۔ اپنے صبر وضبط کو آزمانا سیکھنے لگی۔ حقوق العباد پر بھی توجہ دینے لگی۔ زبان میں ایک حلاوت وشائستگی اتر آئی تھی۔ آنکھوں میں موجود رہنے والی ہمہ وقت کی ضد اور ہٹ دھرمی ختم ہوگئی۔ لہجے کی اور طبیعت کی بغاوت میں بھی کمی واقع ہوگئی تھی۔ بظاہر ساری شخصیت اس قدر تیزی سے بدلتی جا رہی تھی کہ صرف ایک ہفتے میں ہی دیکھنے والوں کو وہ اندر باہر سے ایک آئینے کی طرف صاف وشفاف دکھائی دینے لگی تھی۔

اس دن جلدی درس ختم ہوا تو عورتوں کے چلے جانے کے بعد شانزہ اسے مدرسے کے ساتھ ہی واقع سلائی سینٹر میں لے آئی۔ وہاں بڑے بڑے مختلف کمروں میں مختلف کام ہو رہا تھا۔ ایک بہت بڑے ہال نما کمرے میں کئی عورتیں اور لڑکیاں مشین پر سلائی کا کام کر رہی تھیں۔ شانزہ اسے ہمراہ لیے ایک ایک کمرے میں جا رہی تھی۔ جدید مشینری اور مہارت سے چلتے عورتوں اور لڑکیوں کے ہاتھ ایک عرصے تک جس گاؤں کے متعلق اتنے غلط اور برے خیالات رکھتی چلی آئی تھی۔ اسی گاؤں کی عورتیں اتنی سلیقہ مند سگھڑ اور محنتی بھی ہیں۔ ایک جگہ بہت

ساری لڑکیاں مقامی ڈیزائن میں ہاتھ کا کام کرتی دکھائی دیں۔ بہت ہی خوب صورت دلکش دھاگوں سے قمیصوں اور دوپٹوں پر مہارت و نفاست سے کیا جانا والا کام اسے بہت پسند آیا۔ وہ اس کام کو سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

ویری ویل شانزہ! یہ تو بہت خوب صورت کام ہے۔” ایک لڑکی کے پاس رک کر ’ ’ اسے سرخ قمیص پر بلیک دھاگوں سے کروشیے کا کام کرتے دیکھ کر اس نے شانزہ کو مخاطب کیا۔

یہ تو کچھ نہیں۔ کل میرے ساتھ نیچے چلنا۔ تہہ خانے میں عورتوں کے کام کا اسٹاک ’ ’ پڑا ہوا ہے۔ وہ دیکھنا حیران رہ جاؤ گی۔ بہت خوب صورت اور محنت سے کام کرتی ہیں یہ ”خواتین۔

اچھا...” وہ حیرانی سے اس کے ساتھ آگے قدم بڑھانے لگی۔ ’ ’

شانزہ! آپ نے یہ دونوں انسٹی ٹیوٹ کیسے مینج کیے ہوئے ہیں۔ جامعہ کی ڈیوٹی بھی ’ ’ دینا۔ یہاں کے کام بھی خیال رکھنا اور اپنے گھر کی بھی دیکھ بھال کرنا۔” سب دیکھنے بعد شانزہ کے گھر کی طرف جاتے ہوئے پوچھنے لگی جو سینٹر کی بالائی منزل پر تھا۔

ہر ذمے داری توجہ محنت اور خلوص مانگتی ہے۔ جو کام جتنی دیانت داری اور ذمہ داری ’ ’ سے کیا جائے اتنا ہی سود مند ہوتا ہے۔ سینٹرز میں ہم نے کچھ ڈیزائنرز اور یہاں کی عورتوں کو

رکھا ہوا ہے۔ وہی سب دیکھ لیتی ہیں۔ میں خود بھی دن میں کئی بار آتے جاتے چکر لگا لیتی ہوں۔ البتہ مدرسے کا سارا انتظام میرے اپنے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ دونوں ادارے دیکھ کر شانزہ یقین کریں مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ اس گاؤں کو واقعی اس قسم کے سینٹرز کی اشد ضرورت تھی۔ ویسے آپ کو اس کا خیال آیا کیسے؟ آپ تو شاید لاہور کی ہیں۔ پھر یہاں کیسے آ گئیں؟" اس کے ساتھ اس کے سجے سجائے خوب صورت ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے اس نے مزید پوچھا۔ وہ شانزہ کے ساتھ اس کے گھر میں ایک دفعہ پہلے بھی آ چکی تھی۔

"یہ خیال آپ کے شوہر صاحب کو آیا تھا اور یہ دونوں سینٹرز بھی اس نے سیٹ کروا کر دیئے تھے۔ عمارت سے لے کر سینٹرز کی مشینری ساز و سامان اور دیگر ضروریات وہی پوری کرتا ہے۔"

"آپ کا مطلب شاہ زر؟" اس انکشاف پر وہ ازحد حیران تھی۔ مشعال کو بے تحاشا حیران ہوتے دیکھ کر شانزہ سر ہلاتے مسکرا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ بے تابی سے کافی دیر تک اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ جب لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ گرم بھاپ اڑاتی چائے کا کپ اسے تھما کر بسکٹ کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ اس کے اپنے ہاتھ میں بھی چائے کا کپ تھا جس وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

شاہ زر سے میری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کے طالب علم تھے۔ اگرچہ کلاس فیلوز ہونے کے باوجود شروع میں ہماری کوئی خاص بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ صرف رسمی علیک سلیک ہی تھی۔ پھر ایک دن میری فرینڈ کا اس کی گاڑی سے ٹکرا کر ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بعد میں اس نے میری اور میری فرینڈ کی ہاسپٹل لے جانے میں مدد کی تھی۔ بس اس کے بعد ہماری اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی جو ہلکی پھلکی فرینڈ شپ تک ہی تھی۔

میرے والد واعظ ہیں اور خطیب بھی ہیں۔ میرے ابّو جس جماعت کے ساتھ منسلک ہیں وہ ملکی و غیر ملکی لیول پر اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اپنے ابو کے ساتھ رہتے ہوئے میرے اندر بھی ان ہی کا رنگ غالب آ چکا ہے۔ میں نے پسماندہ علاقوں میں اپنے ابو کے ساتھ مل کر لوگوں کے اعتقادات، رسم و رواج سوچ اور اسلامی تعلیمات کی طرف سے روگردانی پر بہت کام کیا ہے۔ پھر میرا مضمون بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا کہ مجھے آئے دن اپنے ابو کی طرف سے اسی قسم کی معلومات دستیاب رہتی تھیں۔

میں نے یونیورسٹی لیول تک حکایت اور تبلیغ کی فیلڈ میں ابو کے ساتھ مل کر اچھا خاصا کام کیا ہوا ہے۔ یونیورسٹی میں ہر ہفتے ایک دن کسی نہ کسی کلاس میں جا کر وہاں کے طلباء کو اسلامی تعلیمات کے متعلق بتایا کرتی تھی۔ شاہ زر بھی میرا وہ لیکچر ضرور اٹینڈ کرتا تھا۔

ذہنی پسماندگی اور ابتری کا عالم یہ تھا کہ ایک طرف بداعتقاد لوگوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں جو اس ملنگ سے دعا کروانے آئے تھے اگر مشعال اس دن تم ہمارے ساتھ ہوتی اور دیکھتیں۔ وہ نام نہاد زاہد و متقی ملنگ کیسا انسان تھا۔ ایک ہٹا کٹا تیس سالہ جوان آدمی تھا جس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ بازو میں کڑے تھے۔ گلے میں لمبی لمبی سونے چاندی کی مالائیں لٹک رہی تھیں اور آنکھوں سے ایک عجیب سی وحشت ٹپکتی تھی۔

اس دن مجھے دیکھ کر احساس ہوا کہ ان جاہل، انجان کم فہم لوگوں کے خلاف جہاد کون کرے گا؟ کون سے جوان اندھے گونگے بداعتقاد لوگوں کو توحید کی روشنی کی طرف لائے گا۔ کون ہے جو ان کے دماغوں کے اندر کم علمی کا بھرا بھس نکالے گا؟ ان پر آگہی کے در وا کرے گا؟ پہلی دفعہ جب شاہ زر نے مجھے اپنے علاقے میں یہ ادارہ کھولنے کی آفر کی تو میں نے ایک لمحے کو ضرور سوچا تھا کہ یہ شخص کیوں چاہتا ہے کہ میں ادھر آئوں یہاں کام کروں؟ پھر جب میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مجھے یقین آگیا کہ واقعی اس علاقے کو ایک ایسے ادارے کی اشد ضرورت ہے جو ان کو اندھیرے غاروں سے نکال کر اسلام کی روشنی کی طرف لے آئے۔ جب یہ مقصد ٹھہرا کہ لوگوں کو "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فریضہ سرانجام دینا ہے تو پھر کیوں نہ اس علاقے سے آغاز کریں۔ میں نے شاہ زر سے حامی بھر لی۔ اس نے یہ دونوں ادارے بنوا دیے ساتھ میں ایک کلینک بھی۔ اس گائوں میں صرف ایک گورنمنٹ کا اسکول تھا جو بعد میں مڈل تک ہو گیا تھا۔ شاہ زر نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اسے ہائی اسکول کا درجہ

دلوایا۔ گاؤں سے باہر قریبی اسکول کو کالج کا درجہ دلوا دیا۔ یہاں کی ناپختہ کچی سڑکیں پکی بنوائیں۔ گرلز پرائمری اسکول کو ہائی اسکول کا درجہ دینے کی گورنمنٹ سے منظوری لی۔ میں جب شاہ زر کا جنون دیکھتی تو حیران ہوتی تھی۔ نجانے اس کے اندر کیسی لگن تھی ایسی کیا بات تھی کہ وہ بغیر کسی صلے کے یہ سب کام کر رہا تھا اور وہ بھی صرف اپنی جیب سے لوگوں کے فائدے کی خاطر... عموماً لوگوں کی طرح میرے بھی نظریات ان چوہدریوں' وڈیروں اور شاہوں جاگیرداروں کے متعلق اچھے نہیں تھے اور جب میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے یہی سوال شاہ زر سے کیا تو جانتی ہو مشعال اس نے کیا کہا تھا؟

مشعال نظریں جمائے بدستور اس کے صبیح پر وقار چہرے کو دیکھے گئیں جو کسی احساس سے چمک رہا تھا۔ دوپٹے کے ہالے میں روشن پیشانی پر موجود سجدوں کا نشان' اس کی جھلملاتی آنکھوں کے ستارے حوصلوں و عزم کے قصے عیاں کر رہے تھے۔

اس نے کہا تھا کہ وہ خود اس علاقے کے لوگوں کے غلط فیصلے' یہاں کے رسم و رواج' ' ' بداعتقادی و برائیوں کی پیداوار ہے۔ اس کا یہ علاقہ جہالت کے اندھے تاریک اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ یہاں ایک تبدیلی لانا چاہتا ہے۔ پر یقین و روشن تبدیلی۔ توحید و رسالت کی سچی روشنی' یقین امید کی سچی لگن۔ مشعال جب پہلی دفعہ صرف سروے کے لیے میں یہاں آئی تھی تو صرف چند لوگوں کا مشاہدہ کیا تھا پھر جب میں عملاً یہاں کچھ خاص کرنے' کچھ منوانے' کوئی سچی و روشن تبدیلی لانے توحید و رسالت سے آگہی دینے یقین و امید کی سچی لگن' دلوں میں پیدا

کرنے کے لیے میدان میں اتری تو بہت سے ایسے مسائل تھے جو ہماری راہ روکے ہوئے تھے۔ بہت سے مسائل کا ہمیں سامنا کرنا پڑا تھا۔

یہاں صرف ایک عورت اپنی بچی کو کسی ملنگ یا پیر سے نہیں پٹوا رہی تھی بلکہ یہاں سب عورتوں اور مردوں کا یہی حال تھا۔ ان کے نزدیک یہی پیر و فقیر' ملنگ اور قبروں والے ان کے داتا ہیں۔ یہی ان کو کھلاتے اور پلاتے ہیں۔ استغفر اللہ اس قدر جہالت تھی لوگوں کے اندر لاعلمی تھی۔ یہاں ہر شخص نے دولت و جاگیر کو خدا مان رکھا تھا۔ خاندانی دشمنیاں عروج پر تھیں اور بے حیائی اس قدر کہ لڑکیاں بے چاریاں تنہا گھروں سے نکلنے سے گھبراتی تھیں۔ ان پیروں فقیروں کے جادو ٹونوں نے ان کے عقیدوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ ہر قبر والے کو کوئی پہنچا ہوا تصور کر کے لوگ قبروں پر دیئے جلاتے' منتیں مانگتے رو رو گڑگڑا کر دعائیں اور سجدے کرتے تھے۔ یہاں تک کہتے تھے کہ سب کچھ ہمیں یہ قبروں والے چاہیں تو ان کے گھروں میں اناج گندم چاول آئیں گے ورنہ لوگ بھوکے مر جائیں گے۔

اندھے اعتقاد کی یہ حالت تھی کہ اگر کسی کے بچے کو بخار آگیا ہے بجائے اس کے کہ وہ کسی ڈاکٹر کو دکھائے علاج کروائے۔ حفظان صحت کے اصول اپنائے' میڈیسن لے' وہ فقیروں پیروں اور مولویوں کے پاس بھاگتے تھے اور ہزاروں لٹا دیتے تھے۔ ہر طرف بداعمالی و بد اعتقادی کا زور تھا۔ شاہ زر سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کے اس علاقے کے لوگوں کی حالت بدلنے میں اس کی مدد کروں گی۔ اسلامی تعلیمات کا پرچار کروں گی۔ ہم سب مل کر ایک

تبدیلی لائیں گے۔ وہ روشن تبدیلی جو یہاں کے بچے بچے کا مستقبل روشن کر دے جو واقعی میں ثابت کر دے کہ ابھی اسلام کے نام لیوا اس دنیا میں باقی ہیں۔ ابھی پوری طرح تاریکی نہیں چھائی۔ ابھی روشنی باقی ہے۔ توحید ایمان کی کرنوں سے سجی امید کی سچی روشنی۔ اپنے ابو سے بات کرنے کے بعد میں ایک پوری ٹیم کے ہمراہ یہاں آگئی جن میں ڈاکٹرز تھے، ٹیچرز اور سلائی کڑھائی کی ماہر خواتین تھیں۔ ڈاکٹرز یہاں ارد گرد کے مختلف گاؤں میں فری کیمپ لگاتے تھے۔ ٹیچرز مرد و عورتیں لوگوں کو آگہی دیتے تھے۔

ایک دم بدلنا اتنا آسان نہیں تھا لوگوں کی کم علمی و جہالت کے پیچھے نسل در نسل ملنے والی غلط روایات، فرسودہ رسم و رواج اور کہن زدہ سوچ تھی جس نے یہاں کے لوگوں کو مکڑی کے جالے کی طرف جکڑا ہوا تھا اب یہ ہمارا کام تھا کہ اسلام کی اچھی روایات، اچھی سوچ اور قابلِ قبول رسم و رواج سے ان لوگوں آگاہ کر کے ان کی سوچ بدلتے۔ آغاز اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صحابہ کرام کو بھی بے پناہ مخالفت و اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر دور میں جہاں بھی اسلام کی اصل روح کو جب بھی متعارف کروایا گیا جنگ و جدل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت کے عربوں کی سوچ اور آج کے لوگوں کی سوچ کسی بھی طرح مختلف نہ تھی۔ انہیں بھی آباؤ اجداد کے مذہب کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے کو کہا گیا اور یہاں کے لوگوں کو بھی اپنے بزرگوں کی غلط سوچ کی پیروی کرنے کی بجائے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کو کہا گیا تھا۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔

زمانہ جاہلیت کے لوگ تو مٹی کے بتوں کی پرستش کرتے تھے اور یہ لوگ غلط سوچ' اندھی خواہشات' بے راہ روی' دولت کے آگے جھکتے تھے۔ نتیجتاً زمانہ جاہلیت کے لوگ آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے دشمن ہو گئے۔ ان لوگوں نے بھی بہت زیادہ کوشش کی کہ ہمیں یہاں سے بھگا دیں۔ کسی نہ کسی طرح خوف زدہ وہراساں کر کے یہاں سے سب چھوڑ چھاڑ کر نکل جانے پر مجبور کر دیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ پیر و فقیر بنے تھے۔ ان کے کہنے پر لوگ مشتعل ہو گئے تھے مگر بھلا ہو شاہ زر اور اس کی فیملی کا' جنہوں نے نہ صرف ہمیں یہاں پاؤں مضبوط کرنے کے لیے جگہ فراہم کی بلکہ اخلاقی و مالی ہر طرح کی مدد بھی کی۔ لوگوں کی سوچ بدلنے کے لیے شاہ زر کی چچی زینب' بھابی بہنیں اور بڑی امی خود لوگوں کے گھروں میں جا کر عورتوں کو مدرسے میں آنے کے لیے درخواست کرتی تھیں۔ کلینک سے علاج کروانے اور فری میڈیکل اور ٹیچنگ کیمپ سے رابطہ کرنے کو کہتی تھیں۔

ایسے عالم میں شاہ زر اور اس کی فیملی کا تعاون بہت معاون و مددگار ثابت ہوا۔ جوں جوں دنیا ترقی کرتی جا رہی ہے تو کم عقل و نچلی سطح کے لوگوں میں ٹرینڈ چل چکا ہے کہ جو کام اپر کلاس اور خوشحال گھرانوں کے لوگ کریں گے وہ ہر حال میں قابلِ تقلید ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ یہی اصول ہمارے لیے بہت معاون ثابت ہوا جب یہاں کے مزارعوں اور غریب لوگوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ شاہوں کی عورتیں تو خود ہی سب کچھ کروا رہی ہیں تو ان کی مخالفت

خود بخود دم توڑ گئی۔ ان کی محاذ آرائی کے حوصلے پست ہو گئے اور پھر ہمیں اپنا کام کرنے کا موقع مل گیا۔"

مشعال بغور اس کے مسکراتے چہرے اور روشن آنکھوں کو دیکھتی رہی۔

''مشعال! ہمارے سروے کے مطابق ہر گاؤں کی لڑکیوں کو ہائی اسکول کا مسئلہ درپیش ہے۔ کہیں اسپتال نہیں۔ اگر خوش قسمتی سے یہ دونوں سہولتیں وہاں موجود ہیں تو بد قسمتی سے ڈاکٹر' میڈیسن' ٹیچرز' فرنیچر دستیاب نہیں۔ اگر یہ چیزیں ہیں تو وہاں کے حاکم جاگیردار لوگوں کا استحصال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر لوگوں میں شعور ہے تو مختلف مسائل ان کے حوصلے پست کرنے کو تیار کھڑے ہیں۔ بہت بری حالت ہے مشعال ہمیں یقین نہیں آتا یہ ایک مسلمان ملک ہے۔" شانزہ بہت پر افسوس انداز میں گردن نفی میں ہلاتی رہیں۔

''اب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ دونوں ادارے بہت اچھی طرح اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہمارا پروجیکٹ ہماری توقع سے زیادہ کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے۔ گاؤں کی وہی عورتیں جو پہلے مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ وہ اب صرف گھر سنبھالتی ہیں۔ اپنے بچوں کی مناسب تربیت کرتی ہیں اور جو وقت بچ جاتا ہے ادھر مدرسے یا پھر سلائی سینٹر میں آ جاتی ہیں۔ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔ ایک لڑکی کی تربیت کا اصل مفہوم ہی یہی ہے کہ وہ اپنے گھر' اپنے بچوں اور اپنے شوہر کے علاوہ دیگر ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے سر انجام دے لے اور ہمارے یہ دونوں ادارے ان عورتوں اور لڑکیوں کے اندر یہ شخصی آزادی بلکہ اپنی

ذمے داریوں کا شعور بخشنے کا کام بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ جن عورتوں کو یہاں سینٹر میں آنے کی اجازت نہیں۔ وہ کام گھر لے جاتی ہیں اس سے ایک تو یہ فائدہ ہوا ہے کہ ان عورتوں کے ہاتھ ہنر آگیا ہے دوسرا یہ عورتیں بہت سی معاشرتی واخلاقی.برائیوں جن میں غیبت، چغلی، فحش گوئی، نفس پرستی اور بہتان بازی سر فہرست میں کافی حد تک ان سے بچ گئی ہیں۔ ان.برائیوں سے ہی.بڑی.برائیاں جنم لیتی ہیں۔ جب عورتوں کو ان.برائیوں کے انجام کا شعور آگیا ہے تو وہ ”خود بخود ہر ایسے کام سے اجتناب.برتتی ہیں۔

یہ سب بتا کر شانزہ نے مشعال کی محویت کا جائزہ لیا اور پھر مسکرا دیں۔

وہ کہتے ہیں نا دیئے سے دیا جلتا ہے۔ بس پہلا قدم اٹھانے کی دیر ہے منزل تو آ ہی جاتی ’ ’ ”ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عزت کے ساتھ ساتھ ایک.بہت.بڑی کامیابی سے بھی نوازا۔

مشعال جو بہت غور سے لفظ بہ لفظ اپنے اندر اتار رہی تھی۔ اسے اپنے اندر پلنے والے بہت سے سوالوں کا جواب مل گیا۔ بہت سے غیر حل شدہ سوال حل ہو گئے۔ نامکمل اقتباسات مکمل ہو گئے۔ زندگی کا اصل مفہوم پوری طرح کھل کر اس کے سامنے آگیا۔ جہاں دل کچھ مطمئن ہوا تو وہاں وہ اپنا موازنہ شانزہ سے کرنے لگی۔ یہ جان کر اسے دلی شرمندگی ہوئی کہ نہ اس کی سوچ شانزہ جیسی تھی اور نہ ہی اس کا کردار... وہ ساری زندگی دنیا کے پیچھے بھاگتی تھی اور شانزہ نے ساری زندگی ایک مقصد کی تلاش میں گزار دی یہاں تک وہ مزید اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کر رہی تھی۔

الحمدللہ ہم نے اللہ کی عنایت و برکت اس کی رضا اور اپنے ارادے کی سچائی عمل کی ’ ’ لگن و عزم اور یقین کی پختگی سے اپنے اس نیک مقصد کو پا لیا اور انشاء اللہ آگے بھی بہت کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد درکار ہے جب تک وہ وحدہ لاشریک ہستی ہمارے ساتھ ہو گی تو ہمیں کسی بھی بات کا خوف نہیں۔ ہماری ہر مشکل، ہر مصیبت آسانی میں بدل جائے گی جس طرح اللہ کی فتح و نصرت سے ہر کام خود بخود اب تک سنورتا چلا گیا ہے آگے بھی یہی ہو گا۔” مشعال نے ایک گہری سانس لی۔ شانزہ بہت ہی پر عزم خاتون تھیں۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنے والی، تقدیر پر شاکر اور قوت ارادی کا استعمال کرنے والی حوصلہ مند عورت جس کا جیتا جاگتا ثبوت وہ سلائی سینٹر اور مدرسے کی صورت میں وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اس کی سوچ اور ارادوں میں ایک بہت.بڑی مثبت تبدیلی رونما ہوئی مگر ایک سوال اب بھی چبھ رہا تھا۔

ایک بات پوچھوں؟ آپ.برا تو نہیں مانیں گی؟” اس سارے عرصے میں اس نے پہلی ’ ’ دفعہ.براہِ راست اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت کی تھی۔

ہاں کیوں نہیں ضرور پوچھو۔” مسکراتے ہوئے حوصلہ مند اجازت ملی۔ ’ ’

شانزہ! آپ نے شاہ زر کے ساتھ اتنا سارا وقت گزارا ہے۔ اسے آپ نے کیسا پایا ’ ’ ہے؟ میرا مطلب وہ کیسا انسان ہے؟” کچھ الجھتے کچھ جھجکتے آخر کار اس نے سوال کر ہی دیا تھا۔ شانزہ کچھ لمحے اس کی جھکی جھکی کانپتی آنکھوں پر سایہ فگن پلکوں کی معصوم لرزش دیکھتی رہی۔

جب اس نے تھوڑے توقف سے پلکیں اٹھائیں تو اس نے اس کی کالی سیاہ گہری آنکھوں میں جھانکا وہاں اسے سوائے چند لرزتے وسوسوں واندیشوں کے کچھ خاص دکھائی نہ دیا۔

" میرے ساتھ اس کا جتنا بھی وقت گزرا ہے وہ ایک اچھے انسان، ہمدرد کلاس فیلو کی طرح گزرا ہے۔ اس کی شخصیت پراسرار سی ہے۔ پرکشش پرسنالٹی رکھنے کے باوجود بعض اوقات اس کے اندر مجھے ایک بہت بڑی کمی دکھائی دینے لگتی ہے۔ شاید تم بھی اس ایک کمی کی بابت پوچھ رہی ہو۔" اچانک اس نے مشعال کو دیکھا تو وہ چپ رہی۔ وہ پھر جواب دینے لگیں۔

" شاہ زر یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران بہت ہی زیادہ ریزرو رہتا تھا۔ حلقہ احباب بہت وسیع ہونے کے باوجود ہر ایک سے بے تکلف نہیں ہو جایا کرتا تھا خاص طور پر لڑکیوں سے تو سخت خار کھاتا تھا۔ اپنے شعبے میں وہ اس حد تک مشہور تھا کہ بہت سی لڑکیاں اس کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ دینے کو تیار تھیں مگر وہ کسی کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ لڑکیوں میں وہ بہت مغرور اور دولت پرست مشہور تھا۔

ایک لڑکی تھی عقیلہ اس بے چاری نے شاہ زر کے لیے گولیاں تک کھالیں۔ وہ تو بھلا ہو اس کے والدین کا کہ ان کے علم میں سارا واقعہ آگیا اور انہوں نے اپنی بیٹی کی خاطر شاہ زر سے رابطہ کیا۔ کتنی دفعہ وہ لوگ حویلی بھی آئے تھے مگر شاہ زر کے ساتھ ساتھ باقی لوگوں نے بھی اس رشتے سے انکار کر دیا۔ اس لڑکی کی دیوانگی اور شاہ زر کی بے توجہی وانکار پر میں بہت حیران ہوئی تھی۔ مشعال وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ امیر، تعلیم یافتہ، مہذب، شائستہ اخلاق واطوار کی مالک۔

گفتگو میں ایک خاص سلیقہ اور رکھ رکھاؤ تھا مگر شاہ زر نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

میں نے ایک دفعہ اس انکار کی بابت دریافت کیا تو اس نے تمہارا نام لیا تھا۔ اس وقت میں حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔ حیران اس لیے کہ وہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جسے اس نے صرف بچپن میں دیکھا تھا جو برطانیہ میں ہی جوان ہوئی ہے جس کے اخلاق وسیرت و کردار کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ اس کے ساتھ چل بھی سکے گی یا نہیں اور میں خوش اس لیے ہوئی کہ عموماً آج کل کے لڑکے والدین اور بزرگوں کے فیصلوں کو اہمیت دینے کی بجائے اپنی پسند و ناپسند کو ترجیح دیتے ہیں۔ چاہے اس کے لیے انہیں برسوں پرانے تعلقات سے ہاتھ دھونا پڑیں وہ دریغ نہیں کرتے اور شاہ زر تم سے صرف اس لیے شادی کرنا چاہتا تھا کہ تم سے اس کا رشتہ بزرگوں نے طے کیا ہے۔" وہ ایک لمحہ رکیں پھر بغور مشعال کے چہرے کو دیکھا۔ "یہ اس وقت کا میرا خیال تھا مگر اب جب میں نے تمہیں دیکھا تو احساس ہوا تم دونوں واقعی ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے ہو۔ جیسی شاہ زر لڑکی چاہتا تھا تم ویسی ہی ہو۔"

'نہیں... میں ویسی نہیں ہوں۔ میں اس کے آئیڈیل سے بہت دور ہوں۔ بالکل بھی نہیں میچ کھاتی ہوں۔ ہم دونوں کے مزاجوں میں' شخصیت میں' اخلاق و کردار میں حتیٰ کہ سوچنے کے اسٹائل میں بھی ایک فرق ہے بلکہ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ تو شانزہ آپ کی

باتیں سن سن کر میں کافی بدل گئی ہوں ورنہ تو میں بالکل ہی ایسی نہیں تھی۔" اس نے پرزور تردید کی تو وہ کھل کر مسکرائیں۔

"ہو سکتا ہے یہ بھی۔ چلو تمہیں میں ایک مزے کی بات بتائوں۔

شانزہ کے پوچھنے پر وہ پوری جان سے متوجہ ہو گئی۔

میں بھی شاہ زر سے بہت متاثر ہوں اوروں کی طرح میں بھی اس کی بہت عزت کرتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک اچھی خوب صورت متاثر کن شخصیت کا مالک ہے اس لیے کہ وہ عام مردوں سے ہٹ کر ہے۔ وہ آج تک خود سے کسی بھی لڑکی سے متاثر نہیں ہوا سوائے میرے۔ وہ بھی صرف یہاں کام کرنے کی وجہ سے۔ اس سے میرا ملنا جلنا ہمیشہ پردے میں ہی ہوا ہے اور اب بھی جب ملتا ہے تو میں پردے کی حالت میں ہی ہوتی ہوں۔ اس نے آج تک میری شکل نہیں دیکھی مگر اس کے باوجود ہم دونوں بہت اچھی طرح بات چیت کرتے ہیں۔"

نجانے کیسے موضوع خود بخود شاہ زر کی شخصیت پر آکر جم سا گیا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

جب میں اس علاقے میں آئی تھی تو اس دوران میری شادی ہو چکی تھی۔ میرے شوہر اور شاہ زر دونوں یونیورسٹی فیلوز تھے۔ میرے والد شاہ زر کی بہت عزت کرتے ہیں۔ شاہ زر کے ذریعے ہی یحییٰ (شانزہ کا شوہر) کے والدین میرا رشتہ لے کر آئے تھے پھر میری شادی ہو گئی اور میرے شوہر آرمی میں چلے گئے۔ وہ آج کل میجر ہیں۔ میں اپنی ساس، اور سسر کے ہمراہ

یہاں رہتی ہوں۔ اب تو ماشاء اللہ میرے دو بیٹے ہیں۔ شوہر ہر ماہ یہاں آتے رہتے ہیں۔ ایک بہت ہی کامیاب' پرسکون خوشحال ازدواجی زندگی گزار رہی ہوں۔ میرے سسرالیوں نے کبھی بھی میرے اس سوشل کام پر اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ تو ہر ممکن طریقے سے میری مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

وہ بہت ہی مطمئن انداز میں بتا رہی تھی۔ وہ ایک اچھی سامع بنی سنتی رہی۔ وہ کچھ باتونی تھیں مگر ان سے باتیں کرنے یا سننے سے بندہ بالکل بور نہیں ہوتا تھا۔ وہ کافی دیر تک ان کے ساتھ وقت گزار کر حویلی چلی آئی۔ اسے شانزہ کے ساتھ وقت گزار کر بہت اچھا لگا۔ باقی سارا دن وہ بہت خوش رہی تھی۔

[...خ...]

دن اپنی رفتار سے گزر رہے تھے۔ ان ہی گزرے دنوں میں ایک دن جب وہ مدرسے سے واپس لوٹی تو بہت ہی زبردست حیران کن خبر سننے کو ملی تھی۔ کافی دیر تک تو وہ خود اس خبر کے زیر اثر رہی۔ جب یقین ہوا کہ وہ خبر واقعی سچی ہے تو مشعال شگفتہ بھابی کے کمرے میں آ گئی۔ بہت عرصے بعد وہ ان کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

' ' ابیشا نے مجھے جو بات بتائی ہے کیا وہ واقعی سچ ہے؟" ان کے پاس بیٹھتے اس نے پوچھا تو وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ "ابیشا بتا رہی تھی کہ ملکوں کی حویلی سے ان کی عورتیں ملک ایاز کے بیٹے ملک صہیب کا رشتہ نشاء کے لیے لے کر آئی ہیں۔" بتاتے بتاتے اسے اچانک

وہ خوبرو سا نوجوان یاد آگیا جسے اس نے اپنی شادی سے پہلے زرینہ کے گھر سے واپسی پر گاڑی میں بیٹھے دیکھا تھا۔

ہاں... مگر بڑی امی نے انکار کر دیا۔ پہلے بھی تو ایسا ہوا تھا۔ پہلے بھی تو ایک رشتہ آیا تھا ’ ’ اور پھر دشمنی کا آغاز ہوا تھا اور اب پھر وہی ہونے جا رہا ہے۔ مجھے تو مشعال بہت ڈر لگ رہا ہے۔ خدا جانے اس دفعہ نجانے کیا ہو؟“ بھابی ایک دم پریشان و متفکر بتانے لگیں۔ اسے انکار کا سن کر بہت حیرت ہوئی۔

‘ ‘ کون عورتیں یہ رشتہ لے کر آئی تھیں؟ ’ ’

“ملک ایاز اور ملک جبار کی بیویاں۔ ’ ’

اوہ... تو انہوں نے رشتہ لانے کی اصل وجہ نہیں بتائی؟“ اس نے دوسرا سوال کیا تو ’ ’ بھابی کچھ الجھتے اسے دیکھنے لگیں۔

نہیں... بڑی امی نے انہیں وجہ بتانے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ پھر وجہ ہو بھی کیا ’ ’ سکتی ہے سوائے پرانی دشمنی کے؟ اب وہ پھر اپنے پاؤں پر جم گئے ہیں تو سوچ لیا ہو گا کہ پرانی دشمنی کا بدلہ چکا لیا جائے۔ ابھی تو صرف کمال چچا کو علم ہوا ہے۔ آذر اور شاہ زر کو بالکل علم نہیں۔ جیسے ہی ان عورتوں نے نشا کا نام لیا۔ بڑی امی نے فوراً انکار کر دیا۔ وہ ہماری حویلی میں خود چل کر آئیں اور ہم نے انہیں عزت دی۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم فوراً رشتہ کر لیتے پھر یہ بات چھپائی بھی نہیں جا سکتی ظاہر ہے شام تک آذر کو بھی علم ہو جائے گا۔ خدا خیر کرے

مجھے تو مشعال بہت ڈر لگ رہا ہے۔ نجانے کیا...'' بھابی واقعی از حد فکر مند تھیں۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے دل و دماغ میں جو ایک راز تھا اگر وہ بھابی کو بتا دیتی تو شاہو کی اس حویلی میں قیامت کا آجانا لازمی تھا۔ اس نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔

چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ خاموشی سے اس درپیش مسئلے کا حل سوچنے لگی۔ عشاء نشاء اور اسامہ تینوں بہن بھائی آج کل کراچی میں اپنے ماموں کے ہاں رہ رہے تھے۔ نشاء نے وہاں ڈاؤ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیا ہوا تھا۔ عشاء اور اسامہ بھی وہیں پڑھ رہے تھے جب کہ شاہ میر اپنا آخری سال بھی ختم ہو جانے کے بعد گاؤں واپس آگیا تھا۔ آج کل اس کا سارا وقت آذر بھیا کے ساتھ ہی گزر رہا تھا۔ آگے اس کا اپنا بزنس اسٹارٹ کرنے کا ارادہ تھا مگر اس سے پہلے وہ کسی کمپنی میں جاب کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنا کاروبار شروع کرنے سے پہلے کچھ تجربہ حاصل ہو جائے اس سلسلے میں اس نے کئی جگہوں پر اپلائی بھی کیا ہوا تھا۔

انٹرویوز بھی دے چکا تھا اور آج کل صرف کال لیٹر کا منتظر تھا۔

گاؤں میں سردی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پھر رمضان کا مہینہ بھی شروع ہونے والا تھا۔ نشاء اور صہیب کے رشتے والا معاملہ فی الحال درمیان میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ بھابی کے خوف وڈر کے برعکس حویلی میں قیامت تو کوئی نہیں آئی تھی۔ البتہ ملکوں کے اس پرپوزل نے شاہوں کے خاندان میں ہل چل ضرور مچادی تھی۔ دوسری طرف شاہ زر کو بھی اس رشتہ کے متعلق علم ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی امی کو فون کر کے رشتہ کرنے سے فوراً منع کر دیا تھا جب کہ اس

دن کے بعد ملکوں کی عورتیں دو دفعہ مزید آچکی تھیں۔ مشعال اس رشتے کے حق میں تھی۔ اسے صہیب اور نشا کی جوڑی اچھی لگی تھی۔ ابھی تو اس نے اپنے دل کی بات کسی سے بھی نہیں کی تھی مگر اس دن کچھ سوچتے ہوئے وہ علیشہ کے پاس لان میں آکر بیٹھ گئی۔ اس نے مسکرا کر اسے ویلکم کہا۔

تمہارا ملک صہیب اور نشا کے رشتے کے متعلق کیا خیال ہے؟" چند ادھر ادھر کی ’ ’ باتوں کے بعد وہ اپنے مطلب پر آگئی۔

میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ مجھ سے کیا پوچھتی ہیں... یہاں وہی ہو گا جو اس حویلی کے ’ ’ بڑے چاہیں گے۔" مشعال نے غور سے دیکھا علیشہ کے انداز میں ایک واضح تلخی اور سرد مہری تھی۔ اسے دل و دماغ کی بات پر کچھ کچھ یقین ہونے لگا۔

چاہے اس حویلی کے بڑے تم لوگوں کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ فیصلے کر جائیں۔ ’ ’ پھر بھی تم لوگ اعتراض نہیں کرو گی؟" مشعال کا انداز کچھ اگلوانے والا تھا۔ وہ کچھ الجھ کر مشعال کو دیکھنے لگی پھر تلخی سے ہنس دی۔

مشعال! جب آپ کی شاہ بھائی سے شادی ہو رہی تھی تو ہمیں لگتا تھا کہ آپ غلط ہیں۔ ’ ’ اس حویلی کے فیصلے اور باقی سب صحیح ہیں مگر مشعال! ضروری تو نہیں اس حویلی کی لڑکیاں بے زبان گائے بنی رہیں۔ آپ نے احتجاج کیا تو اس وقت سب کی دیکھا دیکھی مجھے بھی بہت برا لگا تھا مگر اب مجھے لگتا ہے آپ نے صحیح اعتراض کیا تھا۔ ہماری سوچ ہمارے رویے غلط ہیں۔ ہم

ماضی کو دیکھ رہے ہیں۔ پرانی سوچوں وروایتوں کے قیدی ہیں ہم۔ یہ ذات. برادریاں یہ حسب ونسب کے اعتراضات کیا ہیں؟ جب نبی اکرم ﷺ نے فرمادیا کہ کسی گورے کو کالے پر اور کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے تو ہم کیا ہم اپنے نفس کی پیور یفیکیشن نہیں کر سکتے؟ کیا یہ سب کچھ ختم نہیں ہو سکتا؟ پہلے اسی حسب ونسب کی بناء پر چھڑی جانے والی جنگ نے ہم سے ہمارا باپ چھین لیا۔ دو مظلوم عورتیں انتقام وضد کی بھینٹ چڑھ گئی۔ آپ نے دیکھا شاہ بھیا کی شخصیت کیسے تباہ ہو گئی ہے اور اب ہم سے ہماری بہن کی خواہشیں' خواب چھین لیے جارہے ہیں۔" اس نے اصل بات اگل دی تھی۔ مشعال ایک دم مطمئن ہو گئی۔ علیشہ سب کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر کے پھر خود ہی چپ ہو گئی اور پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ مسکرانے لگی۔ یہ مسکراہٹ بھی حوصلہ دینے والی تھی۔ علیشہ نے نظریں جھکالیں۔

جب میں اپنی شادی کے بعد زرینہ کے گھر گئی تھی۔ واپسی پر کھیتوں کی جانب سے ' ' آتے ہوئے وہاں میں نے صہیب کے ساتھ نشاء کو دیکھا تو مجھے بہت حیرانگی ہوئی۔ شاہوں کی کوئی لڑکی ملکوں کے کسی لڑکے کے ساتھ کھڑی پائی جائے یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ میں اسے اپنا وہم قرار دیتی رہی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا مگر یہ سچ تھا۔ شاہوں کی لڑکی ملکوں کے لڑکے کے ساتھ کھڑی تھی۔ نشاء کا آدھے سے زیادہ چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اسی لیے میں نے اسے اپنی نظر کا دھوکہ قرار دیا۔ بعد میں میں بھی اپنی سوچ پر الجھی رہی تھی کہ یہ کیسے

ہو سکتا ہے؟ کافی دفعہ جی چاہا کہ تم سے یا نشاء سے بات کروں مگر اس وقت تو میں خود سے بھی ناراض تھی، تم لوگوں سے بات ہی نہ کر سکی۔ پھر جب ابیشا نے ملک صہیب کے رشتے کے متعلق بتایا تو مجھے اس دن کا پورا واقعہ یاد آگیا۔ اسی لیے میں نے سوچا تم سے بات کروں۔ شاید تم جانتی ہو۔"

نشا نے ایف۔ ایس۔ سی لاہور شاہ بھائی کے پاس رہ کر ہی کیا ہے۔ وہاں وہ جس کالج میں پڑھتی تھی اسی میں ملک صہیب کی بہن بھی پڑھتی تھی۔ اس سے نشاء کی دوستی ہو گئی اور پھر وہ کئی دفعہ شاہ بھائی کے علم میں لائے بغیر ان کے گھر بھی گئی تھی۔ وہیں ملک صہیب نے اسے دیکھا اور پسند کیا۔ بعد میں وہ لوگ مستقل گاؤں شفٹ ہو گئے۔ میرے علم میں یہ بات بالکل نہیں تھی۔ اب جو بڑی امی نے اس رشتے سے انکار کیا ہے تو اسی رات کو فون پر میری نشاء سے بات ہوئی تھی۔ اسی نے مجھے یہ ساری بات بتائی۔ ملک صہیب نے نشاء کی مرضی سے یہ رشتہ بھیجا ہے۔ اس میں نشاء کی مرضی اور پسند شامل ہے۔ انکار سن کر وہ بہت رو رہی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے مشعال اگر اس کا رشتہ ملک صہیب سے نہ ہوا تو وہ ضرور کچھ کر گزرے گی کیونکہ شاہ بھائی دونوں کی ملاقاتوں اور پسند سے باخبر ہیں۔ اسی لیے تو انہوں نے نشاء کا داخلہ لاہور کی بجائے کراچی کروا دیا تھا مگر میں اپنی بہن کے ساتھ آپ جیسی زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ ہمارا باپ مر ا ضرور ہے مگر ہماری ماں تو زندہ ہے۔" وہ رونے لگی تھی۔ مشعال کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

رومت اور پریشان بھی مت ہونا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب جو برسوں بعد وہی پرانی بات شروع ہوئی ہے تو اللہ ضرور کچھ بہتر ہی کرے گا۔” مشعال نے اسے تسلی دی تو وہ دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کرتے اسے دیکھنے لگی۔

آپ مشعال! کتنی بدل گئی ہیں؟” اس کی حیرت پر وہ مسکرا دی۔ ”مشعال! اگر آپ شاہ ” بھائی سے بات کریں تو وہ یقینا ضرور مان جائیں گے۔

تم سب میرے اور شاہ زر کے تعلقات کے متعلق اچھی طرح جانتے ہو پھر بھی کہہ رہی ہو۔” بہت سنجیدگی سے اس نے علیشہ کو دیکھا تو وہ پہلے گڑبڑائی پھر گردن نفی میں ہلانے لگی۔

آپ پہلے سے بہت بدل گئی ہیں۔ اس لیے اور تو اور شاہ بھائی بھی پہلے جیسے نہیں رہے۔ اکثر فون کر کے آپ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ آپ تو فون ریسیو نہیں کرتیں مگر آپ کی ماما پاپا اور ابیشا سے ہفتے میں ایک دفعہ بات ضرور ہوتی ہے۔” وہ یہ سب جانتی تھی اس لیے چپ بیٹھی رہی۔

میں نے رات اپنی امی سے بھی نشاء کے متعلق بات کی ہے۔ ساری بات سن کر وہ کچھ کچھ رضامند دکھائی دے رہی ہیں۔ فی الحال انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے صرف اندازہ لگایا ہے اور آذر بھائی وہی کریں گے جس میں سب حویلی والوں کی خوشی ہو گی۔ وہ کبھی بھی اپنے فیصلے زبردستی کسی پر نہیں ٹھونستے۔ بڑی امی وہی جواب دیں گی جو شاہ زر بھائی چاہیں

گے۔ اگر حسب نسب سے ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ بات ساری پرانی دشمنی اور غیرت کی ہے۔ پھر یہ شاہ بھائی کے ننھیال کا معاملہ ہے اگر وہ مان گئے تو پھر سارا معاملہ ہی حل ہو جائے گا اور میرا خیال ہے کہ ان کو صرف آپ ہی منا سکتی ہیں۔ کسی اور میں اتنی جرأت وہمت اور مجال نہیں کہ وہ ان کے سامنے کھڑا ہو اور ملکوں کے متعلق کسی بھی قسم کی کوئی بات کرے۔ اگر کبھی کسی نے یہ جرأت کر بھی لی تو وہ مرنے مارنے پر تل جائیں گے اور مشعال پلیز! یہ ہماری عزت کا معاملہ ہے اگر ہم چپ چاپ بیٹھے رہے تو نشاء کچھ انوکھا کر دکھائے گی۔ آپ کو نہیں علم وہ کتنی جذباتی ہو رہی ہے اور مجھے خود بہت ڈر لگ رہا ہے۔ جہاں تک ملک صہیب کی بات ہے میں خود بھی اس سے ایک دفعہ مل چکی ہوں۔ چند دن پہلے ہی کھیتوں کی طرف جاتے راستے میں میری اس سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ اس نے روک لیا تو بات بھی کرنا پڑی۔ وہ بہت سلجھا ہوا ہے۔ اپنے بڑوں سے کچھ مختلف ہے۔ نشاء عام طور پر کسی بھی مرد پر بھروسہ نہیں کرتی۔ پھر ملک صہیب واقعی ایک جاذبِ نظر اور پرکشش شخصیت والا نوجوان ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ نشاء کی خواہش ہے اور میں نے نشاء سے وعدہ کیا ”ہے کہ میں امی جان اور بڑی امی کو منالوں گی اور پلیز آپ میری مدد کریں۔

فکر کیوں کرتی ہو؟ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو انشاءاللہ سب ٹھیک ہو گا۔ اگر اللہ نے ’ ’ یوں ہی لکھا ہے تو شاہ زر بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ تم نشاء کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ جذباتی ہونے سے بعض اوقات فیصلے غلط ہو جاتے ہیں۔ بعض غلطیاں ایسی سنگین ہوتی ہیں کہ ساری

عمر انسان کو پچھتانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ نشاء حوصلے ہمت اور عقل مندی سے کام لے۔ میں شاہ زر سے بات کروں گی۔ اسے قائل کرنے کی کوشش کروں گی۔ تم فکر نہیں کرو۔"

مشعال اس کا ہاتھ تھامے تھپتھپاتے اسے مطمئن کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے وہ کافی پر سکون بھی ہو گئی۔

میں مدرسے جا رہی ہوں تم ساتھ چلو گی؟" اچانک اسے خیال آیا تو پوچھتی کھڑی ہو ' ' گئی۔ علیشہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

آپ چلی جائیں۔ میرا آج بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔ وہاں بھی جا کر یکسوئی سے کچھ ' ' "نہیں کر پاؤں گی۔ دل و دماغ بہت الجھے ہوئے ہیں۔

علیشہ ! تم پر سکون ہو جاؤ۔ میں چلی جاؤں گی تم بڑی امی کو بتا دینا ' '

بڑی سی چادر اپنے ارد گرد لپیٹے وہ جانے کو تیار تھی۔ علیشہ نے اسے بغور دیکھا وہ کتنا بدل گئی تھی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہی۔

خورشیدہ کو ساتھ لے جائیں۔ آج بھابی نہیں جا رہی ہیں۔ امی جان بھی مصروف ہیں ' ' اور ابیشا بھی صبح کہہ رہی تھی کہ وہ آج نہیں جائے گی۔" علیشہ کی بات پر سر ہلاتے اندر خورشیدہ کو بلانے جانے لگی تو باہر سے آتے شاہ میر آتا دکھائی دیا۔ وہ اندر جانے کی بجائے اس کی طرف آ گئی۔

کہیں جا رہی ہیں آپ؟’’ شاہ میر نے اسے بڑی سی چادر اپنے گرد لپیٹے دیکھ کر پوچھا۔ ’ ’

ہاں مدرسے جا رہی ہوں۔ آج شانزہ نے بطور خاص بلوایا تھا۔ تم فارغ ہو تو میرے ’ ’ ساتھ چلو بلکہ چھوڑ آؤ۔’’

مشعال کا ارادہ شاہ میر سے ملکوں کے خیالات جاننے کا تھا۔ اسی لیے اسے کہا اور وہ فوراً مان بھی گیا۔ راستے میں وہ اس سے شاہ زر. بڑی امی اور ملکوں کے متعلق باتیں کرتی رہی۔

[...خ...]

دو بجے کے قریب وہ مدرسے سے واپس لوٹ رہی تھی جب عقب سے آتی گاڑی اچانک اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ وہ ایک طرف کھڑی گاڑی سے. برآمد ہونے والی شخصیت کو دیکھے گئی۔ وہ ملک ایاز کا بیٹا ملک صہیب تھا۔

السلام علیکم!’’ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے سامنے آگیا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ ’ ’

اس بھری دوپہر میں وہ تنہا سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ ارد گرد کوئی انسان بھی نہیں تھا۔

اسے ملک صہیب کا یوں اپنا راستہ روکنا خاصا معیوب لگا۔

’’وعلیکم السلام۔ ’ ’

آپ مشعال ہیں شاہ بھائی کی بیوی؟’’ وہ پوچھ رہا تھا جب کہ وہ اس کے پہچان لینے پر ’ ’ از حد حیران کھڑی تھی۔

جی... مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ وہ یوں سرِ راہ روکنے کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ ’ ’

میں ملک ایاز کا بڑا بیٹا ملک صہیب ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ’ ’

”میں جانتی ہوں مگر یوں روکنے کی وجہ...؟ ’ ’

آپ تو جانتی ہوں گی کہ برسوں بعد ایک دفعہ پھر ملکوں کی طرف سے شاہوں کی لڑکی ’ ’ کے لیے رشتہ بھیجا گیا ہے مگر پہلے کی طرح اس بار پھر انکار ہو گیا ہے۔ آپ شاہ بھائی کی بیگم ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں اس بار ہم بہت خلوص اور چاہ سے یہ رشتہ مانگ رہے ہیں۔ آپ شاید یہ نہیں جانتیں۔ میں نشاء کو پسند کرتا ہوں اور نشاء بھی۔ اس کی مرضی سے یہ رشتہ بھیجا گیا تھا مگر... آپ لوگ نہ مانیں لیکن یہ سچ ہے کہ شاہ بھائی کی نسبت ہمارا آپ کے خاندان سے ایک گہرا تعلق ہے۔ ہم شاہ بھائی کی بہت عزت کرتے ہیں۔ دشمنی اور مخالفت وغیرہ بھول بھال کر ایک دفعہ پھر دوستی اور رشتہ داری کرنا چاہتے ہیں۔ برسوں کی سلگائی گئی نفرت کی آگ میں ختم کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری اور نشاء کی ضرور مدد کریں گی۔“ وہ بہت یقین سے کہہ رہا تھا۔

آپ کو ایک بات کلیئر کر دوں ملک صہیب صاحب! اور آپ شاید یہ بات بھول بھی ’ ’ رہے ہیں کہ آپ نے شاہوں سے وہ چیز مانگی ہے جو شروع سے ہی اس دشمنی و مخالفت کی اصل وجہ بنی ہے جو ان کے لیے عزت وانا اور غیرت کا مسئلہ ہے جس کے لیے وہ خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔“ وہ ایک لمحہ کو رک گئی۔ ”اور کیا پتا اس پہل میں بھی آپ کی کوئی

غرض پوشیدہ ہو۔ پرانی دشمنی کی چھپی کوئی چنگاری اور پھر آپ نے یہ کیسے تصور کر لیا کہ میں اپنے خاندان کی مخالفت میں آپ کی مدد کروں گی؟ آپ لوگوں کا ساتھ دوں گی؟ ملک صہیب میں وہ دن آج تک نہیں بھولی جب شیطانی منصوبہ تشکیل دیا گیا تھا۔ وہ شخص آپ کا ہی والد تھا جس نے مجھے اغواء کروانے کی کوشش کی تھی مگر وہ تمہارا ہی کزن تھا تمہارا پھوپی زاد جس کی وجہ سے میں آج زندہ ہوں بلکہ میری وجہ سے وہی شخص مارا گیا آج جس کی بیٹی سے آپ رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں اور اب. برسوں بعد شاہوں کو یہ بات کیسے گوارا ہو گی کہ وہ اپنی عزت کو نیلام کرنے والوں کے ہاتھ اپنی عزت سونپ دیں جو ہمیشہ سے ان کے لیے غیرت وانا کا باعث رہی ہے۔ نہیں... آئم سوری... ملک صہیب! شاہ زر کو سمجھانا میرے بس میں نہیں۔ میری مانیے تو آپ ہماری حویلی کا دوبارہ رخ کرنے کا سوچیے گا بھی نہیں۔ ابھی تک یہاں کے مکینوں کا خون غیرت کے نام پر جوش مارنے کو بے تاب رہتا ہے۔" ملک صہیب کی آنکھوں کی سچائی اور لہجے کا یقین اس نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ اسے کوئی تسلی بخش جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تلخی سے کہہ کر آگے نکلنا چاہا تو اس نے فوراً آگے. بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔ مشعال نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

'' آپ نے جو بھی کہا سچ ہے مگر یہ بھی سچ ہے اس بار ہمارے خلوص میں کوئی کھوٹ نہیں۔ ماضی میں جو کچھ بھی ہوا یا جو بھی کیا گیا وہ میرے. بڑوں کی غلطیاں تھیں اب میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ پہلے جب رشتہ مانگا گیا تھا تو غرور و طنطنے اور دولت کے نشے میں

ڈوب کر مانگا گیا تھا اسی لیے انکار پر ضد پر اتر آئے تھے۔ اس دقعہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ اب وہ حالات نہیں رہے۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ میں بہت عزت و احترام سے یہ رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے یہ ذات برادریوں کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جب ملکوں کی بیٹی شاہوں کے خاندان میں بیاہی جا سکتی ہے تو پھر اب کیوں نہیں یہ ہو سکتا جب کہ اب تو نہ صرف حالات بدلے ہیں بلکہ ذہن اور سوچ بھی بدل گئی ہے۔"

'' پلیز ملک صہیب ! میں اس خاندان کی کرتا دھرتا نہیں ہوں۔ جو بھی فیصلے ہوتے ہیں وہ اس خاندان کے بڑے اور مرد کرتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں۔ میرے علاوہ باقی سب لڑکیاں ان فیصلوں کو اہمیت دیتی ہیں اور جہاں وہ کھڑی کرنا چاہیں وہیں کھڑی رہتی ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے زمانہ بدلا ہے مگر وقت کی چال تو ویسی ہے۔ ذہنوں میں تبدیلیاں ضرور آئی ہیں۔ سوچیں بھی بدلی ہیں مگر میں کیا کر سکتی ہوں؟ اگر نشاء آپ کو پسند کرنے کی حماقت کر ہی چکی ہے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر پائے گی۔ شاہ زر بھی آپ دونوں کے بارے میں بخوبی جانتا ہے۔ میرا تو آپ کو یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ فی الحال اس بات کو ذہن سے نکال دیں۔ پھر آپ کو اچھی طرح علم ہو گا کہ نشا کراچی میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ کم از کم چار پانچ سال تو فارغ ہونے میں لگ ہی جائیں گے۔"

علیشہ سے ساری حقیقت جان کر اس نے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا اسی لیے وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے صہیب کے جذبوں کی سچائی اور ان کی گہرائی کا اچھی طرف اندازہ لگا لینا

چاہتی تھی۔ یہ تو وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ وہ جو کچھ بھی زبان سے کہہ رہا ہے وہی اس کے دل میں بھی ہے۔

‘‘جو بھی ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر شاہ زر بھائی مان گئے تو سب مان جائیں گے اور وہ اسی صورت ہی مان سکتے ہیں اگر آپ ہمارا ساتھ دیں۔ میں شاہ میر‘ علیشہ‘ آپ کی چچی زینب سے بھی بات کر چکا ہوں۔ ان کے نزدیک برداریاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ میرے اس رشتے پر وہ نیم رضامند ہیں۔ صرف آذر بھائی رہ گئے ہیں۔ اگر شاہ زر بھائی مان گئے تو وہ کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ یہ آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں نے ان کو منانے کی اپنی سی کوشش کر لی ہے۔ اپنی امی اور چچی کو لے کر آپ کے گھر لاہور بھی جا چکا ہوں مگر وہ نہیں مان رہے۔ وہ ہماری کوئی بات سننے پر بھی راضی نہیں ہوتے صرف اب آپ ایک واحد امید ہیں۔ اگر آپ کوشش کریں تو یقیناً یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے صرف آپ ہی ان کے سامنے اسٹینڈ لے سکتی ہیں پلیز ضرور سوچئے گا میری خاطر نہیں تو نشاء کی خاطر... پلیز...‘‘ وہ ملتجائیہ انداز میں کہتا اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ روبرو اس سے اس کی پہلی ملاقات تھی مگر وہ یوں مخاطب تھا جیسے مشعال اسے برسوں سے جانتی ہو۔ وہ ہاتھ ہلاتا گاڑی بڑھا لے گیا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ اس نئی افتاد کے بارے میں سوچتی الجھتی رہی۔

حویلی آ کر بھی وہ کافی دیر تک پریشان رہی تھی۔ اسے صہیب ایک اچھا انسان لگا تھا۔

اگر انسان نیک جذبات اور پر خلوص لگن سے کوشش کرے تو اسے منزل مل ہی جاتی ہے۔" شانزہ کی کہی بات اسے ازبر تھی۔

☆...☆...☆...☆...☆...☆...☆

پھر اس نے اپنے تئیں سب سے باری باری بات کر کے دیکھ لی تھی۔ شاہ میر' علیشہ' چچی زینب کے فیصلوں سے وہ باخبر تھی۔ بھابی کسی بھی جانب نہیں تھیں۔ ماما پاپا اور ایشا نے بھی اس معاملے میں چپ سادھ رکھی تھی۔ اگر وہ راضی نہیں تھے تو انہیں انکار بھی نہیں تھا جب کہ آذر بھیا' بڑی امی اور شاہ زر ایک طرف تھے وہ ہنوز اپنے فیصلوں پر برقرار تھے۔ بڑی امی اور آذر بھیا پرانی دشمنی کی بابت انکار کر رہے تھے اور شاہ زر ضد کی بنا پر اڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف اس کی کراچی نشاء سے فون پر بات ہوئی تو وہ کافی پریشان تھی۔ اس ساری صورت حال پر رو بھی رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر وہ بھی اندر تلک متفکر ہو گئی۔ ہر طرف سے ناامید ہو کر اسے شانزہ کا سہارا لینا پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ شانزہ شاہ زر کو ضرور قائل کرے گی مگر اوروں کی طرح اسے بھی منہ کی کھانی پڑی۔

لو بھئی! میں نے بھی تمہاری خواہش پر شاہ زر سے بات کر کے دیکھ لی ہے۔ کئی بار سمجھانے کی بھی کوشش کی ہے مگر شاہ زر ہے کہ رضامند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔" وہ روٹین کے مطابق مدرسے آئی تھی کلاس ختم ہونے کے بعد اس نے جیسے ہی صہیب اور نشاء کا مسئلہ چھیڑا تو وہ مایوسی سے سر ہلانے لگیں۔

“اب کیا ہو گا...؟” وہ مایوسی سے سوچنے لگی۔

“آپ نہیں جانتیں شانزہ! یہ دونوں واقعی مخلص ہیں ایسے میں اگر ان دونوں کی یوں حوصلہ شکنی کی گئی تو یہ انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کریں گے۔

“تم خود بات کر کے دیکھو شاید شاہ زر تمہاری بات مان جائے۔ جہاں تک حویلی والوں کو راضی کرنے کا تعلق ہے تو وہ مجھ پر چھوڑ دو۔ وہ سب میری بات مانتے اور سمجھتے ہیں۔ میں انہیں راضی کر لوں گی۔ تم شاہ زر کو منانے کی کوشش کرو وہ صرف ضد کی بنا پر اپنی بات پر قائم ہے اگر مان گیا تو ٹھیک ورنہ... لڑکی اس کی ماں بلکہ سارے حویلی والے تقریباً نیم رضامند ہیں ہی تو لڑکے والوں کو ہاں کہہ دیں۔ میرا خیال ہے یہ اتنا بڑا ایشو نہیں کہ اس کے لیے سب پریشان ہوں۔ کاش اتنے پڑھے لکھے اور سمجھ دار شاہ زر کو اتنی عقل آ جائے تو وہ یہ نام نہاد ضد چھوڑ کر مان جائے۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا وہ غلط تھا، وہ ماضی کا حصہ تھا۔ اگر انسان ماضی کو یاد کر کے اپنے حال کو تباہ کرتے رہیں تو پھر گزار چکے ہم زندگی۔ یہ دشمنی کسی نہ کسی جگہ جا کر ختم تو ہونی ہے پھر آج کیوں نہیں جب کہ مخالف پارٹی آج خود یہی چاہتی ہے۔ میں ملک صہیب سے مل چکی ہوں۔ ان کی عورتیں بھی میرے پاس مدرسے آتی رہتی ہیں۔ بہت اچھی اور سلجھی ہوئی ہیں۔ اپنے مردوں کے برعکس بہت صلح جو ہیں تم پریشان نہیں ہو اللہ تعالیٰ پر سب چھوڑ دو انشاء اللہ وہ جو بھی کرے گا بہتر ہی کرے گا۔ میں تو شاہ زر کے حق میں دعا ہی کر

سکتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے اسے سمجھاتی رہیں۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ دونوں کے خیالات آپس میں کافی ملتے جلتے تھے۔ وہ بہت جلد شانزہ کے سمجھانے پر مطمئن ہو گئی۔

ة...٩...ة

دوپہر کو کھانا کھا کر وہ کمرے کی بجائے لاؤنج میں ہی صوفے پر لیٹ گئی۔ اس وقت لاؤنج کے دوسرے کونے میں سب ہی جمع تھے۔ علیشہ کی سسرال والے اس کی تاریخ لینے آرہے تھے۔ سب اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ نکاح رمضان میں ہو یا عید کے بعد کیونکہ رمضان شروع ہونے میں بھی دس دن باقی تھے۔ سب بڑھ چڑھ کر اس بحث میں حصہ لے رہے تھے۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے سونے کی ناکام کوشش کرتی سب کی باتیں سن رہی تھی۔ تب ہی صوفے کے قریب اسٹینڈ پر رکھے فون کی بیل بج اٹھی۔ مشعل نے آواز پر ناگواری سے اپنے کانوں پر کشن رکھ کر خود کو سویا ہوا ظاہر کیا۔ مسلسل بیل ہونے پر شاہ میر نے اٹھ کر خود فون اٹینڈ کیا تھا۔ دوسری طرف شاہ زر تھا۔ شاہ میر کی گفتگو سے اندازہ لگاتے ہی کشن ہٹا کر بغور اسے سننے اور دیکھنے لگی۔

"اچھا کب آرہے ہیں آپ؟ اچھا... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

ارے بھابی! جی ہاں وہ بھی یہیں ہیں۔ صوفے پر لیٹی ہوئی ہیں۔ بات کرائوں؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف وہ یقیناً اسی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ شاہ میر نے اسے اٹھ کر بیٹھتے دیکھ کر ریسیور تھما کر خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

السلام علیکم۔” ریسیور کان سے لگا کر کن اکھیوں سے شاہ میر کو بھی دیکھا جو اسے ہی ’ ’ دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے تعلقات سب کے سامنے تھے۔ اسی لیے سب اس سے شاہ زر کے متعلق کچھ بھی کہنے سے گریز کرتے تھے۔ اب جب سے اس نے خود کو بدلا تھا تب سے سب کے ذہنوں میں دونوں کے مستقبل کے متعلق خوش آئند خیالات آنے لگے تھے۔

و علیکم السلام! کیسی ہو مشعال؟” وہ بہت اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔ ’ ’

ٹھیک ہوں... کیوں فون کیا؟” بہت سنجیدگی سے اس کی اپنائیت کو نظرانداز کیے پوچھ ’ ’ رہی تھی۔

یہ پوچھنے کے لیے کہ تم نے ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا خیال ہے اب ’ ’ چچا جان بالکل ٹھیک ہو گئے۔ تمہیں ان کی طرف سے اب کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ پھر بھی تم اتنی دیر کر رہی ہو۔ جو بھی فیصلہ کیا ہے تم نے پلیز مجھے بتا دو۔ میں اتنے دنوں سے انتظار کر رہا ہوں۔ مگر تم نے اس سلسلے میں کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ آخر کیا چاہتی ہو تم؟” دوسری طرف وہ کچھ الجھتے ہوئے تلخی سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی تلخی محسوس کرنے لگی۔

”میں ابھی یہ سب نہیں چاہتی۔ ’ ’

کیوں...؟ چچا جان کی طرف سے تمہیں خطرہ تھا ان کی ہی وجہ سے تم نے مجھے کچھ ’ ’ عرصہ رکنے کو کہا تھا اب تو تمہیں ایسا کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے۔” وہ شاید طنز کر رہا تھا۔ وہ اندازہ نہ کر سکی۔

“پلیز شاہ زر! میں نے واقعی ابھی کچھ نہیں سوچا جو بھی فیصلہ کروں گی تم آؤ گے تو بتا دوں گی۔”

“کیا مطلب ہے تمہارا کہ بتا دوں گی؟ کیا تم نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا؟” وہ کچھ حیران ہوتے برہم بھی ہوا۔

“پلیز شاہ زر! میں نے ابھی تک واقعی کچھ نہیں سوچا۔ میں کہہ رہی ہوں نا کہ جو بھی سوچوں گی تمہیں بتا دوں گی اور ہاں تم نشاء اور ملک صہیب کے رشتے سے کیوں انکار کر رہے ہو؟ سب کی بات مان کیوں نہیں جاتے...؟ یہاں سب راضی ہیں صرف ایک تم ہو جو خوامخواہ کی ضد پر اڑے ہوئے ہو۔” شاہ میر ساتھ بیٹھا ہوا تھا اسی لیے وہ اس موضوع پر براہ راست اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اسی لیے بات ہی بدل ڈالی۔

“جب یہ نہیں ہو سکتا تو تم سب کیوں ضد کر رہے ہو؟” وہ تلخی سے بولا تھا مشعال کو بھی اس کی نام نہاد ضد نے غصہ دلا دیا۔ ویسے بھی غصہ تو اس کی گھٹی میں شامل تھا پھر مظاہرہ کیوں نہ کرتی۔

“کیوں... کیوں نہیں ہو سکتا یہ سب؟” وہ ایک دم کہہ اٹھی۔ ”بیٹھے رہو تم یہ نام نہاد غیرت وانا کے راگ آلاپتے مسٹر شاہ زر جہاں زیب! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی' اور تم بیٹھے ہوئے ہو ابھی تک اسی سولہویں سترھویں صدی میں جب اپنے لیے اتنے ماڈرن خیالات رکھتے ہو تو دوسروں کے لیے بھی اپنی سوچ میں وسعت پیدا کرو۔ یہاں کوئی بھی تمہاری اس

خوامخواہ کی ضد پر دھیان دینے والا نہیں۔ ایک تم نہیں مانو گے تو یہ رشتہ نہیں ہو گا۔ تمہیں ابھی نشاء کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ملا۔ ابھی اس کی ماں زندہ ہے اور اللہ نے اگر چاہا تو یہ رشتہ ضرور ہو گا۔ کر لینا جو بھی تم کر سکتے ہو۔" وہ بری طرح بل کھاتے ہوئے چبا چبا کر کہتے ہوئے بہت عرصے بعد ایک دفعہ پھر اسے چیلنج کر گئی تھی۔ اپنی بات کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ شکر تھا کہ اس کی آواز بہت آہستہ تھی جو سوائے شاہ میر کے کسی اور نے توجہ نہیں دی تھی۔ شاہ میر اس کے غصے کی زیادتی سے سرخ ٹماٹر چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"کیا ہے تمہیں...؟" اس کی شرارتی مسکراہٹ اسے اور غصہ دلا گئی۔

"حیرت کی بات ہے۔ شاہ زر بھائی کو بھی کوئی ڈانٹنے والا پیدا ہو گیا ہے رئیلی... یقین نہیں آ رہا۔" آنکھیں معصومیت سے پٹپٹائے وہ شوخی سے اس کا ریکارڈ لگانے کو بے تاب تھا۔ وہ سختی سے اسے گھورنے لگی مگر غصہ، گھورنا، سب بے کار گیا۔ اس کی آنکھوں میں موجود شوخ شرارت بھری مسکان دیکھ کر اسے خود بھی ہنسی آ گئی تھی۔

"بہت بد تمیز ہو تم۔" پیار بھری خفگی سے گھورتے اس نے اسے ایک تھپڑ بھی جڑ دیا۔

اسے شاہ میر کو دیکھ کر ابیشا کی قسمت پر رشک آتا تھا۔ اس قدر پاور فل، پرکشش اور کچھ کچھ شوخ سا اس کی زندگی کا ہمسفر تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگی تھی۔ دونوں کی دائمی خوشیوں کے لیے ڈھیروں دعائیں مانگتی۔ شاہ میر آج کل فارغ ہی تھا اور ہر وقت سب

کے دماغ کھاتا رہتا تھا۔ تین دن بعد علیشہ کے ماموں اس کی شادی کی تاریخ لینے کو آئے تھے اس لیے اب ہر وقت حویلی میں علیشہ کے جہیز کی خوب تیاریاں ہو رہی تھیں۔

’’بڑی امی! جس دن علیشہ کی شادی کی تاریخ رکھی جائے گی آپ اسی دن نشاء اور ملک صہیب کی بھی بات پکی کر دیں۔‘‘ وہ شاہ میر کے پاس سے اٹھ کر سب کے پاس آ کر بڑی امی کے قریب بیٹھ گئی۔ سب اس کی بات پر چونک کر دیکھنے لگے۔

’’مشعال! دل تو چاہتا ہے مگر شاہ زر بھی تو راضی ہو۔ وہ اس خاندان کا بیٹا ہے۔ تو ملکوں کو بھی عزیز ہے۔ اس کی مرضی دونوں خاندانوں کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر یہ سب اچھا نہیں لگتا۔‘‘

’’آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں شاہ زر کی طبیعت سے واقف تو ہیں۔ وہ بس خواہ مخواہ ضد کر رہا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ ابھی اسی کا فون آیا تھا۔ میری اس سے اس سلسلے میں بات ہوئی ہے۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ جب سب راضی ہیں تو وہ راضی ہو جائے میری بات سن کر خاموش رہا تھا لگتا ہے نیم رضامند ہے۔ بس زبان سے کچھ نہیں کہہ رہا۔ میری مانیں تو آپ اپنی مرضی کریں۔‘‘ سب حیران نظروں سے مشعال کو دیکھتے رہے۔ کتنی آسانی سے اس نے یہ بات کہہ دی تھی اور بہت عرصے بعد اس نے براہ راست سب سے شاہ زر کے متعلق کوئی بات کہی تھی۔ مشعال نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شاہ میر کو چپ رہنے کی تاکید کی تو وہ سمجھ کر مسکرانے لگا۔

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی صبح میری اس سے اسی سلسلے میں بات ہوئی تھی تب تو ’ ’ وہ انکار کر رہا تھا۔“ آذر بھائی کہہ رہے تھے۔

آپ کا خیال ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“ مشعال نے نروٹھے پن سے پوچھا تو ’ ’ انہوں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

نہیں... تم غلط سمجھی ہو۔ میں تو کہہ رہا تھا اگر اسے یوں ہی راضی ہونا تھا تو ہمیں بھی بتا ’ ’ دیتا۔ خواہ مخواہ بات کا ایشو بنایا ہوا تھا۔“ انہوں نے فوراً وضاحت پیش کی۔

آپ جو بھی کہہ رہے تھے ٹھیک ہے مگر میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ بہر حال شاہ میر ’ ’ سے آپ پوچھ سکتے ہیں ابھی جو فون آیا تھا وہ اسی کا تھا۔ اس سے میری اسی سلسلے میں بات ہوتی تھی۔“ اس نے شاہ میر کو بھی گھسیٹا۔ وہ اپنی مسکراہٹ دباتا مشعال کی سیاست کی داد دینے لگا۔

مروائیں گی آپ مجھے... خواجے کا گواہ مینڈک کو بنا رہی ہیں۔“ وہ اس کے کان میں ’ ’ بولا تو اسے بھی ایک دم ہنسی آ گئی تھی جب کہ باقی سب علیشہ کی شادی کا موضوع چھوڑ چھاڑ اس نئے معاملے پر بحث کرنا شروع ہو گئے تھے۔

امی! شاہ زر بھائی گاؤں آ رہے ہیں۔ جس دن علیشہ کی شادی کے دن رکھے جائیں ’ ’ گے اس سے دو دن بعد ان کے دوست نذیر کی شادی ہے جس میں ہمیں بھی جانا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ آج کل بہت مصروف ہیں کوشش کریں گے کہ علیشہ کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے پر پہنچ جائیں ورنہ وہ اپنے دوست کی شادی پر ہی آئیں گے۔“ وہ بڑی امی کو بتانے لگا۔

سب کو پھر شادی کی تاریخ یاد آ گئی۔ وہ سب کو ایک دفعہ پھر منگنی کے موضوع سے ہٹتے دیکھ کر چچی زینب کو پکار کر کہنے لگی۔

’’چچی جان! میرا خیال ہے صرف شاہ زر کی ہی بات تھی۔ اب تو وہ بھی نیم رضامند ہے۔ آپ جلدی جلدی بات پکی کریں۔ یہ نہ ہو وہ پھر اعتراض کا کوئی نیا پہلو نکال لے۔‘‘ اس کا مصمم ارادہ چچی زینب کو قائل کرنے کا تھا پھر وہ تب ہی اٹھی جب بڑی امی سے علیشہ کی تاریخ والے دن نشاء کی منگنی کا فیصلہ کروالیا تھا۔

چچی زینب ملکوں کی حویلی میں فون کرنے کے بارے میں سب سے رائے مانگ رہی تھیں۔ وہ اپنی اس کامیاب سیاست پر مسکراتے شاہ میر کو اشارہ کرتے باہر نکل آئی وہ بھی پیچھے آتے ہی شروع ہوا۔ وہ مسکراتے ہوئے لان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

’’بہت غلط کھیل کھیل رہی ہیں آپ۔ اگر سب نے شاہ زر بھائی کو فون کر کے پوچھ لیا تو سارا بھید کھل جائے گا۔ خود بھی پھنسیں گی اور مجھے بھی پھنسائیں گی۔ آپ کو تو علم ہے کہ شاہ بھائی غصے کے کس قدر تیز ہیں اس معاملے میں غلط بیانی وہ کبھی بھی برداشت نہیں کریں گے۔‘‘

’’بے فکر رہو تم۔ اول تو میرا کہہ دینا ہی کافی ہے کوئی پوچھنے کی زحمت نہیں کرے گا۔ اللہ اللہ کر کے تو بقول میرے وہ مانا ہے۔ اگر کسی نے یہ حماقت کر بھی لی تو سب کو میرا نام

لینا ہے اور تمہارا بھائی چاہے اسے جتنا بھی غصہ آئے وہ میرا نام سن کر چپ ہو جائے گا۔ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔" وہ بے فکری سے کہتی گئی۔ شاہ میر طنزیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

جی ہاں... نام میں ہی اتنا دم ہے نا؟" اس کی طنزیہ بات پر وہ مسکرائی۔ ’ ’

جی ہاں میرے بھائی! " مشعال کا انداز سراسر اسے چڑانے والا تھا۔ ’ ’

سنو شاہ میر! تم نشاء کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ کیا تم بھی پرانی دشمنی چلانا چاہتے ’ ’
"ہو۔

نہیں بھابی! میں تو خود دل سے چاہتا ہوں کہ یہ رشتہ ہو جائے۔ یہ دشمنی رشتہ داری ’ ’
میں بدل جائے۔ خاص طور پر شاہ زر بھائی جو اتنے سارے رشتے ہونے کے باوجود خود کو تنہا
"کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ محبت کرنا سیکھ جائیں گے۔

تو پھر ٹھیک ہے میں جو کہوں گی تم بالکل وہی کرنا۔ پھر دیکھنا تمہارا بھائی واقعی کچھ نہیں ’ ’
کر سکے گا۔" اس نے اسے مزید سمجھایا۔ وہ واقعی شاہ زر کو اس کے رشتہ داروں سے ملانا چاہتی تھی۔

میں تو کروں گا مگر آپ بتائیں آپ کب ان سے صلح کر رہی ہیں؟ بہت عرصہ ناراض ’ ’
رہ لیا۔ اب آپ کو ان کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ سارے گلے شکوے بھول کر نئی زندگی کی
"ابتدا کر لینی چاہیے۔

یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کسی کنارے لگے بغیر زندگی نہیں گزرے گی۔" ’ ’

عجیب سے انداز میں مشعال مسکرائی۔ شاہ میر اس کی مسکراہٹ سے کوئی اندازہ نہ کر سکا۔ تب ہی ابیشا مشعال کو ڈھونڈتی ادھر چلی آئی۔

"مشی آپی! آپ یہاں ہیں پاپا آپ کو کب سے بلا رہے ہیں۔ ’ ’

مجھے... کیوں خیریت؟" وہ فوراً ابیشا کو دیکھنے لگی۔ شاہ میر بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ ’ ’ پزل سی ہو گئی۔ وہ شاہ میر کی موجودگی میں سب کے سامنے بہت کم آتی تھی۔ جیسے ہی اسے علم ہوتا کہ شاہ میر حویلی میں موجود ہے وہ کمرے سے ہی نہیں نکلتی تھی۔

جی... صبح سے آپ ان سے ملی نہیں ناں اسی لیے وہ بلا رہے تھے۔" اس نے نظریں ’ ’ جھکائے جھکائے جواب دیا۔ شاہ میر اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

اوہ... ہاں میں واقعی ان سے نہیں ملی۔ صبح مدرسے چلی گئی تھی۔ بعد میں بھی ان کے ’ ’ پاس نہیں گئی اور پلیز شاہ میر! تم کہیں نہیں جانا۔ میں پاپا سے مل کر آتی ہوں۔" وہ جلدی سے سر پر ہاتھ مارتی اپنا دوپٹہ سنبھالتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ ابیشا بھی اس کے پیچھے تیزی سے لپکی مگر شاہ میر کی آواز پر رک گئی۔

‘ ‘ آپ کہاں چلیں ہیں؟ ’ ’

وہ...میں پاپا کے پاس...‘‘ وہ بمشکل بول پائی۔ شاہ میر کے سامنے اس کی حالت ہمیشہ ’ ’ غیر ہو جایا کرتی تھی۔ شاید یہ دونوں کے درمیان موجود رشتے کی بدولت تھا۔

ان کے پاس بھابی جاچکی ہیں پلیز ادھر آئو بیٹھو۔‘‘ اس نے اپنے قریب سیڑھیوں پر ’ ’ اشارہ کیا تو وہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ اس کا شاہ میر سے رشتہ ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ اس سے کترائی کترائی رہتی تھی۔

وہ...مجھے پانی پینا ہے‘ پیاس لگی ہے۔‘‘ اس نے بہانہ تراشا تو شاہ میر نے اسے گھورا۔ ’ ’

تمہیں میں جب بھی بلاتا ہوں یہ غیر ضروری کام کیوں یاد آجاتے ہیں؟‘‘ اس نے ذرا ’ ’ سختی سے پوچھا۔ وہ چپ رہی۔ ’’بیٹھو ادھر۔‘‘ اس نے ابیشا کی طرف بڑھتے کہا تو وہ ایک دم شاہ میر کی پیش رفت سے خوفزدہ ہوتی جھٹ لان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اس کی اس قدر گھبراہٹ پر شاہ میر کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ مشعال جس قدر بولڈ اور پر اعتماد تھی وہ اتنی ہی ڈرپوک اور بزدل تھی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ بھی جیسے ہی اس کے قریب سیڑھی پر بیٹھا وہ ایک دم پیچھے کھسک گئی۔ شاہ میر نے گھورا تو وہ روہانسی ہو گئی۔

تمہیں ابیشا! مجھ پر اعتبار نہیں؟‘‘ وہ ناراضی سے پوچھ رہا تھا۔ ابیشا کو مزید رونا آیا ’ ’

‘ ‘ ...نہیں...یہ بات نہیں ہے...وہ بس میں ’ ’

کیا بس تم؟" اس کی ناراض ناراض سی آواز سن کر وہ رونے لگی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ’ ’ تھا۔ وہ لاکھ کوشش کرتی تھی کہ شاہ میر کے سامنے خود کو بہت کمپوز رکھے مگر ہر بار کوئی نہ کوئی غلطی کر جاتی تھی۔

دیکھو ابیشا! ہم دونوں میں جو رشتہ ہے اگر اس سے ہٹ کر تم سوچو تو ہم دونوں کزن ’ ’ بھی ہیں۔ تم مجھے اپنا پرابلم بتاؤ یقین کرو میں برا نہیں مانوں گا۔ اگر میں تمہیں اچھا نہیں لگتا ناپسند ہوں تو یہ بھی بتا دو میں واقعی کچھ نہیں کہوں گا۔ اس معاملے میں تم پر کوئی زور زبردستی نہیں۔" وہ اس کے رونے پر عاجز آ کر بہت ہی اپنائیت اور دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ابیشا نے ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے اس گریز پر شاہ میر یوں بھی سوچ سکتا ہے۔ اسے اپنے اور شاہ میر کے درمیان ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔

میں نے کب کہا ہے کہ آپ مجھے پسند نہیں یا اچھے نہیں لگتے؟" آنکھیں صاف کر کے ’ ’ پوچھا۔

تو پھر رو کیوں رہی تھیں؟ یوں ہر وقت کترائی کترائی سی رہتی ہو جیسے میں کوئی ’ ’ ناپسندیدہ ہستی ہوں جس سے کوئی بات کرنا یا دیکھنا تمہاری توہین ہے۔ جب کبھی بلاؤں تو جن کی طرح غائب ہو جاتی ہو۔ بات کروں تو یوں کانپنے خوفزدہ ہونے لگتی ہو جیسے میں واقعی کوئی بدصورت دیو ہیکل بھوت پریت ہوں جو تمہیں کھا جائے گا۔ آج تم مجھے بتا ہی دو کہ تمہارے

ساتھ اصل مسئلہ کیا ہے؟" وہ بہت الجھا الجھا ناراض سا کہہ رہا تھا۔ وہ حیران ہوتی اسے سن رہی تھی۔

ایم سوری! مجھے نہیں پتا تھا کہ میری اس طرح کی حرکتوں سے آپ کیا سوچتے ہیں؟ ’ ’ میں نہیں جانتی کہ آپ کی نظر میں میرا کیا امیج ہے... میں آپ کو اچھی لگتی ہوں یا نہیں... مگر میں چاہتی ہوں کہ کوئی مجھے غلط نظر سے نہ دیکھے' غلط انداز سے نہ سوچے' برے الفاظ میں یاد نہ کرے' آپ بھی نہیں۔ میں مشعال آپی نہیں ہوں جو نو کیئر' یا مائی فٹ کہہ کر خود کو ریلیکس کر لوں گی۔ میرے نزدیک ان سب رشتوں کی بہت ویلیو ہے۔ جنہیں مشی آپی اب آ کر سمجھ پائی ہیں۔ میری خواہش تھی کہ کوئی میرے بارے میں غلط رائے نہ رکھے۔ جس طرح مشی آپی پر یہاں آنے کے بعد ہر کسی نے نکتہ چینی کی' باتیں بنائیں' ان کے کردار' ان کی ذات' اس کی زندگی سے لے کر بات کرنے' کھانے پینے' اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے ہر بات کو پرکھا گیا۔ میں نہیں کہتی کہ مشی آپی بالکل درست تھیں مگر ہم جس دیس سے آئے تھے وہاں کا لائف اسٹائل پاکستان سے بہت چینج تھا۔ ہمیں یہاں سیٹل ہونے میں اپنے آپ کو بدلنے میں کچھ وقت چاہیے تھا۔ برسوں کی کاشت کی گئی فصل کو ہم ایک آن میں اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتے تھے۔ اس آزاد معاشرے میں ہر ایک اپنی رائے' پسند اور زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ میں آزاد ہے کچھ اثر ہم پر بھی تھا۔ میں نے اپنی سی کوشش کی کہ خود کو بالکل آپ لوگوں جیسا ظاہر کروں میری کسی بھی حرکت سے مغرب پرستی کی چھاپ دکھائی نہ دے مگر بعض اوقات کچھ

باتیں ایسی ہو جاتی ہیں کہ دیکھنے والا نظرانداز نہیں کر پاتا تھا جس طرح مشی آپی کو کسی نے بھی نہیں بخشا میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا بھی یہی انجام ہو۔ یہاں پاکستان میں لڑکا لڑکی کی بے تکلفی کو غلط انداز سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے جب کہ ہم دونوں تو پھر ایک چھت تلے رہ رہے ہیں۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے میں آپ سے کہاں تک بچ سکتی ہوں۔ میں تو یہ تک نہیں جانتی کہ آپ مجھے پرکھ رہے ہیں یا واقعی میرے لیے مخلص ہیں... جہاں تک پسند کی بات ہے تو سارے اختیارات میں نے ماما پاپا کو دے دیئے ہیں اور انہوں نے میرے لیے اچھا ہی سوچا ہے۔ آپ سے یہ تعلق جڑنے سے پہلے ماما پاپا نے مجھ پر اعتماد کرتے نہ مجھ سے میری رضامندی طلب کی تھی اور نہ مجھے آپ کے متعلق کچھ بتایا تھا مگر اس کے باوجود میں نے ان کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ صرف اس لیے کہ وہ میرے والدین ہیں میرے لیے غلط کیسے سوچ سکتے ہیں۔ آپ تو شاہ زر بھائی کی شادی کے بعد واپس کراچی چلے گئے مگر میں یہیں تھی۔ مشی آپی اور شاہ زر بھائی کے آپس کے تعلقات کے بارے میں جتنا میں جانتی ہوں اتنا تو آپ کو بھی علم نہیں ہے۔ سوائے چند ایک باتوں کے... مشی آپی میں بہت ہمت تھی وہ بہت مضبوط ہیں انہوں نے بہت حوصلے سے سب برداشت بھی کیا جب کہ میں ان کے مقابلے میں بہت کم ہمت، بزدل اور کم حوصلہ ہوں۔ آپ سے متعلقہ کوئی ایسی ویسی بتات تو میں سہہ بھی نہیں پاؤں گی۔ میں مشی آپی جیسی زندگی نہیں گزار سکتی اور نہ ہی کوئی خواب دیکھنا چاہتی ہوں جب آپ پر نظر پڑتی ہے تو میری آنکھیں خواب دیکھنے لگتی ہیں۔" وہ بہت آہستگی سے آنکھیں نیچی

کیے کہتی گئی تھی یہ دیکھے بغیر کہ ساتھ بیٹھا شخص مسلسل اسے نظروں کی گرفت میں رکھے ہوئے تھا۔

مشعال جو اس دوران پاپا سے ملنے کے بعد واپس آئی تھی ابیشا کے عقب میں کھڑی اس کی ساری باتیں سن چکی تھی۔ وہ بغیر کوئی آہٹ کیے دونوں کو متوجہ کیے بغیر واپس پلٹ گئی۔

’’ہوں... تو اس لیے تم پریشان تھیں۔‘‘ سوچتے سوچتے شاہ میر نے ہنکارا ابھرا۔ اس نے پھر بھی آنکھیں نہیں اٹھائی تھیں۔ ’’مجھ سے میرے گھر والوں سے کوئی اور شکایت ہے تو وہ بھی زبان پر لے آئو۔ بلکہ تمہارے دل میں ہمارے خلاف جو جو شکوک و شبہات اور وسوسے موجود ہیں سامنے لے آئو تا کہ مجھے بھی اچھی طرح علم ہو جائے کہ میری ہم سفر مجھے اس قسم کا چھچھورا انسان سمجھتی ہیں۔‘‘ شاہ میر کی کچھ خفا خفا سی آواز ابھری تو اس نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آواز کے برعکس آنکھیں کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے پلکوں کی چلمن گرا لی۔

’’میں چلتی ہوں۔‘‘ اس نے بھاگنا چاہا تو شاہ میر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی ٹانگوں سے جان ہی تو نکل گئی۔ پہلی دفعہ زندگی میں کسی مرد نے یوں استحقاق سے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور وہ بھی شاہ میر نے۔

’’ابھی بیٹھو! بہت ساری غلط فہمیاں ہیں جو تم نے پال رکھی ہیں۔ یہ چند ایک تو میں نے جبراً اگلوا لیں ابھی اور بھی بہت سی ہیں جو ابھی کلیئر کرنی ہیں۔‘‘ ہاتھ کھینچ کر اس نے اسے

دوبارہ ساتھ بٹھالیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی رہ گئی۔ افسوس ہوا کہ اس نے اس سے دل کی بات کیوں کہی۔ وہ نجانے کیا سمجھ رہا تھا اور غلط بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کی بات کا لب لباب یہی نکلتا تھا۔ اسے خود پر بھی جی بھر کر غصہ آنے لگا۔ ہاتھ ابھی تک شاہ میر کی گرفت میں تھا۔ اس نے نکالنا چاہا تو اس نے گرفت سخت کر لی۔

"تم نے ابیشا! مجھے غلط گیس کیا ہے۔ تم لوگوں کے پاکستان آنے سے قبل ہی میں جانتا تھا کہ میرا تم سے کیسا تعلق طے ہونا ہے۔ میں اگر راضی نہیں تھا تو مجھے انکار بھی نہیں تھا۔ پھر بعد میں میں نے تمہیں پہلی نظر میں ہی پسند کیا اور قبول کر لیا۔ پھر تمہیں پرکھنے یا آزمانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ابیشا ہو' تمہیں اپنے دل میں جگہ دینے کے لیے یہی بات کافی تھی تم کمال چچا کی بیٹی ہو۔ تمہاری ذات کی خوبیوں کی پہچان اور ان کا اعتراف کرنے کے لیے یہی حوالہ کافی تھا۔ میں نے کسی کے دباؤ میں آکر یا زبردستی دھمکی میں تمہارے ساتھ نکاح نامے پر دستخط نہیں کیے تھے۔ میرے دل ودماغ نے تمہیں قبول کیا تھا تو تم سے میں نے یہ رشتہ باندھا تھا پھر تمہیں پرکھنے کی بات تو بے معنی رہ جاتی ہے۔ ضروری تو نہیں جو یورپی ممالک سے آئے وہ برا ہی ہو۔ وہ تم جیسا بھی ہو سکتا ہے سلجھا ہوا نیک سیرت۔" وہ اس کی خوبیوں کا اعتراف کر رہا تھا۔ وہ صرف اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں کی بے یقینی پر مسکرا دیا۔

"تم بہت اچھی ہو ابیشا! مختلف سی' بہت پیاری سی' اپنی اپنی سی اور نرم طبیعت کی مالک ہو۔ تم جیسے لوگ آج کل دنیا میں بہت نایاب ہیں۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے مشعال بھابی کو

سمجھنے میں غلطی کی مگر سارا قصور ہمارا بھی تو نہیں نکلتا کچھ غلطیاں دانستہ و نادانستہ مشعال بھابی کرتی رہی ہیں۔ مشعال بھابی بہت بہادر اور ذہین ہیں۔ ہر بات واشگاف انداز میں کہتی ہیں۔ کبھی لگی لپٹی نہیں کہتیں۔ ان کے نزدیک اپنی ذات بہت اہمیت رکھتی ہے ایسے لوگ بعض اوقات نقصان اٹھالیتے ہیں یا بعض اوقات فائدہ مند رہتے ہیں جب کہ تم کچھ بزدل سی ہو مجھے دونوں قسم کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ بھابی مجھے پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھیں۔ ان کے اندر بہت ساری خوبیاں ہیں صرف ایک خامی ہے کہ وہ برطانیہ ویسٹرن ہیں۔ اب جو میں انہیں دیکھتا ہوں تو خوش ہو جاتا ہوں انہوں نے خود سے یہ دھبہ بھی مٹالیا ہے۔ اپنی ذات کے قلعے سے نکل کر ارد گرد بھی دیکھنے لگی ہیں۔ جیسے نشاء اور ملک صہیب کے معاملے میں ان کی غیر معمولی دلچسپی۔ وہ سراپا خوبی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ شاہ زر بھائی ان کو سمجھ نہیں پائے۔ دونوں کی زندگی ڈسٹرب رہی ہے مگر اب مجھے لگتا ہے جیسے سب کچھ نارمل ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب کی بار شاہ زر بھائی جو آئے تو وہ مشعال بھابی کو ساتھ لے جائیں گے۔ دونوں کا رشتہ اتنا کچا نہیں ہے ایشا کہ یوں ٹوٹ جائے۔ تم یقین کرو شاہ زر بھائی بہت اچھے ہیں۔ بس کچھ اختلافات شدت اختیار کر گئے اور پھر شدت پسندی ضد بن گئی۔ تم مجھے شاہ زر بھائی اور خود کو مشعال بھابی کی سطح پر رکھ کر نہ سوچو۔ ہم دونوں کا تعلق مختلف قسم کا ہے۔ میں تمہیں لمبا چوڑا لیکچر نہیں دوں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ تمہارے دل میں میرے متعلق جو بھی غلط فہمیاں اور شکوک و شبہات ہیں انہیں نکال دو ابھی شروعات ہیں۔ ہمیں یہ وقت ملا ہے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے جاننے کے لیے۔ اس

سے فائدہ اٹھاؤ۔ تم یقینا میرے متعلق بہت کچھ جان جاؤ گی۔ ویسے اپنے متعلق میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں بہت کول مائنڈ بندہ ہوں۔ غصہ بہت کم آتا ہے۔ اگر کبھی کسی بات پر ناراض ہو جاؤں تو بہت جلد مان جاتا ہوں۔ کھانے پینے کا ایک حد تک شوقین ہوں۔ خوش خوراک ہوں مگر ناشکرا نہیں ہوں۔ بہت قناعت پسند ہوں اس معاملے میں جو بھی مل جائے صبر و شکر سے کھا لیتا ہوں۔ میری پسند کی ڈشز کے متعلق تمہیں پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میری زندگی کے متعلق بہت لمبی چوڑی ڈیمانڈز نہیں ہیں۔ بہت چھوٹے چھوٹے خواب ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہیں جو بہت جلد پوری ہو جاتی ہیں۔ ارادوں کا پکا ہوں جو ارادہ کرتا ہوں ضرور پورا کرتا ہوں۔ عام جاگیرداروں والی مخصوص سوچ نہیں رکھتا۔ تقدیر پر شاکر ہوں۔ ہر کام اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور اس نے بیٹھے بٹھائے اتنی خوب صورت اور سلجھی ہوئی پیاری و کامنی سی لڑکی میرے نام لکھ دی ہے۔" وہ اپنی اس تعریف پر خجل سی ہو گئی۔ چہرہ گلنار ہوتا چلا گیا۔ شاہ میر دلچسپی سے اس کے سرخ گلنار چہرے کو دیکھے گیا۔

تم شرماتے ہوئے اور بھی خوب صورت لگتی ہو۔ جیسے محبت دھنک رنگ اوڑھ کر ' ' تمہارے چہار سو پھیل گئی ہو۔ تمہیں بتاؤں ایبشا کہ مجھے بارش کے بعد آسمان کے بدن پر سجے ست رنگ بہت خوب صورت لگتے ہیں۔ زندگی بھی تو ان ہی سات رنگوں سے عبارت ہے۔ شوخ و چنچل‘ افسردہ وہ غمزدہ‘ شدت پسند و اعتدال خیز‘ محبت و نفرت سب جذبے اس دھنک میں مل جاتے ہیں اور جب سب رنگ مل کر صرف ایک جذبے کا روپ دھار لیں تو

محبت جنم لیتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ مشعال بھابی اور شاہ زر بھائی کی زندگی میں محبت دھنک رنگ اوڑھ کر ایسی پھیلے کہ چہار سو خوب صورت و معطر ہو جائے۔ پھر زندگی کتنی خوب صورت ہو گی ایبشا ہے ناں...‘‘ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے پوچھ رہا تھا وہ شرما سی گئی اور بے اختیار سر ہلا دیا۔

’’اور تمہیں تو یہ بھی نہیں علم ہے کہ تم نے مجھ پر کیسا جادو کر دیا ہے۔ علیشہ کی شادی ہو جائے اور پھر ذرا میں خود بھی سیٹل ہو جائوں تو پھر بات کروں گا بھابی سے کہ اب مزید انتظار نہیں ہوتا۔‘‘ وہ اس کے چہرے کو اپنی پوروں سے چھوئے کہہ رہا تھا۔ وہ مزید خود میں سمٹ سی گئی۔ شاہ میر نے پہلی دفعہ ایسی کوئی لفاظی کی تھی ورنہ اس کی آنکھیں ہی بولنے کے لیے کافی تھیں۔

’’پلیز! ہاتھ چھوڑیں، مجھے جانا ہے۔‘‘ وہ ملتجی تھی۔ آنکھیں ہنوز جھکی ہوئی تھیں وہ مسکراتا رہا۔ یوں ظاہر کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ’’پلیز! کوئی آ جائے گا مجھے جانے دیں۔‘‘ وہ اس کے یوں بننے پر ایک دفعہ پھر روہانسی ہو گئی۔ اب کی بار اس نے آنکھیں اٹھا کر شاہ میر کو دیکھتے کہا تھا شاہ میر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں واقعی کچھ خواب سج گئے تھے۔

’’تو آ جائے میں کیا کروں؟ اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما ہوا ہے۔ کسی کو کیا؟‘‘ شاہ میر کو اسے ستانے میں مزہ آ رہا تھا، گھبرایا گھبرایا سا، شرمایا شرمایا سا سراپا جس پر اسے نظر ڈالنے، دیکھنے اور چھو کر محسوس کرنے کے پورے اختیارات حاصل تھے۔

”شاہ میر پلیز!“ ابیشا کی آنکھیں بہنے کو بے تاب تھیں۔ وہ اس کے ہونٹوں سے اپنا پہلی دفعہ پورا نام سن کر بے اختیار قہقہہ لگا اٹھا تھا۔ پہلی دفعہ اس نے براہ راست اس کی طرف دیکھتے اسے شاہ میر کہا تھا۔ ابیشا کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر موتیوں کے قطرے چمکتے دیکھ کر اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”بزدل ہو تم بھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے آنکھوں میں خواب سجانے کی بات کر رہی تھیں اور اب رو رہی ہو۔ کیسے گزارا کرو گی مجھ سے کم ہمت لڑکی۔“ ابیشا نے تو جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ ہاتھ چھوٹ جانے پر شکر ادا کرتے اٹھ کر اندر بھاگی۔ وہاں سے باہر نکلتیں بھابی کے ساتھ ٹکرا کر گرتے گرتے بچی۔

”یا وحشت! سنبھل کر لڑکی کوئی پیچھے لگا ہے کیا...؟“

”جی... نہیں... ہاں...“ وہ الٹا سیدھا بول گئی پھر خود ہنس بھی دی تھی۔ بھابی اس کے انداز پر ہونق کھڑی تھیں۔ وہ ان کی طرف دیکھتی فوراً اوپر سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

ة...۹...ة

حویلی میں بہت ہی گہما گہمی تھی۔ بہت ہی سادہ تقریب ہونے کے باوجود بھی اچھا خاصا انتظام ہو چکا تھا۔ شاہ زر کام کی مصروفیت کی وجہ سے واقعی نہیں آ پایا تھا۔ اس کا فون آیا تھا جو شاہ میر نے ریسیو کیا تھا۔ سب کو شاہ زر کا وقت پر نہ پہنچنا بہت اداس کر گیا مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ علیشہ کے ماموں کی فیملی رات کو ہی آ گئی تھی۔ ساتھ میں نشاء عشاء اور اسامہ بھی تھے۔

نشاء کی تو آج منگنی بھی تھی اسی لیے وہ بہت خوش تھی۔ ملک صہیب کی فیملی منگنی کی رسم ادا کرنے آ چکی تھی۔ پھر جیسے ہی مشعال علیشہ اور ابیشا نشاء کو تیار کر کے لاؤنج میں لائیں ملک صہیب کی والدہ نے انگوٹھی پہنا کر بات پکی کی۔ نشاء کی انگلی میں چمکتی دمکتی انگوٹھی دیکھ کر مشعال اپنی سیاست پر مسکراتی چلی گئی۔

وہ جانتی تھی کہ شاہوں کے خاندان میں یہ اصول تھا کہ جو لڑکی جس لڑکے کے ساتھ ایک دفعہ منسوب ہو جائے وہ ساری عمر اسی کے نام کے ساتھ وابستہ رہتی تھی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ دونوں رشتہ ختم نہیں کر سکتے۔ اس کی اپنی مثال اس کے سامنے تھی اسی لیے تو اس نے یہ کھیل کھیلا تھا۔ اب منگنی ہو چکی تھی۔ نشاء ملک صہیب کی منگیتر بن چکی تھی سو اب شاہ زر لاکھ سر پٹخے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب تو معاملہ دو ذاتوں اور دو برادریوں میں آ گیا تھا۔ انکار کی تو گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ جیسے جیسے سوچ رہی تھی مطمئن و آسودہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے جو بھی کیا تھا انتقاماً نہیں بلکہ اس خاندان کی بہتری کے لیے ہی کیا تھا اور اپنے کیے پر نادم نہیں تھی۔

مشعال بھابی! مجھے لگتا ہے جیسے ہم نے شاہ بھائی سے یہ سب چھپا کر ٹھیک نہیں کیا۔“ ’ ’

سب مہمان کھانا کھانے لگے تو شاہ میر اس کے قریب آ گیا۔

تمہارا نام نہیں آئے گا بس تم چپ رہنا۔ وہ جب بھی پوچھے گا تو سب کو میرا نام لینا ’ ’ ہے اور تمہارا بھائی میرے متعلق جان کر کسی کو بھی الزام نہیں دے سکے گا سو آرام سے بات

'مجھ پر آ جائے گی اور میں جانتی ہوں کہ مجھے اس معاملے کو کیسے سنبھالنا ہے۔ تم فکر مت کرو۔ '

'آپ واقعی شاہ بھائی سے نہیں ڈرتیں۔ یہاں تو سب ہی ان سے خائف رہتے ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے امی تک محتاط ہو جایا کرتی ہیں۔'' وہ مذاقاً کہہ رہا تھا۔

''ڈر...'' وہ اس لفظ پر حیران ہوئی پھر ہنس دی۔ وہ اس لفظ کا مفہوم شاہ زر کی قربت میں ہی آ کر اچھی طرح سمجھی تھی۔ وہ ابیشا کو بتا کر غلطی کر چکی تھی مگر اسے یہ بات کیسے بتا دیتی۔ ویسے یہ شخص بہت پیارا تھا۔ اس سے اس کی حساس سی بہن کا مستقبل وابستہ تھا۔ ابیشا کی خوشیاں اس شخص کی زندگی سے وابستہ تھیں اور اسے کچھ کہہ سن کر اسے افسردہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ابیشا کو بھی شاہ میر سے کچھ کہنے سے منع کیا تھا۔ ایک مان جو بھائی ہونے کے ناطے شاہ میر کو شاہ زر پر تھا وہ کچھ غلط کہہ سن کر نہیں چھیننا چاہتی تھی۔ اسے ہر حال میں اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنا تھی۔ پہلے ہی اپنی غلطیوں اور بے وقوفیوں کی بدولت وہ اپنا بہت نقصان کروا چکی تھی۔ وہ شاہ میر کو ہمیشہ ابیشا کی نظر سے دیکھتی تھی اور ابیشا کی آنکھ میں کبھی کوئی آنسو آئے وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔

علیشہ کی تاریخ بھی طے پا گئی تھی۔ علیشہ کی رخصتی اور نکاح دونوں عید کے بعد طے تھے۔

اگلے دن علیشہ کے ماموں کی فیملی واپس کراچی کے لیے روانہ ہوئی تو ان کے ساتھ نشاء عشاء اور اسامہ بھی تھے کیونکہ انہیں واپس عید پر یہیں آنا تھا۔

وہ کافی سارا وقت مدرسے گزار کر دوپہر کو حویلی پہنچی تو سامنے لاؤنج کے صوفے پر شاہ زر کو دیکھ کر وہ رکی ضرور تھی چونکی نہیں۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے شاہ میر سے آج آنے کو کہا تھا۔ کل رات اس کے دوست کی مایوں تھی اور پرسوں بارات اسی لیے آج شادی میں شرکت کے لیے ضرور آنا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اندر داخل ہو کر اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا۔ شاہ زر اس کے بدلے بدلے اطوار دیکھ کر چونکا۔ براؤن کلر کی شیشوں والی چادر لپیٹے ہوئے تھی۔ سادہ دلکش سراپا چند لمحے پہلے اسے نشاء کی منگنی اور علیشہ کی شادی کی تاریخ طے ہو جانے کی خبر سن کر شاک پہنچا تھا اب اسے دیکھ کر جھٹکا لگا۔ مشعال نے ایک منٹ وہیں رک کر سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ شاہ میر نے نظروں ہی نظروں میں اسے ''خیریت نہیں ہے'' کی نوید سنا دی تھی۔ وہ اگنور کیے کچن میں چلی آئی۔ اچھی طرح پیٹ پوجا کر کے کمرے میں جیسے ہی پہنچی شاہ زر پہلے سے وہاں موجود تھا۔

''یہ نشاء کی منگنی والا کیا معاملہ ہے؟'' وہ جارحانہ تیور لیے منتظر تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر مشعال نے اس کے غصے کا اچھی طرح اندازہ لگا لیا۔ ساتھ یہ بھی کہ اس نے اپنی لاعلمی کے بارے میں ابھی کسی اور کو مطلع نہیں کیا تھا۔

معاملہ کیا ہونا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ نے دونوں کا جوڑ بنایا تھا' منگنی ہو گئی۔" وہ آرام سے ’ ’ بتا کر بستر پر لیٹ گئی تو وہ کئی لمحے مٹھیاں بھینچے کھڑا رہا۔ اس کی لال انگارا آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ ضبط کی انتہائی حدوں کو چھو رہا ہے۔

تم نے میرا نام لے کر جھوٹ بولا۔ جب تین دن پہلے میں نے منع کر دیا تھا تو پھر تم ’ ’ نے غلط بیانی کیوں کی۔ اب تو مجھے یہ بھی یقین ہو چلا ہے کہ دو دن پہلے تم نے ہی فون پر مجھے "غلط انفارمیشن بھجوائی تھی۔

اچھا تو کسی نے آپ کو غلط انفارمیشن بھی بھجوائی تھی۔ ویسے وہ بائی داوے غلط ’ ’ انفارمیشن تھی کیا؟" وہ معصومیت کی حد کرتے اس کی آنکھوں میں جھانکتے پوچھ رہی تھی۔ وہ اس کا انداز دیکھ کر پھٹ پڑا۔

خدا کے لیے مشعال! اب بس کرو۔ پلیز! ختم کرو یہ کھیل۔ تم جو بھی چاہتی ہو وہ ’ ’ صاف لفظوں میں بیان کرو۔ تمہارے ساتھ برا سلوک میں نے کیا تھا۔ تمہاری نفرت اور دشمنی میری ذات سے تھی تو پھر مجھ تک ہی رکھی ہوتی۔ بے چاری نشاء کو کیوں تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔' مشعال تو شاہ زر کے اس الزام پر چیخ گئی۔

شٹ اپ شاہ زر! تم اس قدر نیرومائنڈ ہو سکتے ہو اس کا تو مجھے اندازہ تھا مگر اپنا ذہن ’ ’ ٹھیک کر لو۔ میں نے کبھی کسی کو تباہ کرنے کا نہیں سوچا۔ انتہائی سوچ پر تم خود پہنچے ہوئے ہو۔ جو تمہیں اپنی ذات' اپنے احساسات وجذبات اور نفرت وانتقام کے سوا کوئی اور قابلِ توجہ لگتا

ہی نہیں۔ تم یہ انا و غیرت کا راگ الاپتے الاپتے یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اب اس حویلی کے مکین سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ صرف اس بات پر بدلہ لینا چاہتے ہو کہ تمہارے باپ نے تمہاری والدہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا یا پھر سبزینہ پھوپھی کی موت کا ذمہ دار ملک ایاز جو اسی عورت کا بھائی تھا جو تمہاری والدہ تھیں۔ تم صرف اس لیے اس خاندان سے دشمنی کے دعوے دار ہو اور یہ چاہتے ہو کہ نشاء ملک صہیب کے ساتھ بھاگ جائے یا پھر ملک صہیب نشاء کی شہ پر کچھ کر گزرے۔ یہی چاہتے ہو نا کہ ایک دفعہ پھر ان خاندان میں گولیوں کی بارش ہو۔ ایک دو جانیں اپنے خون کا قیمتی نذرانہ پیش کریں اور دشمنی کا یہ اذیت ناک عطیہ نئی نسل کو منتقل ہو جائے۔ ہمارے بڑوں نے نہیں سوچا کوئی فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے ہمارا خیال نہ کیا شاہ زر کیا تم بھی ایسی بے رحمی دکھاؤ گے؟ کیا اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کو اس دشمنی کی پرخطر راہوں میں دھکیل دو گے؟ ہمارے بڑوں نے اگر غلط فیصلے کیے تھے تو کیا ہم پر لازم ہے کہ ہم بھی وہی تاریخ دہرائیں؟ مگر شاہ زر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمیں یہ دشمنی قبول بھی ہے یا نہیں...؟ تم نے یہ سب باتیں کسی اور سے پوچھنا چاہی ہیں کہ وہ سب کیا چاہتے ہیں... ان کی کیا خواہش ہے؟ وہ جن میں آذر بھائی' پاپا ماما بڑی امی' چچی زینب' بھابی' اسامہ اور شاہ میر شامل ہیں۔ نہیں شاہ زر تم اس قدر تنگ نظری کا ثبوت دینے سے پہلے اس حویلی کی لڑکیوں کو بھی دیکھ لو وہ کیا چاہتی ہیں ان کے اندر کیسے جذبات پنپتے ہیں... کیا وہ اس بے نام دشمنی کی خاطر اپنی عزتیں قربان کر سکتی ہیں؟ نہیں شاہ زر کبھی نہیں۔ کبھی اپنے خول سے باہر نکل کر دیکھو تو تمہیں اندازہ ہو گا اب وہ پہلے والی صورت حال نہیں رہی۔ وقت

بہت بدلہ ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب کسی نے فیصلہ کیا اور کسی نے گردن جھکا دی۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھو۔ صہیب اور نشاء ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں دونوں سے ملی ہوں میری دونوں سے اس سلسلے میں بات ہوئی ہے۔ وہ دونوں یہ دشمنی ختم کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے غلط راہ کے بجائے درست راہ کا انتخاب کیا تھا اور ملک صہیب وہ شخص ہے جو تمہارا ماموں زاد ہے۔ کوئی غیر تو نہیں اپنی والدہ کی نسبت تمہارا تو اس سے ایک گہرا تعلق ہے۔ تم چاہے لاکھ انکار کرو مگر تم اس حقیقت کو بدل نہیں سکو گے۔ تمہارا ان سے ایک اٹوٹ تعلق ہے۔ ایک خونی رشتہ۔ شاہ زر تم خود سوچو جب سب راضی ہیں تو تم ان کی سیدھی سادی راہ کیوں کھوٹی کر رہے ہو۔ جان بوجھ کر کانٹے بکھیر رہے ہو کبھی محبت کرنا بھی سیکھ لو جس کمپلیکس کا شکار ہو اس سے باہر نکل کر دیکھو تو دنیا بہت حسین ہے۔ خود بھی سکون سے جیو گے اور دوسرے بھی۔" آج وہ اسے اس کی ماں اور خاندان کا طعنہ دیے بغیر بہت ہی نڈر اور بے خوف انداز میں اس کی ملکوں سے ریلیشن شپ سمجھا رہی تھی۔ کمال حیرت کی بات تھی کہ وہ خاموشی سے سب سن رہا تھا۔

اور جہاں تک غلط اطلاع کا تعلق ہے تو یہ سچ ہے شاہ میر سے کہہ کر میں نے تمہیں ' ' فون پر کہلوایا تھا کہ یہاں علیشہ کی شادی کی تاریخ نہیں رکھی جا رہی۔ اس میں میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ نہیں تھی۔ میں نے نشاء اور اس خاندان کے لیے جو بہتر سمجھا وہ کیا پھر میرا خیال تھا کہ تمہیں جب بھی علم ہو گا تم منگنی رکوانے کی کوشش کرو گے۔" وہ اس کو آرام سے بتا

کراس کی طرف بغیر دیکھے کمرے سے باہر نکل گئی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کی سب باتوں کا شاہ زر پر کچھ اثر ہوا ہے یا نہیں۔

شاہ میر نے اس سارے واقعے میں اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ اسی نے تو شاہ زر کو غلط انفارم کیا تھا اور یہاں سب کو یہ بتایا کہ وہ کسی ضروری کام میں الجھا ہوا ہے اسی لیے وہ یہاں نہیں آئے گا۔ اس نے یہ بھی دھیان میں رکھا کہ شاہ زر جب بھی ساری حقیقت سے آگاہ ہو گا تو اس سے بازپرس ضرور کرے گا اسی لیے اس نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ کوئی جواب بھی نہیں دے سکا تھا۔ اب وہ اسے خود سے سوال وجواب کرنے کے لیے تنہا کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔

باقی سارا وقت وہ کمرے سے باہر گزار کر رات گئے کمرے میں لوٹی تو شاہ زر اندھیرا کیے بستر پر نیم دراز تھا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ شاہ زر ابھی تک جاگ رہا ہے۔

’’مشعال! اب تک تم نے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لیا ہو گا۔ بتاؤ کیا چاہتی ہو تم؟‘‘ وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر سونے کی کوشش کر رہی تھی جب شاہ زر کی آواز کانوں تک پہنچی۔

’’کس بارے میں؟‘‘ وہ بازو ہٹا کر اس کی طرف کروٹ بدل کر سوالیہ دیکھنے لگی۔ شاہ زر اس کے یوں بننے پر اندر ہی اندر بری طرح کھولا تھا۔

تم اچھی طرح جانتی ہو میں کیا پوچھ رہا ہوں۔“ وہ اپنے غصے کو ضبط کرتا بہت نرم آواز ’ ’ میں بولا تو وہ گہری سوچ میں ڈوبی سر ہلانے لگی۔

اچھا... وہ... میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔“ وہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر شاہ زر کی ’ ’ بے بسی کا جائزہ لینے لگی۔ وہ اس جواب پر اور بری طرح کھولنے لگا۔ چہرہ ضبط کی آخری حد تک سرخ ہو چکا تھا۔ مشعال اسے یوں اپنے اوپر ضبط کرتے دیکھ کر خود کو ٹٹولنے لگی۔ اسے شاہ زر کو اس بے بسی کی انتہا پر دیکھ کر ذرا بھی دکھ نہیں ہوا تھا تو خوشی بھی نہیں ہوئی تھی۔ بس عجیب سی کیفیت تھی وہ جان نہ پائی اور نہ ہی جاننے کی کوشش کی۔

مشعال پلیز...“ اس نے بہت بے بسی سے کہا تھا۔ مشعال نے ایک گہری سانس خارج ’ ’ کی۔

دیکھو شاہ زر! کبھی میرا خیال تھا میں تم سے اس حد تک تو نفرت ضرور کرتی ہوں کہ ’ ’ ایک پل بھی اپنا نام تمہارے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی۔ پاپا کو ہارٹ اٹیک ہونے تک میرا پکا ارادہ تھا کہ میں تم سے طلاق لے لوں گی مگر بعد میں پاپا کی حالت دیکھ کر بہت الجھ گئی۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اسی لیے میں نے تمہیں کچھ عرصہ ٹھہر جانے کو کہا تھا اور اس دوران کچھ ایسا ہوا کہ میری سوچ بالکل بدل گئی۔ اس حویلی کے مکینوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو مجھے لگا میں کبھی بھی ان اَن دیکھی زنجیروں سے رہا نہیں ہو پاؤں گی پھر جب جب میں نے کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کی تو ان سب لوگوں کے چہرے میرے سامنے آ جاتے

تھے اور میرے سارے ارادے ڈانواں ڈول ہو جاتے تھے اور میں کوئی فیصلہ ہی نہ کر پاتی اور اب تو میرے پاس سوائے سمجھوتے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ میں اگر سب سے ہٹ کر صرف اپنی ذات کو سوچنا چاہوں بھی تو میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میرے سارے جذبات، میری ذات کی تمام سوچیں میرے تمام احساسات یہاں آ کر یک دم منجمد ہو جاتے ہیں۔ اچانک ماما پاپا اور ابیشا کے چہرے میرے سامنے آ جاتے ہیں اور مجھے لگتا ہے اب کے میں ان سب سے جدا ہو کر کبھی جی نہیں پاؤں گی اب تو شاہ زر میں ایسا کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتی کیونکہ اب ہمارے درمیان...'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔ آنکھیں اٹھا کر شاہ زر کی جانب دیکھا تو وہ حیران نظروں سمیت اسے دیکھ رہا تھا۔ شاہ زر کی آنکھوں میں اس قدر حیرت و بے یقینی تھی کہ وہ اسے جو خبر سنانا چاہتی تھی کہہ ہی نہ پائی۔ ہمیشہ کی منہ پھٹ مشعال کو اس سمے اسے اصل وجہ بتانا کتنا مشکل لگ رہا تھا۔

''شاہ زر! تم اسے میری خود غرضی کہہ لو یا پھر کچھ اور میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تم چاہے جیسا بھی سلوک کرنا جو دل چاہے میں ہر گز برا نہیں مانوں گی۔ پتا ہے کیوں؟ میں نے اپنے اندر کی اس باغی و سرکش، غرور طنطنے کی مالک مشعال کو ختم کر دیا ہے جسے تمہارے ساتھ رہنا قبول نہیں تھا جس سے تم خار کھاتے تھے جو واقعی قابلِ نفرت تھی۔ اب تم آزاد ہو جو چاہے سلوک کرو۔ چاہو تو تنکوں کی طرح مجھے تند و تیز سرکش ہواؤں میں بکھیر دو۔ چاہو تو بے جان گڑیا کی طرح مسل دو۔ مٹی کی طرح

پانی میں بہادو یا سگریٹ کے شعلوں میں جلا کر خاکستر کر دو۔ میں اب تمہارے ہاتھ نہیں روکوں گی۔ میں نے جان لیا کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ بہت عرصہ تک میں خدا کے اس فیصلے کو جھٹلا رہی تھی۔ تم میری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا سے داخل ہوئے میں نے مان لیا۔ شرعی و قانونی طور پر تم مجھ پر بہت اختیار رکھتے ہو پورے حقوق رکھتے ہو۔ پھر بھلا میں کون ہوتی ہوں تمہیں روکنے والی۔ میں کیا ہوں؟ پہلے مجھے اس بات سے فرق پڑتا تھا مگر اب جب سے اپنی اصلیت پہچانی ہے یہ سوال بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔"

اس نے آرام سے اپنی بات مکمل کر کے شاہ زر کا رد عمل جانچا۔ وہ ابھی اسی طرح ساکت وصامت بے یقین لیٹا تھا۔ اسے شاہ زر کی نظریں بڑی عجیب لگیں۔ وہ کروٹ بدل کر اس کے قریب سرک آئی۔ دونوں کے درمیان فرق صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ تھا اس نے وہ بھی ختم کر دیا۔ وہ خود بھی حیران تھی کہ وہ اسے اصل وجہ کیوں نہیں بتا رہی۔ اس کو اندر ڈر تھا کسی بات کا۔ وہ ہزار ہا چاہنے کے باوجود اسے اپنے پریگنٹ ہونے کے بارے میں نہیں بتا سکی تھی۔ اندر سے کوئی وہم تھا جو اسے باز رکھ رہا تھا۔

'کیا ہوا' ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟" اس کے بالکل قریب لیٹے کندھے پر ہاتھ رکھے چہرہ اوپر اٹھائے وہ پوچھ رہی تھی۔ شاہ زر فوراً اسے پیچھے ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ اس رد عمل کے لیے تیار نہیں تھی۔ از حد حیران ہوئی جب کہ شاہ زر کی حیرت سے گنگ زبان پر تالا لگا ہوا تھا۔

’’ تم نے مجھے فیصلہ کرنے کو کہا اور میں نے کر دیا اگر تمہیں میرا یہ فیصلہ قبول نہیں تو تم جو بھی فیصلہ کرو گے مجھے قبول ہو گا مگر کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بات اچھی طرح جان لو کہ اب مجھے طلاق نہیں چاہیے اور میں تم پر زبردستی مسلط بھی نہیں رہنا چاہتی۔ میں جانتی ہوں تم نے یہ تعلق صرف ضد اور انتقام کی وجہ سے ہی باندھا تھا مگر میں تمہیں بتا دوں پہلے میرے دل میں تمہارے لیے نفرت ہی نفرت تھی اب وہ بھی نہیں رہی جہاں تک محبت کا سوال ہے شاید ایک ساتھ رہنے' زندگی گزارتے کسی موڑ پر تم سے ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساری عمر اس جذبے کے بغیر ہی گزر جائے۔ مجھے شاہ زر اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ میں نے کبھی بھی تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں کسی بھی درجے پر پوری نہیں اترتی ہوں۔ ہم دونوں کی ڈیمانڈ اور تھیں۔ کہاں تم ایک سادہ سی مذہبی حیادار لڑکی کے متمنی تھے اور کہاں مجھ جیسی سرکش اور بے حیا لڑکی تمہاری زندگی میں داخل کر دی گئی۔ میں مانتی ہوں مجھ جیسی لڑکی کبھی کسی کا آئیڈیل نہیں ہوا کرتی۔ ماما پاپا بڑی امی کو تمہیں مجھ سے شادی کے لیے آمادہ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے تھا کہ تمہارے اپنے بھی کچھ خواب ہیں' جذبات ہیں زندگی گزارنے کے کچھ اصول ہیں جو میری وجہ سے سب ٹوٹ گئے۔ انھوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی کیونکہ مجھ جیسی لڑکیاں ہی ڈیزرو کرتی ہیں البتہ تمہارے ساتھ ضرور زیادتی ہوئی ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ ساری زندگی کچھ طلب نہیں کروں گی سوائے اس بات کے کہ تم اس رشتے کو برقرار رہنے دو۔ اس سے زیادہ کی مجھے طلب بھی نہیں چاہے تم مجھے اپنے ساتھ مت رکھنا۔ میں یہیں حویلی

میں رہ لوں گی۔ اب تو میں اس ماحول کی عادی ہو گئی ہوں۔ کوشش کروں گی کہ میں خود کو تمہارے قابل بنا لوں۔ اپنے اندر موجود خامیاں ختم کر لوں سراپا تمہاری پسند میں ڈھل جائوں اس کے لیے ابھی مجھے وقت چاہیے شاہ زر ابھی تو میں ماضی کو بھلانے میں لگی ہوں۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ کوئی کربناک یاد' تلخ پل' اذیت ناک سوچ دل و دماغ میں گھس کر کوئی ہلچل نہ مچائے۔ کوئی گزرا لمحہ مجھے اپنی گرفت میں نہ لے..." وہ بیڈ کے کرائون سے ٹیک لگائے بہت ٹھہرے ٹھہرے یاسیت بھرے لب و لہجے میں سب کہہ رہی تھی۔ یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ حیرانگی اور بے یقینی کے سمندر سے نکلنے کے بعد شاہ زر اس کے لفظوں سے کس بری طرح ہرٹ ہو رہا ہے۔ "مگر شاہ زر..." وہ دوبارہ بولنے لگی تھی مگر شاہ زر درمیان میں ہی بول اٹھا۔

بس کرو مشعال! خدا کے لیے بس کرو..." وہ ایک دم چیخ کر بستر سے اتر گیا۔ مشعال حیران ہوتی چپ ہو گئی۔ چند لمحے سرکنے کے بعد بستر سے اتر کر اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

شاہو..." اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا تو شاہ زر نے ہاتھ جھٹک دیا۔

پلیز مشعال! تم یہاں سے جائو... کہیں بھی... مجھے پلیز تنہا چھوڑ دو... جائو پلیز..." وہ بہت عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ مشعال نے فوراً سر ہلا دیا۔ پریشانی سے اسے دیکھتے تیزی سے ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ وہاں موجود صوفے پر گرتے ہی وہ رونے لگی۔ جو خبر سنانے کے

لیے اس نے یہ اتنا عرصہ انتظار کیا وہ خبر اسے سنا ہی نہیں پائی تھی۔ اسے کتنی دیر سے کسی ایسے ہی دن کا انتظار تھا ورنہ وہ اسے فون پر بھی اطلاع دے سکتی تھی۔ ماما، پاپا، ابیشا بڑی امی بھابی میں سے کسی کو بھی بتا سکتی تھی مگر وہ یہ خوشی سب سے پہلے اس کے حقدار سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔

کیا خبر یہ خوشخبری صرف میرے لیے ہی اہمیت رکھتی ہو شاید شاہ زر جان کر خوشی کا اظہار نہ کرے۔ اب بھی وہ میرا فیصلہ سن کر کس قدر بے یقین ہو رہا تھا۔ اس نے یقیناً کچھ اور سوچا ہو گا۔ اب اچانک میرا فیصلہ بدل جانے پر اسے تکلیف پہنچی ہو گی پہلے کب وہ میرے ساتھ خوش تھا۔ ایک ضد اور انتقام کی وجہ سے بندھا تعلق نبھا رہا تھا اب تو پھر..." وہ الٹی سیدھی سوچیں سوچ کر خود کو بے یقین کر رہی تھی۔

سرِ شام ہی حویلی کے سارے مکین شادی والے گھر جا چکے تھے۔ شاہ زر کے جس دوست کی شادی ہونا تھی وہ شاہوں کی برداری سے ہی تعلق رکھتا تھا اور جس لڑکی سے شادی ہو رہی تھی وہ ان ہی کے گائوں کی تھی جب کہ نذیر دوسرے گائوں میں رہتا تھا۔ اس شادی میں لڑکی والوں کی جانب سے بھی ساری حویلی والے مدعو تھے سوائے شاہ زر کے سب ہی لڑکی والوں کے ہاں جا چکے تھے۔ سب نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا مگر ساری رات الجھتے سوچتے، کڑھتے، روتے اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اب اس کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی سو اس نے

سہولت سے منع کر دیا۔ سب کے چلے جانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو شاہ زر اپنے دوست کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ مشعال کو سامنے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

‘‘تم نہیں جا رہیں؟’’

‘‘نہیں... میرا دل نہیں چاہ رہا۔’’ اسے جواب دے کر وہ بستر پر بیٹھ کر اس کی تیاری کا جائزہ لینے لگی۔ اسکائی بلو شلوار قمیص میں کندھے پر سرمئی چادر ڈالے وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی جچ رہا تھا۔ رات کے برعکس صبح اس کا موڈ اور رویہ نارمل تھا۔ جیسے اس نے مشعال کے فیصلے کو قبول کر لیا ہو۔ اس کے اس رویے پر وہ مطمئن ہونے کی بجائے کچھ اور الجھ گئی۔ عجیب بے چینی و بے قراری تھی جو اسے چہار سو سمیٹے ہوئے تھی۔

‘‘مشعال! نذیر نے ہم دنوں کو بطور خاص مدعو کیا تھا۔ اب اگر تمہیں برا نہ لگے تو پلیز میرے ساتھ چلو۔’’ وہ کچھ جھجکتے چور نظروں سے دیکھتے کہہ رہا تھا۔ وہ خاموش دیکھتی رہی۔ چند منٹ سوچنے لگی۔ پہلے تو دل چاہا کہ اپنی طبیعت کا کہہ کر انکار کر دے مگر پھر سر اثبات میں ہلا کر تیار ہونے لگی۔

بلیک نگینوں سے مرصع ایمرائیڈری والی خوب صورت بلیک باریک شیفون کی ساڑھی پہنے وہ جیسے ہی آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی خود کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس نے پہلے بھی ایک دفعہ یہ ساڑھی پہنی تھی مگر فرسٹ ٹائم اس کا سلک کا بلاؤز جس کے ہاف بازوؤں اور گلے پر بہت ہی خوب صورت کام ہوا تھا اسے بہت ڈھیلا ڈھالا تھا تب وہ تھی بھی تو خاصی اسمارٹ مگر اب اس

وقت اسے بلائوز بالکل فٹ تھا ان چند ماہ میں بہت احتیاط کے باوجود اس کا وزن بڑھا تھا خود کو آئینے میں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا یہ بڑھا بڑھا جسم اسے اور بھی حسین بنا رہا تھا۔ بغور دیکھنے سے کوئی بھی زیرک نگاہوں والا اس کے اندر ہونے والی تبدیلی بآسانی نوٹ کر سکتا تھا جب کہ حویلی میں ابھی تک کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت اب مدرسے میں گزارنے لگی تھی اور جو وقت بچ جاتا تھا وہ اپنے کمرے میں سوتے نماز اور سبق پڑھنے میں صرف کر دیتی تھی۔ بہر حال جو بھی وجہ تھی اسے سخت حیرت سے دوچار کر گئی تھی۔ کسی اور چیز کو استعمال کرنے کی طرف اس کا دھیان ہی نہ گیا۔ بس بے یقینی سے مسلسل آئینے میں خود کو جانچ رہی تھی۔ جب شاہ زر اس کا انتظار کرتے کرتے اندر آ گیا۔ اس کے شعلہ و قیامت ڈھاتے روپ کو دیکھ کر دروازے پر ہی رک گیا۔

’’مشعال ! چلیں...؟‘‘ بغیر میک اپ کے بھی وہ اس لباس میں اس قدر حسین لگ رہی تھی وہ بمشکل نظریں ہٹا پایا۔

’’ہاں... بس میں ابھی آنے والی تھی۔‘‘ وہ شاہ زر کی آواز پر چونک کر جلدی جلدی ہاتھ میک اپ کے لیے چلانے لگی۔ افراتفری میں اس نے لپ اسٹک، کاجل اور آئی شیڈز مکمل کی تھیں زیور کے نام پر اس نے صرف کنگن، لاکٹ اور کانوں میں ہلکے وزن والے بندے پہنے تھے۔ شاہ زر گاڑی میں پہلے سے ہی موجود تھا۔ وہ خورشیدہ کو ہدایات دیتی خود بھی جلدی جلدی قدم اٹھاتی گیٹ وے پر کھڑی گاڑی کی طرف بڑھی۔ شادی والے گھر میں دونوں کی

خوب اچھی آئو بھگت کی گئی تھی۔ وہ اس کے اس دوست کے ہاں پہلے بھی دعوت پر آچکی تھیں۔ شاہ زر کی بیوی ہونے کی وجہ سے ہر کوئی اسے بہت عزت دے رہا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ وہ بہت خوش کن احساس میں گھر کر دلچسپ نظروں سے گائوں کی اس روایتی تقریب میں موجود لوگوں کے چہروں کو دیکھتی رہی۔ مایوں کی رسم کا پروگرام رات گئے طے تھا۔ اتنی دیر کے لیے بیٹھے رہنا دوبھر تھا۔ کھانا کھاتے ہی اس نے نذیر کی بہن سے کہہ کر شاہ زر کو چلنے کی اطلاع بھجوائی۔ اطلاع ملتے ہی وہ اسے لینے چلا آیا تھا۔ نذیر اس کی والدہ، بہن، بھابی، بھائی سب اتنی جلدی چل دینے پر ناراض ہو رہے تھے۔ ان کی ناراضگی کا خیال کرتے ہوئے شاہ زر کو اسے بارات اور ولیمے میں بھی ہمراہ لانے کا وعدہ کرنا پڑا تب کہیں جا کر دونوں کو جانے کی اجازت ملی تھی۔

خنک ہوا کی وجہ سے اسے سردی لگنے لگی تھی۔ افراتفری میں تیار ہونے کی وجہ سے وہ شال ساتھ لانا بھول گئی تھی۔ رات کے اس پہر گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے سردی کا شدت سے احساس ہوا۔ گائوں میں اب روز بروز سردی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے گاڑی کے شیشوں کے اس پار تاریکی کو شکست دیتی چاندنی کا جائزہ لینے لگی۔ گاڑی میں ہیٹر آن ہونے کے باوجود اس کے دانت سردی کی شدت سے بج رہے تھے۔

' ' سنو۔ جلدی گاڑی چلائو۔ مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔'' اس کی طرف رخ کر کے اسے مخاطب کیا تو شاہ زر نے اپنی سوچوں سے نکل کر اسے دیکھا پھر اپنے کندھے سے گرم

سر مئی چادر ہٹا کر اس کی جانب بڑھا دی جسے مشعال نے خاموشی سے تھام کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔

’’چلو آئو۔‘‘ تھوڑی دیر بعد اس نے باغ والے گھر کے سامنے گاڑی روک لی۔ وہ حیران ہو کر شاہ زر کو یہاں گاڑی روکنے پر دیکھنے لگی۔

’’مگر ہمیں تو حویلی جانا ہے۔‘‘ وہ نکلنے کی بجائے اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ شاہ زر نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس کی جانب آکر دروازہ کھول کر ہاتھ بڑھایا۔

’’تھوڑی دیر کے لیے آئو پھر حویلی بھی چلے چلتے ہیں۔‘‘ وہ پلکیں جھپکائے بغیر شاہ زر کے پھیلے ہاتھ کو دیکھے گئی۔ ابھی رات کی ہی تو بات تھی جب اس نے اسے تنہا چھوڑ دینے کو کہا تھا اور اب وہ اس کا یہ روپ سمجھ نہ پائی۔ سامنے کھڑے شاہ زر کی آنکھوں میں بے پناہ جذبے بول رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے چاندنی رات میں آسمان کے سینے پر سجے سارے ستارے کوٹ کر ان آنکھوں میں بھر دیے گئے ہوں۔ سفاکیت و بربریت کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا وہ آنکھیں جو مقابل کو ہرانے کے لیے ہر لمحہ بے قرار رہتی تھیں اس وقت چاہت کی ان گنت قندیلوں سے روشن تھیں۔ ایک واضح طلب تھی جو وہ ان آنکھوں میں باآسانی محسوس کر سکتی تھی۔ مشعال کے تمام احساسات یک دم سرد پڑ گئے۔ اندر سے کچھ ٹیسیں تھی جو ابل پڑنے کو بے تاب تھیں وہ اس کا ہاتھ بالکل نظرانداز کیے باہر آ گئی۔

باغ میں پہنچ کر بھی اس کے اندر باہر ایک جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سمے اس کا دل بالکل خالی خولی تھا جو شاہ زر کو اس خاص انداز میں دیکھ کر بھی کسی انوکھی لے پر نہیں دھڑکا تھا۔ نہ ہی آنکھیں حیا کے بوجھ سے جھکی تھیں۔ چہرے پر محبت دھنک رنگ اوڑھ کر نہیں چھائی تھی اور نہ ہی شنگرفی لبوں پر کوئی الوہی سا تبسم کھلا تھا۔ بس سمجھوتے کا ایک گہرا احساس تھا جو اسے اس کی ہمراہی میں یہاں تک کھینچ لایا تھا۔

“مشعال میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ بہت نادم ہوں جو بھی ہوا میں نے کبھی بھی تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہی تھی مگر کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ سب کرتا گیا۔ بظاہر نفرت کا اظہار کرتے کرتے یہ تک بھول گیا کہ تم میرے اندر کس گہرائی تک اپنی محبت کی جڑیں گاڑھے ہوئے ہو۔” وہ جھولے کے قریب پہنچ کر رک گئی تھی۔ شاہ زر کی زبان سے ادا ہونے والے یہ چند جملے بھی اسے رخ موڑ کر پلٹ کر دیکھنے پر مجبور نہیں کر پائے تھے۔ چادر کو اچھی طرح لپیٹ کر اس نے اپنے ہاتھ بھی اس کے اندر چھپا لیے۔ چاندنی رات کا سحر انگیز فسوں ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ شاہ زر خود کو اپنی نیت کو اور خواہش کو عمل دخل کو بری الذمہ قرار دے رہا تھا۔ وہ تاسف سے ہونٹ کچلنے لگی۔ اس نے اس سے ہر قسم کا سمجھوتہ کرنے کا سوچ لیا تھا مگر اب اپنی ساری سوچیں، سارے ارادے بھربھری مٹی کی طرح ڈھے جا رہے تھے۔

وہ اس سارے قصے میں کہاں تھی۔ اس کی روح تو کہیں بھی نہیں تھی بس وجود ہی وجود تھا جس کی طلب اب پھر شاہ زر کو تھی۔ پہلے بھی وہ زبردستی کرتا رہا تھا اب تو اس نے خود اسے مکمل

طور پر اجازت دے دی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ بہت روئے اس قدر کہ ساری دنیا کو اپنے اندر باہر سے اٹھنے والے طوفان سے آشنا کر دے۔ یہاں موجود ایک ایک درخت سے لپٹ لپٹ کر اپنے سارے آنسو بہا دے۔ سارے سوئے جذبات بیدار کر دے اتنا روئے اتنا روئے کہ آنکھوں کے سمندر میں ایک بھی آنسو باقی نہ رہے۔ کوئی بھی زنجیر اس کے قدموں کو نہ جکڑے کوئی بھی جذبہ' کوئی بھی احساس اسے نہ رلائے۔ یہ کیسا شخص تھا سب کچھ کر کے بھی' جلا جھلسا کر بھی کہہ رہا تھا کہ اس نے اسے کبھی بھی تکلیف دینا نہیں چاہی تھی اور وہ جو کچھ کرتا گیا تھا بغیر سوچے سمجھے کرتا گیا تھا یہی بات اسے زود رنج کر رہی تھی۔

اس کی ہستی کے افتخار کو' اس کی نسوانیت کو' اس کی انا و غرور کو لمحہ بہ لمحہ' منٹ بہ منٹ اپنی غیرت وانا' مردانگی' سفاکیت. بربریت کے پاؤں تلے کچلتا رہا تھا۔ اس کے دیئے گئے زخموں پر وہ ساری ساری رات روتی رہی تھی۔ اپنے ہونے پر بین کرتی رہی۔ اذیت و جبر سہتی رہی۔ اپنی روح کو ڈھونڈتی رہی اور آج اس کے پاس لمحہ بہ لمحہ کہن و اذیت کے حوالے کی گئی بے مول راتوں کا کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ ابھی تو وہ اپنے کرچی کرچی وجود کو بمشکل سمیٹ بھی نہیں پائی تھی کہ وہ دوبارہ اپنی طلب کا کاسہ لیے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ انسانیت کا کیا یہی تقاضا تھا کہ وہ صرف دو لفظ کہہ کر اپنے رویوں اور سلوک سے بری الذمہ ہو رہا تھا۔ وہ بمشکل اپنی آنکھوں میں در آنے والے آنسوئوں کو پیچھے دھکیل پائی۔ اسے سمجھوتہ کرنے کی اپنی ساری ہمتیں' سارے ارادے ڈانواں ڈول ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ غیر محسوس طریقے

سے شاہ زر سے ہٹ کر آگے بڑھنے لگی۔ خود کو پھر اپنے نفس کی بات مان کر دوبارہ اذیت میں مبتلا کرنے لگی۔ وہ معافی بھی یوں مانگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بے کار ہستی ہو ناکارہ مصنوعی پیس ہو۔

اسے لگا جیسے وہ صرف خانہ پری کے لیے اس سے معذرت کر رہا تھا۔ آخر وہ بھی ایک جیتا جاگتا وجود تھی۔ ایک ایسا باوقار باہمت وجود جسے ہر بات' ہر جذبے پر احساس سے آگہی حاصل تھی وہ کبھی بھی جذبوں کی ماری عام سی لڑکی نہیں تھی۔ ہمیشہ غلط راہ پر چلنے کے باوجود اپنی حفاظت کی تھی۔ حذیفہ کے علاوہ تو اس نے آج تک کسی سے غلط مراسم بھی نہیں بڑھائے تھے۔ .برطانیہ جیسے پدر ومادر سے آزاد معاشرے کی باسی ہونے کے باوجود ہمیشہ غلط کاموں سے نفرت کی تھی مگر شاہ زر نے اسے جو سزا دی تھی وہ آج تک کسی کو بھی نہیں ملی ہو گی۔ کتنی گھٹیا سزا تھی وہ سسک اٹھی۔ چند جملے کہہ کر اس نے اس سے اور کچھ بھی نہیں کہا تھا اس کے لیے پندار کی رفوگری کے لیے اس کے پاس کوئی مرہم نہ تھا پھر مرہم رکھتا بھی کیسے مرہم بھی تو حساس دل رکھتے ہیں اور یہ شخص جسے ہمیشہ اس کے قریب اپنی طلب کھینچ لاتی تھی وہ کیونکر اس کی زخمی زخمی روح کو دیکھتا۔ اس کے بے مول ہونے والے آنسوئوں کے لیے اس کے پاس ایک بھی لفظ یقین کا نہیں تھا۔ بے پناہ کرب ناک راتوں میں بہائے گئے اپنے آنسوئوں کی اس درجہ بے قدری پر اس کا دل خون کے آنسو رونے کو تھا۔ ہر سوچ' ہر بات اس

کے بدن کے کرب کو دو آتشہ کر رہی تھی وہ ایک ہی درخت کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ شاہ زر اسے یوں مکمل خاموشی کی ردا اوڑھے آگے بڑھتے اور پھر رکتے دیکھتا رہا۔

آج وہ دونوں اس جگہ ایسی چاندنی رات میں' اس باغ میں برسوں بعد اکٹھے ہوئے تھے۔ شاید بچپن میں ایسی راتیں گزری ہوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج اس سے بہت سی باتیں کرے۔ اپنی محبت سے آگاہ کرے جو وہ سالوں سے اپنے اندر سینچتا چلا آ رہا تھا جس نے کچھ عرصہ نفرت وانا کا لبادہ ضرور اوڑھا مگر مری نہیں تھی۔ اپنے سلوک کی معافی مانگے وہ اپنے ہر دل' ہر رویے پر' اپنے ہر عمل پر شرمندہ تھا مگر مشعال کی مسلسل چپ سے اسے بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا وہ ایک ہی درخت کے پاس کھڑی گویا جم سی گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ مشعال اس کی آمد سے بے خبر دور تلک پھیلے درختوں کے عقب میں چھائے اندھیرے کو چیرتی چاند کی روشنی میں موجود کسی غیر مرئی نکتے کو گھور رہی تھی۔ پھر واپس پلٹنے کے لیے وہ جیسے ہی مڑی عقب میں کھڑے شاہ زر سے ٹکرا گئی۔ اسے یوں بالکل اپنے سامنے دیکھ کر اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی۔ اگلے ہی پل اس نے شاہ زر کے بازوؤں میں پناہ لے لی۔ شاہ زر نے بہت آہستگی اور نرمی سے اس کے نرم گداز رعنائیوں بھرے وجود کو اپنے وجود میں سمیٹ لیا اور جھک کر پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا؟ ڈر گئیں مجھ سے؟'' مشعال کو توقع نہیں تھی بالکل اچانک سب کچھ ہوا تھا۔

وہ شاہ زر کے وجود کے لمس کی نرمی سے چپٹ گئی۔ اس کے بدن' روح و جسم کی بے تاب کر

دینے والی لطافت سے جھنجلا گئی۔ جسم کو آسودگی عطا کرنے والی حدت و گرماہٹ نے سانسوں کی تپش کو ایک نیا ردھم دیا۔ آنکھوں کی بے تابی نے اس کی رگوں کے سارے خون کو آتش فشاں بنا دیا۔ شاہ زر کے وجود سے پھوٹتی سحر انگیز ساحر خوشبو نے اس کی سوئی ہوئی تمام فطری حسیات کو جگا دیا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ اٹھی سسک سسک پڑی۔

''شاہو!'' اس نے سسکاری بھری۔ بہتے آنسوؤں والی کالی سیاہ گہری آنکھیں اٹھا کر شاہ زر کو دیکھا۔ شاہ زر کو لگا جیسے وہ ان ستاروں بھری آنکھوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا ہو۔ وہ اس پر جھک گیا۔ مشعال اپنے آپ کو اس کے فولادی بازوؤں کے حصار سے نکالنے کے لیے سیدھی ہو گئی مگر شاہ زر تو اس وقت ڈوبا تھا۔ اتنی جلدی بغیر طلب پوری کیے کیسے ہٹنے دیتا۔

''کیا ہوا ہے... ابھی تک بدگمان ہو؟'' وہ اس کے دلبر و دلکش وجود کی رعنائیوں کو' خوب صورت چاندی جیسے وجود کی قربت کو' اس کے قیامت ڈھاتے حسین و دلفریب روپ کو' اس کے ٹھنڈے ٹھار وجود کی نرمی کو اور بدن کے انگ انگ سے پھوٹتی ساحرہ مدہوش کن مہک کو پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ جو وہ یوں بے قراری سے اس کے وجود سے سکون حاصل کر رہا تھا۔ اپنے اندر اتار رہا تھا۔ اس سے پہلے تو دونوں نے کب اس شرعی و قانونی رشتے کو قبول کیا تھا۔ دونوں ہی انکاری تھے۔ وہ اس کے لیے چیلنج تھی ضد اور انتقام کی بناء پر جیتا ہوا کھلونا۔ ایک مجرم اور افسر کا تعلق تھا درمیان میں۔

آج سے پہلے وہ اس کے لیے یوں اس کے سامنے بے اختیار بھی نہیں ہوا تھا۔ صاف عیاں بھی نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ خود کو انا وضد اور انتقام کے لبادوں میں پرت در پرت لپیٹ کر رکھتا تھا مگر... آج وہ مشعال کا دامن بے پناہ خوشیوں سے بھر دینا چاہتا تھا۔ گزشتہ گزری رات کی اذیت و تلخی تک یاد نہیں رہی تھی۔ خیال میں تھا تو صرف اتنا کہ یہ خوب صورت وجود اس کا ہے' یہ رعنائیوں وشادابیوں سے سجا سحر انگیز پیکر صرف اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجا ہے۔ اگر اس وقت اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ آسمان سے تارے توڑ کر اس کی مانگ میں سجا دیتا۔ وہ اس قدر مست تھا یہ جانے بغیر کہ مشعال کے دل میں ابھی تک اس کے لیے رتی برابر جگہ نہیں ہے پھر فاصلے مٹتے تو کیسے؟

چھوڑو مجھے۔" شاہ زر کے عجیب سے انداز واطوار' رویے اور اس میں چھپی واضح نرمی وتوجہ' آنکھوں' جسم اور ہاتھوں سے چھلکتا عیاں ہوتا استحقانہ لمس وہ محسوس کر کے ایک دم پھنکاری۔ ایک دم شاہ زر کے مضبوط وتوانا سحر انگیز حصار کو توڑ کر پل میں اسے آسمان سے زمین پر پھینک گئی۔ لمحوں میں اسے خواب سے حقیقت میں لے آئی۔ وہ جو رات سے اب تک یہ سمجھ کر خوش ہو رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی ہے۔ اس کی بارگاہ میں اس کا رونا دھونا' گڑگڑانا بے کار نہیں گیا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں وکرم والی ذات نے اسے نواز دیا ہے۔ اس کی سیاہ کاریاں اتنی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کرم کر دیا اور اسے بخش دیا مگر... مشعال کا یہ جارحانہ رد عمل دیکھ کر ساکت کھڑا رہ گیا۔ سارا یقین بے یقین ہو گیا۔ ساری سیاہ کاریاں دوبارہ

کالے بادل بنیں اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ وہ اس کے مضبوط حصار کو توڑ کر رکی نہیں تھی بھاگتی چلی گئی۔ گرم سرمئی چادر کندھوں سے ڈھلک کر کہیں پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ کئی بار اس کا پاؤں رپٹا تھا مگر اسے پرواہی کب تھی۔ خود سے بے گانہ دیوانوں کی طرح بھاگتی گاڑی میں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بری طرح رونے لگی۔

وہ کیسے اتنی جلدی یہ سب برداشت کر لیتی۔ اسے تنہا روتے، سلگتے سلگتے کاٹی گئی راتیں بھولنے سے بھی نہیں بھولتی تھیں۔ اسے شاہ زر کا رویہ اس کے اعمال، اس کی شخصیت کی توڑ پھوڑ، اسے ہر رات کانٹوں پر گھسیٹ لاتی تھیں۔ کل رات کی اپنی کہی گئی باتوں کے برعکس وہ ابھی تک اسے قبول نہیں کر پائی تھی۔ کتنا چاہا تھا کہ وہ اسے دل سے قبول کر لے مگر یہ پاگل دل کسی بھی طرح مان ہی نہیں رہا تھا۔ کل رات سے لے کر وہ اب تک ہزار ہا بار مری اور زندہ ہوئی تھی۔ کل سے بے پناہ اذیت سہہ رہی تھی۔ ابھی تک کوئلوں پر لوٹ رہی تھی۔ وہ کیسے یہ سب بھلا کر سمجھوتہ کر لیتی۔ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ بہت زیادہ، روئی کچھ دیر بعد شاہ زر بھی آگیا تھا۔ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی مشعال کو ایک نظر دیکھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

’’مشعال! تم... اگر...‘‘ کچھ لمحے یوں ہی خاموشی کی نذر ہو گئے پھر وہ بولا تو وہ چیخ اٹھی۔

’’نہیں... شاہ زر... کچھ بھی مت کہنا... میں بہت چاہوں بھی تو وہ سب نہیں بھول سکتی۔ میں صرف سمجھوتہ کر سکتی ہوں۔ خود پر جبر کرنے سے بھی میں اپنے دل میں تمہارے لیے جگہ نہیں بنا پائی۔ میرا اندر بالکل خالی ہو چکا ہے۔ میں نے تمہاری طرف سے بہت اذیت

وتکلیف سہی ہے۔ بہت درد برداشت کیا ہے اپنے اس جسم پر بہت روئی ہوں میں اپنے بدن کے اس کرب کی خاطر۔ اب مجھے بخش دو مجھے مزید آزمائش کے لیے مت منتخب کرو۔ تمہیں شاہو اللہ کا واسطہ مجھ سے اب کچھ مت طلب کرو۔ میں تمہیں وہ کچھ نہیں دے سکتی جو تم مجھ سے مانگ رہے ہو۔ میں تمہارے لیے سب کچھ کروں گی۔ جو کہو گے میں مانوں گی مگر مجھے سکون سے جینے دو۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں اندر سے مر چکی ہوں۔ مجھے اپنے اندر کی مشعال کو زندہ کرنے دو۔ تم نے مجھے پہلے دن سے برا سمجھا۔ میں بری نہیں تھی بس کہیں کھو گئی تھی۔ مجھے تو یہاں اپنوں کی کھوئی ہوئی محبت کی کسک لے آئی تھی مگر تم نے میرے اندر موجود وہ واحد جذبہ بھی چھین لیا۔ اب کچھ اور مت چھینو۔" وہ روتی ہوئی فریاد کناں تھی۔ شاہ زر کو لگا جیسے مشعال کی آنسوؤں کی نمی سے اس کا اندر بھی بالکل خالی ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت کس اذیت سے گزر رہا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ بے دردی سے ہونٹ بھینچ کر ساری توجہ سامنے راستے پر ڈالی دی۔

ة...٩...ة

وہ آفس سے گھر لوٹا تو بہت اپ سیٹ تھا۔

اماں خانساماں سے ایک کپ چائے بنوا کر میرے کمرے میں بھجوادیں۔" وہ انہیں ’ ’ ہدایت دے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی وہ چار دن پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ صاف ستھری چمکتی دمکتی۔ ہر چیز بہت نفاست سے سجی ہوئی تھی۔ اس کی طبیعت میں نفاست

پسندی بہت تھی۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی سنبھال کر رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے جوتوں اور جرابوں کو بھی بہت دھیان سے استعمال کرتا تھا مگر وہ ایک جیتے جاگتے وجود کے معاملے میں بے انصافی کر گیا تھا۔ بری طرح اس نے اسے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز سلیقے سے جمی اپنی جگہ پر تھی ایک نہیں تھا تو وہ خود اپنے مقام نہیں تھا۔ یا وہ وجود جسے ایک عرصے سے ادھیڑتا رہا تھا کہیں دھند میں کھو گیا تھا۔

بدن کا کرب اور محبت کی بکھری دھنک رنگ سب کچھ منتشر ہو چکا تھا۔ ہر خوب صورت منظر دھندلا گیا تھا۔ اپنے ہاتھوں کو جوتوں کی قید سے آزاد کروانے کی اس کے ہاتھوں میں اب ہمت نہیں تھی۔ وہ اوندھے منہ سینے کے بل لیٹا رہا۔ کتنے پل خود فراموشی میں گر گئے۔ اماں چائے کا کپ لیے کمرے میں داخل ہوئیں تو سارا کمرہ گہرے سیاہ اندھیرے کی لپیٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اماں نے ہاتھ بڑھا کر ساری لائٹس آن کر دیں۔

"ٹک ٹک" کی آواز سے سارا کمرہ تیز دودھیا روشنی میں نہا گیا۔ ہر منظر واضح ہو گیا۔

انہوں نے بیڈ کی طرف دیکھا تو وہ اوندھے منہ لیٹا تھا کمرے میں روشنی ہوتے محسوس کر کے آنکھوں سے کشن ہٹا کر وہ سیدھا ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اماں کی طرف دیکھ کر قصداً مسکرایا۔

"کیا بات ہے شاہ! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ وہاں حویلی میں سب خیریت تھی ناں...؟" وہ آج ہی سیدھا حویلی سے آفس پہنچا تھا۔ وہیں سے فون کر کے اماں کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اب جو گھر آیا تو اماں فکر مند تھیں۔

“جی اماں ! سب خیریت ہے۔ آپ ٹھیک رہیں ناں میری غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا...؟” چائے کا کپ تھام کر وہ ہولے ہولے سپ لیتے انہیں مطمئن کر رہا تھا۔

“ہاں... میں تو ٹھیک تھی۔ مشعال سے تم ملے وہ کیسی ہے؟ کوئی بات ہوئی اس سے... کیا فیصلہ کیا اس نے...؟” انہوں نے مشعال کے بارے میں پوچھ لیا۔ اس نے ایک لمبا گھونٹ حلق میں اتارا۔ آنکھوں میں جالے سے بننے لگے۔ تین دن سے وہ اسی قسم کی اذیت سے گزر رہا تھا۔ وہ بھلا اماں کو کیا بتاتا۔ اس پر کیسے قیامت کے پل گزر رہے ہیں۔ اماں تو اس کا درد محسوس کر سکتی تھیں اندازہ لگا سکتی تھیں مگر تکلیف رفع نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اپنے ہی گناہوں میں پھنک رہا تھا۔ اپنے ہی بچھائے گئے جلتے کوئلوں پر ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ اپنی ہی جلائی آگ میں خود ہی جھلس رہا تھا۔

“جی اماں ! ملا تھا اس سے بھی مگر اس نے طلاق لینے سے انکار کر دیا ہے۔” کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک آخری گھونٹ بھی حلق میں انڈیلا۔ اماں بڑی تشویش سے شاہ زر کو دیکھے گئیں۔ خوش ہونے کی بجائے ان کے اندر اندیشے جاگنے لگے تھے۔ شاہ زر کی غیر معمولی خاموشی انہیں سخت متوحش کر رہی تھی۔

“اماں ایک بات تو بتائیں کیا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مانگی گئی پر خلوص معافی اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا...؟” اپنے پاؤں جوتوں کی قید سے آزاد کرتے سر جھکائے وہ پوچھ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسی ناامیدی و مایوسی بول رہی تھی اماں کلیجہ تھام کر بیٹھی رہ گئیں۔

‘‘نہیں شاہ! دل سے مانگی گئی دعائیں اللہ ضرور قبول کرتا ہے چاہے گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں اس ذات بابرکت کا در کھٹکھٹاتے ہی بندہ پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت رحیم و شفیق اور غفور ہے۔’’

‘‘تو پھر اماں! اس اللہ تعالیٰ نے میری معافی کیوں نہیں قبول کی؟ میں نے آج تک اس کے علاوہ کسی کا تصور نہیں کیا... کسی کا در نہیں کھٹکھٹایا... کسی سے سوال نہیں کیا... میں نے تو معافی بہت خلوص سے مانگی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رویا ہوں اس کے حضور سجدوں میں گر کر گڑگڑایا ہوں۔ جب سے وہ مجھے چھوڑ کر گئی ہے ایک رات بھی سکون سے نہیں لیٹا۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو اس کا روتا گڑگڑاتا میرے ظلم پر رحم کی بھیک مانگتا وجود میری آنکھوں کی سطح پر آ کھڑا ہوتا ہے جب سے مجھے اپنا بھیانک روپ دکھائی دیا ہے بے سکون ہو گیا ہوں۔ ضمیر کی خلش مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ اپنے گناہ بھیانک اژدھے بن کر میرے وجود کو ڈستے رہتے ہیں۔ اماں میں نے اللہ تعالیٰ سے بہت معافیاں مانگی ہیں۔ ایک عرصے سے اس کے حضور معافی کا طلب گار رہا ہوں۔ تم تو کہتی ہو اماں گناہ چاہے سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں اس ذات پاک کا در کھٹکھٹانے سے بندہ پاک صاف ہو جاتا ہے۔ وہ معاف کر دیتا ہے تو پھر اس نے میری دعا کیوں نہیں سنی۔ مجھے معافی کیوں نہیں دی؟’’

وہ اماں کے دونوں ہاتھ تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اماں ساکت و صامت بیٹھی رہیں۔ پھر شاہ زر کا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ ایک مہرباں ہاتھوں کا محبت بھرا لمس اور شفیق آغوش پا کر وہ اپنے دل کا سارا غبار نکالتا رہا۔

ایسے نہیں کہو شاہ! تم تو بہت حوصلے والے ہو۔ تم پھر ایسی ناامیدی و مایوسی اور کفر والی ’ ’ ’’باتیں کیوں منہ سے نکال رہے ہو۔

سچ کہہ رہا ہوں اماں سبزینہ پھوپھی کو ملک ایاز نے اغوا کیا وہ مر گئیں کیا انہیں میں ’ ’ نے قتل کیا تھا؟ میری ماں ملکوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک تاوان میں آئی ہوئی عورت تھیں کیا اس بات کا میں ذمہ دار ہوں...؟ میرے ماں باپ نے مجھے جنم دیا کیا یہ میرا قصور تھا...؟ نہیں اماں ان تینوں الزاموں میں میرا قصور تو کہیں نہیں نکلتا تو میں نے ساری عمر سزا کیوں کاٹی۔ میں ساری عمر خود کو شاہوں کے خاندان کا فرد ثابت کرنے کی جدوجہد میں ہلکان کرتا رہا تو کیا یہ میرا قصور تھا۔ صرف اس لیے کہ میں شاہ زر جہانزیب تھا ہوں اور رہوں گا۔ وہ شاہ زر جہانزیب جس کی ماں ملکوں کی بیٹی تھی جو صرف تاوان کے عوض آئی ہوئی ایک عورت تھی جس کی کوکھ سے میں نے جنم لیا۔ جسے جنم دیتے ہی وہ دنیا کی ٹھوکریں‘ طعنے‘ اذیتیں سہنے کے لیے تنہا چھوڑ گئیں۔ مجھے دنیا کے تجربات سہنے کے لیے باپ ہونے کے باوجود یتیم کر گئیں۔ اگر بیس سال تک میرے ساتھ آغا جی اور دادی جان کا وجود نہ ہوتا تو میں ’’تو کب کا مر چکا ہوتا۔

وہ چپ ہو گیا۔ اماں کے دل میں شاہ زر کے الفاظ ترازو بن کر گر رہے تھے۔

اماں یہ ذات برادریاں' حسب ونسب پر تفاخر کیوں؟ میں آج تک اس فرق کو نہیں سمجھ سکا۔ سب نے آج تک مجھے یہی احساس دلایا ہے کہ میں صرف شاہ زر جہانزیب نہیں ہوں۔ میں ملکوں اور شاہوں کے خون کا ملاپ ہوں تو پھر بتائیں یہ لوگ فیصلہ کرنے سے پہلے دوسروں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ میرے باپ نے مجھے جنم دینے سے پہلے میرے بارے میں کیوں نہ سوچا وہ مالی لحاظ سے مجھے سپورٹ کرتا رہا جب کہ اخلاقی لحاظ سے کمزور بناتا گیا۔ دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ میرے باپ کی میرے نام لکھی گئی کروڑوں کی دولت وجاگیر بھی کسی کام نہ آئی۔ میں ان کا بیٹا تھا مجھے ان کی محبت کی ضرورت تھی مگر وہ میرے لیے محبتیں بڑی امی کی آغوش میں تلاش کرتے رہے۔ یہ کبھی نہ سوچا کہ ان کا خون ہوں مجھے ان کے شفیق ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ میں ان کی انگلی تھام کر فخر سے چلنا چاہتا ہوں جس طرح آذر بھیا اور شاہ میر ان کی انگلی تھام کر چلتے تھے۔ میری بھی خواہش تھی میں بھی چلوں میں صرف حسرت سے دیکھتا رہتا تھا۔ ان کی ماں شاہوں کی عورت تھی' زندہ تھی جب کہ میری ماں تو تاوان میں آئی ہوئی عورت تھی جو مر گئی تھی۔ میری خواہشوں اور محرومیوں کے لیے میرے باپ کو کون سرزنش کرتا۔ ہر لمحے کو ہر موڑ پر میری ذات کی دھجیاں بکھیری گئی ہیں۔ میری ذات کو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کہیں میں ملک جہانزیب کا بیٹا ہوں تو کہیں میرا وجود مشعال سے منسلک ہے۔ کہیں میں بڑی امی کی خوشنودی کے لیے خود کو ہلکان کر رہا ہوں تو

کہیں میں اپنی ذات سے ملکوں کا دھبہ اتارنے کے لیے اپنی ہی نفی کر رہا ہوں۔" ساری عمر اس نے اپنے دل کا حال کسی سے نہیں کہا تھا۔ اپنی مایوسیوں و ناامیدیوں کی کہانی کسی کو بھی نہیں سنائی تھی۔ اپنی سوچوں کی تلخیاں اپنی ذات کی بے چینیاں وہ اپنے سینے کے اندر ہی اتارتا رہا تھا۔ اپنا کرب خود ہی سمیٹتا رہا تھا مگر اب اسے کسی رازداں کی اشد ضرورت تھی کسی ہمدرد کی جس سے وہ سب کچھ کہہ لے جسے وہ برسوں سے سنبھالے ہوئے تھا۔ اب ان سننے والوں میں اس نے اماں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ یقیناً خود کو ختم کر لیتا۔ اماں کے سامنے رو لینا اخروی زندگی کی ناکامی سے بہتر تھا۔۔۔

یہ سب کرنے کے بعد بھی مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ میں پہلے سے زیادہ تہی داماں ' ' وخستہ حال ہوں۔ سب اپنی اپنی خوشیوں میں مگن ہیں جو بات ایک عرصے سے شاہوں کے لیے باعث عزت بنی تھی اب اسی بات کی انہیں پرواہی نہیں رہی ہے۔ آپ کو بتاؤں اماں ملک صہیب سے نشا کی منگنی ہو گئی ہے۔" اماں سن کر چونک گئیں' بہت حیران ہوئیں۔

سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ نہیں ہوں تو صرف میں اپنی جگہ پر درست نہیں ' ' ہوں۔ نہ کوئی میرا گھر ہے' نہ میرا خاندان' نہ میری ذات اور نہ ہی میری کوئی شخصیت ہے تو اماں اپنی برسوں کی ریاضت کے بعد میں نے جان لیا کہ میں نے ساری عمر ناکامی میں گزار دی۔ لوگوں کو بڑھاپے میں پچھتاوے آگھیرتے ہیں اور مجھے ابھی سے ڈس رہے ہیں۔ اس قدر شکست سے دوچار تو میں اس دن بھی نہیں ہوا تھا جب ملک صہیب پہلی دفعہ میرے سامنے

کھڑے ہو کر اپنے اور میرے درمیان موجود رشتے سے مجھے آگاہ کر رہا تھا۔ اتنا نا امید و مایوس تو میں تب بھی نہیں ہوا تھا جب مشعال نے سب کی دیکھا دیکھی مجھے ایک تاوان میں آئی ہوئی ماں کا طعنہ دیا تھا۔ اپنی تعلیم کے دوران میں نے کبھی بھی کسی لڑکی سے مراسم نہیں بڑھائے تھے نجانے کیوں ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر ان میں سے کسی بھی ایک سے میں نے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ میرے خاندان کو جاننے کی کوشش کریں گے اور پھر جب انہیں علم ہو گا کہ میں دو خاندانوں کی دشمنی کی بدولت اس دنیا میں آنے والا ان چاہا وجود ہوں جس کی نہ کوئی اپنی شخصیت ہے اور نہ ہی کوئی پہچان تو وہ مجھے میرے قلاش ہونے کا طعنہ دیں گی۔ میں نے عورتوں سے ملتے ہوئے بھی حدود کا خیال رکھا تھا کبھی حدود سے تجاوز نہیں کیا تھا مگر جہاں مجھے سب سے زیادہ حدود کا خیال رکھنا چاہیے تھا وہیں میں سب حدود پار کرتا گیا سب اصول توڑتا گیا۔

مجھے مشعال پر بہت غصہ تھا۔ وہ کون ہوتی تھی جو مجھ سے میری ذات کا فخر چھینتی جو مجھے ایک تاوان میں آئی ہوئی ماں کے بیٹے کا طعنہ دیتی۔ میں نے آج تک ملکوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھا اور مشعال نے غلط بیانی کر کے نشاء اور ملک صہیب کی منگنی کروا دی۔ جب مجھے حقیقت کا علم ہوا تو میں اوپر سے بہت برہم ہوا۔ مشعال پر غلط بیانی کرنے پر خفا بھی ہوا مگر اندر ہی اندر مطمئن بھی ہو گیا۔ یہ برسوں کی دشمنی دوستی اور رشتہ داری میں بدلی تو مجھے دلی سکون ملا تھا۔ میں بہت خوش بھی ہوا تھا ساتھ یہ اطمینان بھی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اسی طرح لکھا ہے۔

اس رات جب میں نے مشعال سے طلاق لینے کے بارے میں پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے مشعال تو خود یہی چاہتی تھی اور اب وہ خود ہی انکار کر رہی ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری دعائیں سن لی ہیں اسی لیے اس نے اتنی بڑی خوشخبری سنا دی ہے مجھے۔ مشعال پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھی میں تو کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے تو کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا الفاظ بول رہی ہے۔ سوچ رہا تھا تو صرف اتنا کہ میرے رب نے میرے آنسوؤں کی لاج رکھ لی ہے۔ میں نے ایک بے گناہ و بے بس وجود کو اذیت دی صرف اپنی ذہنی تسکین کے لیے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کرم سے نواز دیا ہے کیا یہ ہو سکتا ہے...؟ میں بہت حیران تھا اللہ تعالیٰ نے میرے گناہوں کو معاف کر دیا ہے مجھے معافی بخش دی ہے۔ میں ساری رات روتا رہا شکر ادا کرتا رہا۔ اپنے اعمال پر شرمسار ہوتا رہا اور پھر جب اگلی رات میں نے مشعال سے معافی مانگنا چاہی تو اس نے مجھے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔ تب مجھے لگا اماں اللہ نے مجھے ابھی تک معاف نہیں کیا جس لڑکی کو کھلونے کی طرح استعمال کرتا رہا تھا اسی نے مجھے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا۔ جس لمحے میں میں اپنی معافی پر خوش ہو رہا تھا اپنے بخت پر نازاں تھا عین اسی لمحے اس نے ایک آن میں ہی میرے فخر و مان کی چٹان پاش پاش کر دی۔ اللہ نے مجھے یہ حقیقت سمجھا دی کہ جب تک بندے انسان کو معاف نہیں کریں گے وہ بھی حقوق العباد کو معاف نہیں کرے گا۔" وہ پھر رک گیا۔

اماں! میں ایک عرصے سے سمجھتا رہا کہ ہر طرف سے میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی ذات کی سب خامیوں سمیت اپنے بدلے اس لڑکی سے لیے تھے۔ میں بہت خوش تھا وہ مجھ سے اب طلاق لے لے گی۔ کم از کم مجھے یہ سکون تو مل جائے گا کہ میں نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے مگر اس نے انکار کر کے مجھے یہ سکون حاصل کرنے بھی نہ دیا اور جب میں نے سوچا میں نفرت کو پس پشت ڈال کر صرف محبت کی قوس قزح سے زندگی معطر و خوشگوار بنا لوں گا۔ اپنے ہر فعل، ہر عمل، ہر رویے کا ازالہ کر لوں گا تو اس نے یہ بھی نہ کرنے دیا۔ میں شاہ زر جہانزیب جسے اللہ نے سب کچھ دیا۔ تعلیم، دولت، عزت، مقام، وجاہت وعظمت، خوب صورتی سب ہونے کے باوجود میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ عہدہ، یہ عزت جس کی بنا پر لوگ آگے بڑھ کر سلام کرتے ہیں، دعائیں دیتے ہیں میری دولت جس پر میں اکثر غرور کرتا ہوں میرا اپنا وجود جس پر مجھے بڑا مان ہے۔ اپنی تعلیم جس کی وجہ سے مجھے اپنا یہ رتبہ عزت ملی کچھ بھی تو کام نہیں آیا۔ ان سب کے باوجود مجھے اب شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک مکمل انسان نہیں ہوں۔ تقدیر نے ہر چیز سے نوازنے کے باوجود مجھے بے سکون رکھا۔ میری شخصیت کو مکمل کر کے نامکمل رکھا۔ نارمل ہونے کے باوجود میں ایب نارمل رہا۔ نہ میری تعلیم میرے کام آئی، نہ میری دولت نہ ہی لوگوں کی دعائیں اور نہ ہی عزت کے ساتھ کیا گیا سلام۔ مجھے میرے اپنے عمل نے ہی تباہ کر دیا۔ مجھے میری غلط سوچ نے ہی ڈس لیا۔ مجھے خدا کے در سے بھی بے حضوری ملی اور مشعال سے بھی نامرادی میرا مقدر بنی۔ اماں میں زندگی بھر اتنا نہیں رویا جتنا ان دو ڈھائی ماہ میں اللہ کے سامنے گڑگڑایا

ہوں۔" اس نے روتے ہوئے اماں کو بتایا۔ "اماں! تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں جس کے سامنے میں رو سکوں۔ اللہ کے بعد ایسا کوئی بھی نہیں جس کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر سکوں۔" وہ بے آواز روتا رہا۔ اماں خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔ شاہ زر انہیں اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز تھا۔ اس عمر میں وہ اپنے بیٹے' بیٹی کے پاس رہنے کی بجائے شاہ زر کے پاس زندگی گزار رہی تھیں۔ اس کے اس دکھ پر ان کی اپنی آنکھیں بھی بہتی رہیں۔

اماں! میں مشعال سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے کوئی اور نہیں مجھے اس سے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ میں تو بس اپنے گناہوں کا کفارا ادا کرنا چاہتا ہوں مگر مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے بہت ناراض ہو گئی ہے۔ بہت زیادہ بدظن ہو گئی ہے۔ وہ اب مجھے کبھی بھی معاف نہیں کرے گی۔ میں نے اس کے ساتھ بہت غلط سلوک کیا تھا ناں اپنے ہاتھوں سے اپنی متاعِ حیات کو جلاتا رہا۔ وہ صرف ایک دفعہ مجھے معاف کر دے میں پھولوں کی طرح اسے رکھوں گا۔ کبھی بھی اس کی مرضی کے بغیر اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ مجھے صرف ایک دفعہ معاف کر دے ورنہ مجھے اللہ بھی کبھی معاف نہیں کرے گا۔" وہ اور شدت کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ سارہ اماں کو وہ دن یاد آ گیا جب اسی طرح مشعال ان کی گود میں سر رکھے شاہ زر کا ظلم بتاتے اسی طرح رو رہی تھی۔ اس دن اگر وہ روتی تھی تو سکون سے شاہ زر

بھی نہیں رہا تھا بلکہ مشعال سے زیادہ تکلیف میں تھا۔ ایک ایسی سزا کاٹ رہا تھا جو صرف مشعال کے تسلی دلانے پر ہی ختم ہو سکتی تھی۔

انہوں نے بہت آہستگی سے شاہ زر کا چہرہ اٹھایا۔ وہ آنسوئوں سے تر تھا۔ انہوں نے بہت نرمی سے صاف کیا۔ آج پہلی دفعہ انہوں نے شاہ زر کو آنسو بہاتے دیکھا تھا وہ تو اتنا حوصلے والا تھا کہ بچپن میں بھی اس کی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکا تھا۔ آج وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر لرز گئیں۔ ان کا اپنا دل بھی کانپ اٹھا۔

ۃ...۹...ۃ

رات کو سونے سے پہلے اس نے جیسے ہی دوپٹہ سرہانے تلے رکھنا چاہا تو ہاتھ کسی کرنٹ سے چھو گیا۔ اس نے ایک دم ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ چند لمحے کاغذ کے اس بے جان ٹکڑے کو دیکھتی رہی جو کئی دن سے یہیں پڑا ہوا تھا۔ جسے وہ بارہا پڑھ چکی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کی لرزتی انگلیوں سے وہ ٹکڑا اٹھا لیا۔ ہر تہہ کھولتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

پلٹ کر دیکھنا چاہو

تو نفرتوں سے ادھر

دنوں کی راکھ پہ راتوں کی یخ ہتھیلی پہ

ہوا کے ناچتے گرداب کی تہوں میں کہیں

بجھا ہوا کوئی لمحہ

کسی چراغ کے داغ

کہ میں بھی زندہ ہوں

کہ میں بھی زندہ ہوں اپنے اجاڑ دل کی طرح

کہ اجاڑ دل

مشعال نے ایک دم ہاتھ نیچے گرا دیے۔ مزید پڑھنے کی اندر سکت نہیں تھی مگر اگلے لفظ اس کی آنکھوں کی سطح پر ابھر آئے۔ ذہن میں الفاظ گھومنے لگے۔ کاغذ کا بے جان ٹکڑا آنکھوں کے سامنے کیے بغیر بھی وہ اچھی طرح وہ الفاظ دہرا سکتی تھی جو مزید لکھے ہوئے تھے۔

کہ اجاڑ دل

کہ جہاں آج بھی تمہارے بغیر

ہر ایک رات بکھر آئی ہے آرزو کی دھنک

ہر اک صبح دمکتے کہیں زخم زخم گلاب

مشعال نے آنکھیں بند کر لیں۔ لفظ کھو گئے مگر ذہن دہراتا رہا۔ اس نے بے پناہ اذیت میں گھرتے بیڈ کی کراؤن سے ٹیک لگا لی۔ سر بیڈ کی پشت سے ٹکا کر وہ پھر اپنا ذہن لفظ بہ لفظ پڑھنے لگی۔

اجاڑ دل کہ جہاں آج بھی تمہارے بغیر

ہر اک پل میری آنکھوں میں

ڈھل کے ڈھلتا ہے

تپتی رات کی تپش سے

بدن پگھلتا ہے

آنسو قطرہ قطرہ رخساروں پر گرتے چلے گئے۔ وہ بہت حیران ہوئی پھر ہنس دی۔ اپنی بے بسی پر' چار راتیں ہو گئی تھیں اسے یوں ہی آنسو بہاتے ہوئے۔ چار راتوں سے وہ کرب واذیت کی آگ میں پھنک رہی تھی۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنے آنسو اپنے ہاتھ پر ٹھہرا لئے۔ گدلے موتی کمرے میں روشن بلب کی زرد روشنی میں سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اجاڑ دل کہ جہاں ڈوبتا سورج

جس وقت یہ لکھتا ہے

دوریوں کے پیغام

پلٹ کر دیکھنا چاہو

تو نفرتوں سے ادھر

درخشاں ہے کب سے ایک ہی نام

وہ نام جس پہ مسلسل اعتماد ہے مجھے

وہ نام

لوح جان پہ ابھر کے بولتا ہے

نظر پڑے تو سمجھنا

!کہ تم ہو یاد مجھے

نظم ختم ہو چکی تھی مگر لفظ پھر گردش کر رہے تھے۔ دل و دماغ میں روح و بدن میں' اس نے خاموشی سے آنکھیں کھول کر آہستگی سے تمام آنسو اپنی پوروں پر چن لیے۔ اپنے پہلوؤں میں گرا اپنا دایاں ہاتھ اس نے پھر اپنے سامنے کیا۔ ہاتھ میں موجود بے جان کاغذ کا ٹکڑا چڑمڑ ہو چکا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس کا دل بھر آیا۔ بہتی آنکھوں سے اس نے کاغذ میں موجود سلوٹیں درست کیں۔ وہاں درج چند سطریں وہ ایک بار پھر پڑھنے لگی۔

مشعال۔" اس نے کئی بار کا پڑھا اپنا نام ایک بار پھر دھرایا۔ ’ ’

تم سے معافی مانگنے کے قابل تو نہیں ہوں مگر اس امید پر تم سے معافی مانگ رہا ہوں ’ ’ کہ تمہارا ظرف مجھ سے بہت بڑا ہے۔ ہر فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے چاہو تو معافی دے کر زندگی بخش دو چاہو تو میرے اعمال کی سزا سنا کر موت بخش دو۔ مجھے ہر سزا قبول ہے مگر ایک دفعہ پلٹ کر تو دیکھو، زندگی کو ایک دفعہ آزماؤ تو سہی میں اس قابل تو نہیں مگر زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گا۔ لکھنے کو تو بہت کچھ ہے مگر ندامت موقع ہی نہیں دے رہی۔ بہت سے اعترافات ہیں جو کرنے ہیں مگر... پلیز مشعال! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کروں گا جو تمہارا فیصلہ ہو گا وہی مجھے قبول ہو گا۔ سب باتوں کو بھلا کر تم صرف ایک دفعہ مجھ پر اعتماد کرو تو مجھے بدلا ہوا ضرور پاؤ گی۔"

اس نے کاغذ کا ٹکڑا دوبارہ بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ ہاتھ کی پشت سے رخساروں پر بہنے والے قطرے صاف کیے اور سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھی رہی۔

شانزہ! اگر کوئی ہم سے بار بار معافی مانگے وہ اپنے ہر رویے، ہر حرکت اور اپنے ہر ’ ’ انداز سے اپنے کیے پر شرمندہ ہو تو پھر معاف کرنے والے کو کیا کرنا چاہیے...؟" اگلے دن وہ شانزہ کے گھر میں اس کے کمرے میں اس کے سامنے بیٹھی یہ سوال کر رہی تھی۔ وہ چند لمحے بغور اس کی سرخ سوجی جلتی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔

پہلے یہ بتاؤ کسے معاف کرنا چاہتی ہو؟" شانزہ کے اس سوال پر وہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔ ’ ’

کسی کو بھی نہیں۔ یوں ہی پوچھ رہی ہوں بندہ اگر خدا سے معافی مانگے تو وہ فوراً معاف کر دیتا ہے تو پھر بندوں میں اتنا ظرف کیوں نہیں... وہ کیوں فوراً معاف نہیں کر دیتے...؟

شاہ زر کی بات کر رہی ہو نا۔ وہ شاہ زر ہی ہے نا۔" اس نے اچانک حملہ کیا تو وہ حیران رہ گئی۔ "مجھے علم ہے وہ شاہ زر ہی ہے۔ دو دن پہلے یہاں سے شہر جاتے وقت مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ بھی تمہارے جیسی ہی باتیں کر رہا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کیا بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے تم دونوں ہرٹ ہوئے ہو۔ شاہ زر سے میری بہت اچھی جان پہچان ہے۔ ہم اکثر بہت سی باتیں کر لیتے ہیں مگر وہ اپنی بہت سی باتیں راز میں رکھتا ہے۔" شانزہ بتا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ "بہت محبت کرتی ہو اس سے...؟" وہ مشعال کا ہاتھ تھامے بہت اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔ وہ شانزہ کے اس سوال پر اسے پہلے سے زیادہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

محبت..." وہ خود کو کھنگالنے لگی۔ دور تلک خاموشی ہی خاموشی تھی۔

کوئی بات ہوئی ہے تم دونوں میں۔ مجھے نہیں بتاؤ گی؟" وہ بہت خلوص سے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ تیزی سے اپنے آنسو صاف کیے۔ کافی دیر تک خاموش رہی۔

شاید خامیاں مجھ میں ہی تھیں۔ میاں بیوی کا تعلق بہت احترام اور اپنائیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ خلوص محبت توجہ عزت اور مقام مانگتا ہے اور میں نے یہ پانچوں چیزیں اسے نہیں دی تھیں پھر میں اسے قصوروار کیوں گردانوں... کیوں...؟" اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

سنو مشعال! میں تمہیں کچھ بتانے پر مجبور نہیں کروں گی مگر ایک بات واضح کر دوں اللہ تعالیٰ کی ننانوے صفات ہیں۔ جن میں ایک صفت غفور کی بھی ہے اور ایک رحیم کی بھی۔ وہ بہت غفور و رحیم ہے۔ ایک محبت اور جان چھڑکنے والی ماں سے ستر گنا زیادہ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے۔ زندگی میں چھوٹی موٹی آزمائشیں آتی رہتی ہیں تاکہ ہم اس آزمائش کی بھٹی سے پگھل پگھل کر کندن ہو جائیں۔ خالص مومن اللہ کو پسند ہیں۔ اسی لیے ایک منافق کے لیے دوزخ ہے۔ وہ خالص مومن جو اللہ کو پسند ہوتے ہیں ان کے لیے دنیا میں بھی سرخروئی اور آخرت میں بھی کامیابی ہے اللہ اپنے ان بندوں کو پسند کرتا ہے جو اپنے اندر اللہ کی صفات پیدا کریں۔ "خدا" کے مقابلے میں "اللہ" کے نام میں بہت وسعت ہے تم معاف کرنے کی بات کرتی ہو تو سوچو کسے معاف کرنا چاہتی ہو؟ کیوں کرنا چاہتی ہو؟ کیا وجہ تھی معاف کرنے کی؟ اور انسان کا اپنا اس میں کتنا قصور ہے؟ باقی کے سارے سوال خود حل ہو جاتے ہیں بس پہلے چار سوال حل کرنے کی دیر ہے اللہ کے حضور معافی مانگیں تو وہ یہ سب نہیں دیکھتا اس کی تو

صفات ہی یہی ہیں وہ بس اپنے بندے کو روتے گڑگڑاتے دیکھتا ہے اسے رحم آ جاتا ہے اور وہ اسے بخش دیتا ہے۔"

"شانزہ! معاف کرنے کا مجھ میں حوصلہ ہے میں معاف بھی کرنا چاہتی ہوں مگر مجھے سکون نہیں مل رہا۔ جیسے کوئی میرے دل کو کھینچ رہا ہے۔ میری وہی کیفیت ہو گئی ہے جو برسوں سے تھی مگر درمیان میں دو ماہ میں بہت پر سکون ہو گئی تھی۔ ہر احساس سے ہٹ کر صرف اللہ یاد تھا مجھے مگر اب کسی اور کی بھی یاد آتی ہے مجھے کئی اور احساس بھی رلاتے ہیں۔ شاہ زر کے یہاں آنے سے پہلے میں مطمئن ہو گئی تھی مگر اب پھر پہلے جیسی ہوتی جا رہی ہوں۔"

"ایک بات کہوں مشعال! شاہ زر کے پاس چلی جاؤ خود بخود پر سکون ہو جاؤ گی۔"

مشعال نے عجیب سے انداز سے شانزہ کو دیکھا۔

"دیکھو مشعال! جن کے دلوں میں اللہ کی محبت ہوتی ہے نا انہیں کسی اور احساس کی ضرورت نہیں رہتی مگر بحیثیت ایک انسان اس کے لیے کچھ بشری تقاضے بھی ہیں جنہیں نبھانا بہت ضروری ہے۔ اللہ اپنے حقوق تو معاف کر دیتا ہے مگر بندوں کے حقوق اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک بندے معاف نہ کریں۔ اسلام صرف وہ واحد مذہب ہے جو رہبانیت کی اجازت نہیں دیتا۔ دنیا ترک کرنے سے منع کرتا ہے کیونکہ اسی میں فلاح ہے اسی میں بھلائی ہے۔ بحیثیت ایک مسلمان اس پر واجب ہے کہ اپنے فرائض کا خیال رکھے اور حقوق کا بھی۔ یہ

دینا لو اور دو کے اصول پر قائم ہے۔ سچائی اور راستی' ایمانداری نیک نیتی جیسے جذبے زندگی کو پر سکون بنا دیتے ہیں ایک ازدواجی زندگی میں بھی یہ سب بہت اہمیت رکھتے ہیں محبت کا جذبہ ان سب پر حاوی ہے مگر محبت اللہ سے بھی ہو سکتی ہے اور اس کے بندوں سے بھی۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جس نے اعتدال کی راہ اختیار کی صبر و شکر عجز و انکساری اور محبت میں۔" شانزہ بتا کر اسے دیکھنے لگی تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

"شانزہ! اگر میں شاہ زر کے پاس چلی گئی اور پھر بھی میں بے سکون رہی تو...؟ ' '

کیا تمہیں اللہ پر بھروسہ نہیں ہے؟ اس کی ذات پر یقین نہیں کیا؟ مشعال! دو اجنبی ' ' انسانوں کے دلوں میں وہ محبت و توجہ کے بیج بو دیتا ہے۔ نکاح کے دو بول اجنبیوں کو بھی شناسا بنا دیتے ہیں۔ زندگی بدل دیتے ہیں۔ بہت بہت طاقت ہے ان لفظوں میں اور جو بندھن اللہ اس کے رسول ﷺ کو گواہ بنا کر باندھا جائے اس میں کھوٹ بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ خالص بندوں کو پسند کرتا ہے۔ یہ بندھن بھی خالص ہو تو مضبوط ہوتا ہے۔ ہوس کی اس میں گنجائش نہیں۔ بشری تقاضے اہمیت رکھتے ہیں۔ نکاح کے دو بولوں سے زندگی کچھ بھی رہی ہو "سراپا محبت بن جاتی ہے۔ فریقین کے دلوں میں احساس کا جذبہ خود بخود امڈتا چلا آتا ہے۔

صحیح کہہ رہی ہو تم شانزہ! مجھے اللہ کی ذات سے بے یقینی نہیں ہے۔ میری غلطیاں' ' ' لغزشیں اور خطائیں اس قدر ہیں کہ میں خود سے بے یقین ہو گئی ہوں۔ میں کسی کو کیا معاف "کروں گی میں تو خود معافی کی طلب گار ہوں۔

’’اپنی اصلاح کرو مشعال! خود سے بے یقین وہ ہوتا ہے جسے اللہ پر بھروسہ نہ ہو۔ اللہ کی ذات ہی بھروسے اور یقین کل ہے۔ اپنی ساری سوچیں‘ سارے ارادے اس کے حوالے کر دے خود مطمئن ہو جائو۔ وہ اپنے در پر دستک دینے والوں کی ضرور یاوری کرتا ہے۔ اچھا بتائو نماز اور قرآن باقاعدگی سے پڑھتی ہو نا۔‘‘ شانزہ نے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

’’اچھی بات ہے نماز اور قرآن سے تاریک دل روشن ہو جاتے ہیں۔ ان کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بنا لو۔ استغفر اللہ کا ورد کرتی رہا کرو بکثرت۔ انشاء اللہ یہ جو بے سکونی ہے یہ بھی ختم ہو جائے گی۔ تمہارا دل خود بخود ٹھہرتا جائے گا۔ میری مانو تو شاہ زر کے پاس چلی جائو۔ اسی میں فلاح ہے یوں بھی شادی کے بعد عورت کو شوہر کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ اسی میں سکون ہے۔‘‘ وہ شانزہ کے مطمئن چہرے کو دیکھتی رہی۔ شانزہ اسے مزید کچھ سمجھا رہی تھی۔ بہت سی باتیں‘ بہت سے حقوق‘ بہت سے فرائض‘ بہت سی اخلاقیات بہت سی ایمانیات جن کے متعلق پہلے اس نے صرف کتابوں میں پڑھا تھا عمل نہیں کیا تھا جو پہلے اس کے پلے نہیں پڑی تھیں۔ وہ باتیں‘ ایمان کے موتی‘ اس کے دل کو منور کر رہے تھے اور پھر جب وہ اس کے پاس سے اٹھی تو کافی مطمئن و پر سکون ہو چکی تھی۔ یوں جیسے کبھی کہیں بے سکونی تھی ہی نہیں۔

ة...۹...ة

رمضان شروع ہو چکا تھا۔ ہر کوئی بہت خشوع و خضوع سے روزے رکھ رہا تھا۔ تلاوت قرآن پاک کی سحر انگیز آوازیں صبح سے شام تک جاری رہتی تھیں۔ وہ بھی اپنے اندر ہر دم رہنے والے سناٹوں اور خالی پن سے بھاگ کر عبادت میں مشغول ہو گئی پھر اس کا دل جو پہلے ہی پر سکون ہو چکا تھا خود بخود ٹھہرتا چلا گیا۔

علیشہ عید کی تیاریوں سے زیادہ اپنی شادی کی تیاریوں میں مگن تھی۔ ابیشا اس کی مدد کر رہی تھی۔ بھابی ملازمین کے ساتھ مل کر صبح سحری تیار کرواتیں۔ درمیان میں کچھ وقت آرام کرتیں۔ دوپہر کے بعد وہ پھر افطاری کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتیں۔ بڑی امی ماما اور چچی زینب علیشہ کے جہیز کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔

جیسے ہی پہلا عشرہ گزرا' علیشہ شاہ میر سے لاہور لے جانے کی ضد کرنے لگی۔ اسے اپنے لیے جہیز کے کچھ کپڑے اور دیگر ضروری اشیاء خریدنا تھیں۔ شاہ میر روز اسے آج کل لے جانے کے وعدے پر ٹال رہا تھا مگر اس کی آج کل آ نہیں رہی تھی۔ پندرہویں روزے کے بعد تو بڑی امی نے سختی سے شاہ میر کو علیشہ اور نشا کو شہر لے جانے کی تاکید کر دی۔ ابیشا تو ویسے ہی علیشہ کے ساتھ جا رہی تھی۔ دونوں کو تیار دیکھ کر بھابی کو بھی اپنی شاپنگ یاد آ گئی۔ سو وہ بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔ ان تینوں کو جاتے دیکھ کر بڑی امی اور ماما کو مشعال کا بھی خیال آیا جس نے ابھی تک عید کے نام پر کوئی تیاری نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے کوئی پروا تھی۔ وہ ابھی ان

سب کے ساتھ لاہور نہیں جانا چاہتی تھی مگر ان سب کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی سو اسے مجبوراً باقی چاروں کے ساتھ لاہور آنے کے لیے تیار ہونا پڑا۔ سارا رستہ وہ خاموش رہی۔

شہر آ کر تینوں بھابی سمیت چیزیں خریدنے لگی رہیں جب کہ شاپنگ سینٹر میں اس قدر رش تھا کہ اس کا اپنا دل بھی بہت گھبرا رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس پر ہجوم جگہ سے بھاگ کر کسی پر سکون جگہ میں پناہ لے لے۔ سب نے اسے کچھ نہ کچھ خریدنے کو کہا مگر وہ انکار کیے زیادہ تر وقت گاڑی میں ہی بیٹھی رہی تھی۔ سب شاپنگ کرتی رہیں البتہ ابیشا نے اس کے لیے دو سوٹ خریدے تھے۔

سب کا ارادہ رات شاہ زر کی رہائش پر ہی گزارنے کا تھا۔ وہ بھی ان سب کی متفقہ رائے پر سر جھکانے پر مجبور تھی۔ روزہ افطار ہونے سے پہلے وہ سب وہاں پہنچے تھے۔ اماں حسب عادت اپنی من پسند جگہ کچن میں موجود تھیں اور شاہ زر لائونج میں صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ لوگ جیسے ہی اندر داخل ہوئے وہ حیران ہو کر سب کو دیکھنے لگا۔

’’السلام علیکم۔‘‘ شاہ زر کی حیرت پر مسکراتے سب نے سلام کیا۔ وہ حیرت کے سمندر سے باہر نکل کر شاہ میر کے گلے لگ گیا۔

’’وعلیکم السلام! خیریت... تم سب لوگ کیسے میرے غریب خانے کا رستہ بھول کر آ گئے...؟‘‘ وہ کب سے سب کو لاہور آنے کی دعوت دے چکا تھا مگر آج سب کو دیکھ کر حیران اور خوش ہوا۔

دیکھ لیں آج آ ہی گئے ہیں۔ میرا شاپنگ کا پروگرام تھا سوچا کیوں نہ لاہور سے کی ’ ’ جائے اسی لیے آج ہم سب آپ کو یہاں نظر آ رہے ہیں۔" علیشہ سلام کر کے وضاحت کرنے لگی تو اس نے مسکرا کر اس کی وضاحت قبول کی۔ سب کو بیٹھنے کا کہہ کر وہ مشعال کو دیکھنے لگا جو سر جھکائے بالکل چپ چاپ بیٹھ گئی تھی۔ اماں کو مہمانوں کی خبر ہو گئی تھی وہ بھی بھاگی آئیں۔ سب سے مل کر انہوں نے مشعال کو گلے لگا لیا۔ در حقیقت انہیں مشعال کے آنے کی توقع نہیں تھی وہ اور شاہ زر دونوں اسے دیکھ کر ایک دم خوش ہوئے تھے۔ ایک بوجھ جو دل پر پڑا ہوا تھا اسے دیکھ کر سرک گیا۔

وہاں جا کر بالکل بھول بھال ہی گئیں۔ اتنا بھی یاد نہیں تھا کہ یہاں بھی کوئی ماں ہے ’ ’ جو تمہیں دن میں سو سو مرتبہ یاد کرتی ہے۔" سارہ اماں اس کی پیشانی چوم کر شکوہ کر رہی تھیں۔ وہ شرمندہ سی نظریں جھکا گئی۔ یاد تو اسے بھی بہت آئی تھی مگر وہ کیا کہتی۔

رات کو عشاء کی نماز ادا کر کے وہ سب لاؤنج میں آ گئیں۔ شاہ زر اور شاہ میر بھی نماز ادا کر کے آ چکے تھے۔ وہ گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لے رہی تھی جب لاؤنج میں آ کر بیٹھی تو سب اپنی اپنی چیزیں پھیلائے تبصرہ کر رہی تھیں۔ شاہ زر اماں اور شاہ میر دلچسپی سے سب دیکھ رہے تھے۔

مشعال نے کچھ نہیں خریدا؟" وہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد سب سے پوچھ رہا تھا مگر دیکھ ’’ صرف مشعال کو ہی رہا تھا۔

“نہیں جی۔ ہم نے تو بہت کہا تھا کہ کچھ نہ کچھ خرید لیں۔ یہ نہ ہو کہ آپ کے شوہر صاحب آپ کو خالی دیکھ کر ہمیں گھر سے ہی نکال دیں مگر یہ اپنی ضد پر قائم رہیں۔ کہنے لگیں میں اپنے “ان” کے ساتھ ہی شاپنگ کروں گی۔ آپ خود ہی بتائیں جب یہ صورت حال تھی تو ہم بھلا کیا کر سکتے تھے۔” شاہ میر معصوم بن کر اپنے پاس سے بتا رہا تھا۔ وہ اس کے اس سفید جھوٹ پر اسے گھور بھی نہ سکی۔ باقی سب شاہ زر سمیت بے اختیار ہنسنے لگی تھیں۔

“نہیں شاہ بھائی! یہ صرف مذاق کر رہے ہیں۔ آپی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا بلکہ میں نے آپی کے لیے دو سوٹ خریدے ہیں۔ بتائیں کیسے ہیں؟” ابیشا سوٹ نکال کر شاہ زر کو دکھانے لگی۔ شاہ زر سوٹ دیکھتے دیکھتے اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلو بدل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سب نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

“مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔”

“ابھی بیٹھو مشعال! خانساماں چائے لاتا ہی ہو گا پی کر سونا۔” اماں نے روکا۔

“نہیں اماں! اگر چائے پی لی تو پھر نیند نہیں آئے گی۔”

“شاہ زر! تم نے نوٹ کیا مشعال کتنا بدل گئی ہے۔” کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کے کانوں میں اماں کی آواز پہنچی۔

اور مشعال کچھ صحت مند بھی ہو گئی ہیں۔ گائوں کی فضا نے اچھا خاصا اثر کیا ہے۔ پہلے بہت اسمارٹ تھیں اب کچھ موٹی ہوتی جارہی ہیں۔" علیشہ نے بھی کہا تو وہ سن سی ہو گئی۔ پہلی دفعہ حویلی کے کسی فرد نے یہ بات کہی تھی۔ وہ فوراً کمرے میں گھس گئی۔

سب کو اس حویلی میں نئے پھولوں کے کھلنے کا کتنا انتظار تھا۔ بھابی اور آذر بھائی کی شادی کو سات سال ہونے کو تھے مگر ابھی تک ان کی گود خالی تھی۔ بڑی امی اکثر دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ انہوں نے ان کا بہت علاج کروایا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق سب کچھ ٹھیک تھا دیر صرف اللہ کی طرف سے تھی اگر اس کی سوچوں کے برعکس کسی کو پتا چل جاتا تو وہ سب خوشی میں نجانے کیا کر ڈالتے۔ وہ خود ہی کسی کو کچھ بتا ہی نہیں رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب سوئی تھی۔ صبح آنکھ شاہ زر کے پکارنے پر کھل گئی۔

سحری میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔ روزہ نہیں رکھنا کیا؟" وہ مندھی مندھی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ روزے کا سن کر فوراً اٹھ بیٹھی۔ شاہ زر اسے اٹھا کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ جلدی سے واش روم میں گھس گئی' منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو سب سحری کھا پی کر فارغ ہو چکے تھے۔ صرف شاہ زر کے سوا اور کوئی بھی ڈائننگ ٹیبل پر موجود نہیں تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی سارہ اماں کھانا لے آئیں۔ وہ خاموشی سے کھانے لگی۔

’ ’ مشعال! تم ٹھیک ہو؟“ وہ کھانا کھا رہی تھی۔ شاہ زر نے کئی بار کھانا کھاتے کھاتے اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر رہا نہ گیا تو پوچھ لیا۔ جواباً اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ مشعال کے چپ چاپ سے انداز پر وہ مزید سوال و جواب نہ کر سکا۔

اذان ہوتے ہی وہ نماز ادا کرنے چلا گیا تھا۔ وہ بھی فجر کی نماز ادا کر کے تلاوت کے بعد بس یوں ہی لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔ سب نے دس گیارہ کے قریب حویلی جانے کے لیے نکلنا تھا۔ اسی لیے اس نے خود کو سونے سے باز نہیں رکھا تھا۔ کافی ٹائم بعد سو کر اٹھی تو سارے گھر پر خاموشی کا راج تھا۔ وہ اپنے بال سمیٹتی باہر نکل آئی۔ اماں صوفے پر سوئی ہوئی تھیں اس نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خود ہی علیشہ ' بھابی ' ابیشا کی تلاش میں دوسرے کمرے میں آ گئی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ ان کا سامان بھی نہیں تھا۔ وہ باہر صحن کی طرف تیزی سے نکل آئی۔ گیراج میں کل کھڑی کی جانے والی جیپ اب وہاں نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی وہ لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اسے بے پناہ غصہ آنے لگا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ آئی تھی۔ سب استعمال کی چیزیں حویلی میں ہی رہ گئی تھیں۔ مزید یہ کہ کسی نے اسے اٹھا کر ساتھ لے جانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سب کو برا بھلا کہتی لاؤنج میں آ کر حویلی کے فون نمبرز ملانے لگی۔ دوسری طرف ماما تھیں۔ ان سے بات کرنے سے اسے پتہ چلا کہ وہ لوگ ابھی تک حویلی نہیں پہنچے۔ وہ پھر کبھی حساب کتاب پورا کرنے کا سوچ کر کھولنے لگی۔

اسے یہاں رہنے پر اعتراض نہیں تھا مگر اپنے یوں رک جانے پر اچھا محسوس نہیں کر رہی تھیں۔ شاہ زر نے نجانے کیا کچھ سوچ لیا ہو گا۔ اسے اک نئ فکر ستانے لگی۔

وہ تیزی سے چاول چن کر نل کے نیچے رکھ کر دھونے لگی۔ سنک سے کچھ دور بنے چولہوں پر سارہ اماں چاولوں کے لیے پیاز گھی میں سرخ کر رہی تھیں۔ جیسے ہی انھوں نے پانی لگا کر تڑکہ لگایا ساری پیاز کی مہک مشعل کے ناک میں چڑھ گئ۔ اس کا جی بری طرح متلایا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے وہ کچن سے کمرے تک بھاگی۔ اپنے کام میں مصروف سارہ اماں نے چونک کر اسے دیکھا جب کہ ڈائننگ کرسی پر بیٹھا شاہ زر اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔ اسے کافی بری طرح قے آئی تھی تولیے سے منہ صاف کرتی باتھ روم سے باہر کمرے میں آئی تو بہت نڈھال لگ رہی تھی۔

’’کیا ہوا مشعال؟‘‘ شاہ زر نے اسے سہارا دے کر بستر پر بٹھایا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی نظریں چرانے لگی۔

’’کیا ہوا ہے تمہیں؟ ٹھیک تو ہو ناں؟‘‘ سارہ اماں بھی چولہا بند کر کے وہیں آ گئیں۔ اس کے زرد سے چہرے کو دیکھ کر پریشان ہونے لگیں۔

’’کچھ نہیں ہوا باہر سے سموسے کھا لیے تھے تب سے ہی دل عجیب سا متلا رہا تھا۔ شاید فوڈ پوائزنگ ہو گئی ہے۔‘‘ وہ دونوں کو بتا کر مطمئن کرنے لگی۔ یہ سچ بھی تھا وہ آج شاہ زر کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ اس کا اپنا تو دل نہیں چاہ رہا تھا شاہ زر اور اماں کے بار بار اصرار

پر وہ چلی گئی تھی۔ شاہ زر نے اسے اچھی خاصی شاپنگ کروائی تھی۔ عید کے لیے مہنگے سے مہنگے اور اچھے سے اچھے کپڑے لے کر دیے تھے۔ علیشہ کی شادی کے لیے بھی اس نے ابھی سے شاپنگ کروادی تھی۔ شاہ زر کا ارادہ بھی باہر سے افطاری کر کے ہی آنے کا تھا اسی لیے اس نے جاتے وقت اماں کو دونوں کے لیے کچھ خاص اہتمام کرنے سے منع کر دیا تھا لیکن مشعال اپنی کنڈیشن کے پیش نظر باہر سے کھانا کھانے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی مجبوراً نزدیکی دکان سے سموسے لے کر روزہ افطار کرنا پڑا تھا۔ گھر لوٹے تو اماں نے بھی کچھ نہیں پکایا تھا۔ دونوں کو سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ اماں اور خانساماں نے پہلے سے تیار کھانا ہی کھالیا تھا۔ فریج میں بھی پہلے سے تیار مزید کوئی چیز موجود نہیں تھی اسی لیے وہ جلدی جلدی چاول چننے لگی تھی اور اماں چاولوں کے لیے مسالہ تیار کرنے لگی تھیں اور اب یہ مسئلہ ہو گیا تھا۔ وہ حویلی میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ کھانا پکائے جانے والے اوقات میں وہ مدرسے ہوتی تھی یا پھر اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں ایسی ویسی صورت حال پیش نہیں آئی تھی مگر یہاں آنے کے ساتویں دن ہی وہ پھنس گئی تھی۔

''اچھا تم آرام کرو۔ بستر سے اترنے کی ضرورت نہیں۔ میں چاول پکالوں گی۔'' اسے دوبارہ سے اٹھتے دیکھ کر اماں نے ٹوک دیا۔ وہ دل مسوس کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اماں باہر چلی گئی تھیں۔ وہ بستر پر بیٹھی کبھی ہونٹ کاٹنے لگتی یا کبھی انگلیاں مروڑنے لگتی۔

مجھے تم ٹھیک نہیں لگتیں۔ کل میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا۔" شاہ زر اس کے ’ ’ پاس بیٹھ کر نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ اب وہ اسے کیسے بتاتی وہ بالکل ٹھیک تھی وجہ کوئی اور تھی۔

میں بالکل ٹھیک ہوں بتایا ناں کہ سموسے کھا لیے تھے۔ میں نے تو تمہیں منع بھی کیا ’ ’ تھا یہاں سے سموسے مت لو عجیب گندے مندے سے حلیے میں تو وہ لوگ سموسے بنا رہے تھے۔" وہ سارا الزام سموسوں کو دینے لگی۔ شاہ زر چپ ہو گیا۔ بعد میں بھی وہ بستر پر بیٹھی رہی۔ اماں نے کھانے کی اطلاع دی تو کھانا کھا کر نماز ادا کرنے کے لیے وضو کرنے لگی۔ شاہ زر بھی عشاء کی نماز ادا کرنے جا چکا تھا۔ شاہ زر کے آنے سے پہلے ہی وہ نمازِ تراویح ادا کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی۔

شاہ زر کے آفس چلے جانے کے بعد وہ بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اماں صفائی کرنے والی کو ہدایت دیتیں اس کے پاس کمرے میں چلی آئیں۔

کل اچانک تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی... کیوں؟" وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ’ ’ اماں اس وقت یہ ذکر چھیڑیں گی۔ اخبار ہاتھ سے چھوٹ کر گود میں گر گیا۔ حیرت سے اماں کو دیکھنے لگی۔ وہ جن نگاہوں سے اس کے آر پار دیکھ رہی تھیں اس نے جلدی سے نظریں ہی جھکا لیں۔ اس کے ہر ہر انداز سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

"مشعال! مجھ سے مت چھپاؤ جو میں سوچ رہی ہوں سچ ہے...؟ ’ ’

کک... کک... کیا سوچ رہی ہیں آپ؟” وہ جانتی تھی اماں سے کچھ بھی چھپانا مشکل ’ ’ ہے۔

”وہی جو تم چھپا رہی ہو۔ ’ ’

میں کچھ نہیں چھپا رہی۔ پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں...” اس کے چہرے پر ہوائیاں ’ ’ اڑنے لگیں۔ وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

بتاؤ مشعال! میں تمہاری ماں جیسی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی؟” وہ اس قدر محبت ’ ’ پیار اور مان بھرے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔ ان کے اسی لہجے کی تو وہ دیوانی تھی۔ بے اختیار ان کی گود میں منہ چھپا لیا پھر آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا۔ وہ سن کر بے انتہا خوش ہوئیں۔ بار بار اس کے ہاتھ اور پیشانی چوم رہی تھیں۔

اللہ تیرا شکر ہے۔ اتنی بڑی خوشی تو نے مشعال ہم سے چھپائے رکھی۔ ہم تو ترس گئے ’ ’ تھے یہ سب سننے کو۔ دعائیں مانگ مانگ کر ناامید ہو چکے تھے۔ سوہنے اللہ نے ہماری دعائیں سن لیں۔ اب حویلی کی بنیادیں ایک بار پھر نئے سرے سے پختہ ہوں گی۔ نئے پھول کھلیں گے۔” وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ جھینپا سرخ چہرہ جھکائے بیٹھی رہی۔

تم نے مشعال! کیوں چھپایا ہم سے؟ بتایا کیوں نہیں اور شاہ زر کو بھی علم ہے یا ’ ’ نہیں...؟” وہ اس کے جھکے جھکے سر کو دیکھ کر کچھ خفا خفا سے انداز میں پوچھنے لگیں۔

’’نہیں۔ صرف آپ کو بتایا ہے اور پلیز آپ شاہ زر سے کچھ نہیں کہیں گی۔‘‘ وہ عاجزی سے اماں کا ہاتھ تھام کر بولی تو وہ حیران ہوئیں۔

’’پاگل ہو تم۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شاہ زر کو سب سے پہلے پتا ہونا چاہیے۔ دیکھو مشعال! ناراضی، غصہ اور جذباتیت سب ایک طرف۔ تمہیں شاہ زر کو یہ ضرور بتانا چاہیے تھا۔‘‘

’’اماں جی! بتا دوں گی ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ بس آپ وعدہ کریں آپ ابھی اس سے کچھ نہیں کہیں گی۔ آپ نہیں جانتیں اس خوشی نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ میں نے زندگی کا اصل مفہوم جانا ہے۔ میں جو شاہ زر سے طلاق لینے والی تھی مگر اس خوشخبری نے میرے تباہی کی طرف بڑھتے قدم روک دیئے اور پھر میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔‘‘ اماں خاموش رہیں۔ ان کے نزدیک یہ بچوں والی خواہش سوائے جذباتیت کے اور کچھ نہیں تھی۔

آنکھ کھلتے ہی وہ پہلی نظر ڈال کر صورت حال کا کچھ اندازہ نہ کر سکی۔ کمرہ روشن تھا مگر روشنی بہت زیادہ نہیں تھی۔ اس کی سانسیں اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔ سینے پر بوجھ دھرا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر کسی کے حصار نے اسے اٹھنے ہی نہیں دیا تھا۔ اس نے کچھ چونک کر اپنی مندھی مندھی آنکھیں کھول کر اپنے پہلو میں لیٹے شاہ زر کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف چہرہ کیے کروٹ کے بل دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ نیند میں ہی شاید اس نے اپنا بازو مشعال کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ بہت آہستگی سے اس نے اس کا بازو ہٹایا تھا۔ بستر پر اٹھ کر بیٹھی تو اپنے

خشک حلق نے پیاس کا شدت سے احساس دلایا۔ اس نے اپنی دائیں طرف ٹیبل پر نظر ڈالی۔ وہاں موجود جگ خالی تھا۔ اسے کوفت ہوئی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ ہمیشہ جگ میں پانی ڈال کر ٹیبل پر رکھتی تھی۔ اکثر اسے رات کو پیاس لگتی تھی۔ آج رات باہر بارش ہو رہی تھی۔ بجلی بھی چلی گئی تھی۔ سردی اور کچھ بارش کے خراب موسم نے اسے بستر میں دبک کر سو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

بہت آہستگی سے کمبل ہٹاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ گلاس لے کر وہ واش روم میں گھس گئی۔ پانی پی کر لوٹی تو سیدھی نظر وال کلاک پر جا پڑی۔ ابھی رات کے اڑھائی بجے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر وائٹ لائٹ روشن کی۔ کمرہ ایک دم زرد سی سفید روشنی میں نہا گیا۔ اس نے اپنے اوپر ایک ناقدانہ سی نگاہ ڈالی۔ رات کے اس پہر دوپٹے کے بغیر اپنا وجود عجیب سا لگا۔ دوپٹہ اوڑھنے کی عادت اس قدر پختہ ہو گئی تھی کہ اب کبھی دوپٹہ کندھے سے ڈھلک جاتا یا خود ہی لینا بھول جاتی تو اسے عجیب سا لگا تھا۔ وہ بغیر لائٹ آف کیے دوبارہ بستر پر آ گئی۔ نیند اب اسے آنا محال تھی ارد گرد نظریں دوڑاتے بلاارادہ شاہ زر پر جا ٹھہریں وہ کچھ دیر قبل والی کنڈیشن میں سویا ہوا تھا۔ وہ بغور اسے دیکھے گئی۔

وہ جب سے یہاں آئی تھی شاہ زر نے واقعی خود کو بدلا ہوا ظاہر کیا تھا۔ کس قدر خیال رکھنے والا انداز تھا۔ اسے اپنی گزشتہ غلطیوں حماقتوں پر افسوس ہونے لگا۔ اسلام نے میاں بیوی کے تعلقات میں کس قدر اپنائیت رکھی ہے۔ اسے یقین آ گیا۔ وہ ایک عرصے تک غلطیاں کرتی رہی

تھی۔ اگر شروع سے ہی اپنی اصلاح کر لیتی تو آج زندگی کس قدر خوب صورت ہوتی جواب دونوں کے درمیان ایک جھجک ' پشیمانی ' تاسف تھا۔ وہ تو نہ ہوتا۔ یہ شخص اسے کبھی بھی ناپسند نہیں رہا تھا۔ اسے اس بات کا اقرار تھا مگر نفرت و ضد کے جو اذیت ناک لمحے آگئے تھے وہ انہیں اپنی زندگی سے نکال تو نہیں سکتی تھی۔ وہ یک دم نہیں بدلی تھی لمحہ بہ لمحہ بدلی تھی۔ ہر آنے والے واقعے نے اس کی سوچ پر اثر ڈالا تھا۔ وہ اب منفی سوچنے کی بجائے مثبت سوچنے لگی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ شاہ زر اس سے اب بھی محبت کرتا ہے اور بے پناہ کرتا ہے۔ یہ بات اسے شاہ زر یا سارہ اماں نے نہیں بتائی تھی اس نے خود محسوس کی تھی۔ اس دن جب چاول دھوتے اسے قے ہونے لگی تھی تو وہ کس قدر پریشان ہوا تھا۔ اگلے دن بھی وہ آفس جانے کے بعد دو تین مرتبہ فون کر کے اس کی طبیعت دریافت کرتا رہا تھا۔ پھر رات کو اپنے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں چلنے کو کہا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا پھر بعد میں بھی لمحہ بہ لمحہ اس کی فکر مندی اسے مسکرانے اور کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ان سب باتوں کے برعکس اس نے ابھی تک شاہ زر کے لیے اپنے دل میں وہ خاص فیلنگز محسوس نہیں کی تھیں جسے محبت کہتے ہیں مگر وہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔

البتہ وہ اکثر اپنی غلطیوں کے بارے میں ضرور سوچنے لگی تھی۔ جہاں اس کا خیال تھا کہ شاہ زر غلط ہے وہاں اسے اپنا قصور زیادہ لگتا تھا۔ وہ ایک مرد تھا اور وہ ایک عورت دونوں کی حیثیت مسلم تھی مگر ان کے باوجود وہ اسے ہمیشہ زچ کرتی رہی تھی۔ جبر اور ظلم کرنے پر اکساتی رہی

تھی۔ اسلام میں شوہر کو اس قدر عزت دی گئی ہے کہ اگر خدا کے بعد کسی کو سجدہ کرنے کا حکم ہوتا تو وہ ایک بیوی کا اپنے شوہر کے لیے ہوتا۔ یہ بات اچھی طرح جاننے کے باوجود اس نے ہمیشہ شاہ زر کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ ہمیشہ کمینے' جاہل' اجڈ' جنگلی وحشی درندے کے القابات سے نوازتی رہی تھی۔ اپنی بیوی کے منہ سے یہ سب القابات سننے کے باوجود وہ خاموش رہتا یہ ناممکن تھا۔ اسے اس حد تک چلے جانے پر اس نے خود مجبور کیا تھا۔ جس قدر اس کا جرم تھا اس سے دگنا اس کا اپنا نکلتا تھا۔ پھر معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور شاہ کو دیکھا وہ ہنوز اسی طرح سویا ہوا تھا۔ مشعال کے ہونٹوں پر ایک دھیمی مسکراہٹ آ بکھری۔

''سنو۔ میں نے تمہیں معاف کیا تم بھی مجھے معاف کر دو۔ تم چاہتے تھے نا کہ میں تمہارے پاس پلٹ کر آئوں۔ تمہیں آزمائوں تو میں آ گئی ہوں۔ اب کی بار اللہ سے دعا ہے کہ ہمارا یہ ملن موت تک ہو۔ کبھی کوئی کلیش نہ ہو بس خوشیاں ہوں۔ میں خوشیوں کے لیے بہت ترسی ہوں۔ اپنی غلطیوں کی وجہ سے بہت نادم بھی ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم دونوں وہ سب کچھ بھول کر نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کریں۔ ایک خوشیوں بھری زندگی جس میں شدت بھی ہو' اعتدال پسندی بھی ہو' محبت بھی ہو' عداوت بھی جنون بھی اور ملائمت بھی ہو۔ احساس بھی ہو' سب کچھ ہو مگر نفرت نہ ہو بس محبت دھنک رنگ اوڑھ کر ہم پر بکھرے اور کبھی نہ سمٹے۔'' اپنی اس خود کلامی پر وہ خود ہی ہنس دی۔ شاہ زر ابھی بھی پر سکون سو

رہا تھا۔ اس نے آج تک خود سے اسے کبھی بھی دانستہ نہیں چھوا تھا اس وقت اس دیوتا جیسے حسن رکھنے والے اپنے شوہر کو چھو کر محسوس کرنے کی خواہش دل میں ایک دم ابھری۔ ہاتھ شاہ زر کی جانب بڑھائے ہوئے وہ ایک پل کو جھجکی تھی پھر سر جھٹک کر اس نے اس کی پیشانی پر بکھرے کالے بال انگلیوں کی مدد سے پیچھے ہٹائے۔ اٹل ارادوں کا پتا دیتی کھڑی ناک کی چوٹی کو چھوتے ہوئے اس کو کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس وقت اگر ہوش میں ہوتا تو وہ یہ جسارت کبھی نہ کر پاتی۔ اپنی اس سوچ پر ہی وہ مسکرا دی۔

یا اللہ میں بہت غلطیوں اور ناکامیوں کے بعد منزل پر پہنچی ہوں۔ اب مجھے کبھی بھی ’ ’ اس منزل سے مت بھٹکانا۔ اس شخص کو معاف کر دینا اس نے جو بھی کیا تو جانتا ہے اس میں میرا زیادہ قصور تھا تو پھر سزا اس اکیلے مرد کو کیوں ملے تو بہت انصاف والا ہے۔ اندھے تاریک دلوں اور بھٹکے ہوئے نفسوں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ سیدھے راستے پر رکھنا کبھی بھی بھٹکنے مت دینا۔" اس کی آنکھوں پر اپنی ہتھیلی پھیلائے اس نے خلوص دل سے دعا کی۔

یک دم شاہ زر کا چہرہ دیکھتے اس کے دل میں ایک انوکھی خواہش ابھری تھی وہ اپنی سوچ پر خود ہی جھینپ گئی۔ بھلا شاہ زر کی صبیح کشادہ پیشانی کا بوسہ لینا۔ وہ یہ جسارت کیسے کر سکتی تھی۔ عجیب سے انداز میں ہونٹوں کو سکیڑتے اپنی ہی سوچ پر نفی میں سر ہلانے لگی۔ مردوں کے لیے یہ ... بات کتنی آسان ہوتی ہے اور عورتیں

یااللہ مجھے اس شخص سے محبت ہو جائے۔ تو میرے دل میں اس کی محبت ڈال دے۔" ' '

اس پر نظریں جمائے اس نے اللہ سے دعا مانگی پھر اچانک ہی بلا اختیار اس نے جھک کر شاہ زر کی گندمی کشادہ صبیح پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے۔

ہاں مجھے اس شخص سے محبت ہو سکتی ہے۔ بس کچھ وقت لگے گا۔" اپنے بے پناہ ' ' دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھتے اس نے بہت آسودگی سے سوچا۔

ۃ...۹...ۃ

اب اسے اچھا خاصا غصہ آنے لگا تھا۔ شاہ زر اسے صبح سے تیار کروا کر سامان گاڑی میں رکھوا کر نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ اب تو افطاری میں بھی صرف دو گھنٹے رہ گئے تھے اور جناب کی آمد کے ابھی تک کوئی آثار ہی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کپڑے اتار کر آرام سے بیٹھ جائے۔ شاہ زر اب آئے تو صاف انکار کر دے۔ ویسے بھی اب شام قریب تھی۔ افطاری کا وقت ہونے والا تھا۔ گائوں جانے میں بھی چار پانچ گھنٹے لگ جانے تھے اوپر سے آج مطلع بھی ابر آلود تھا۔ دو تین دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ آج ایک دو دفعہ وقفے وقفے سے ہلکی ہلکی بوندیں زمین پر اتر چکی تھیں آج ماشاء اللہ اٹھائیسواں روزہ تھا اور عید دونوں کو گائوں میں ہی جا کر کرنا تھی۔

سارہ اماں کا بیٹا دو دن پہلے ہی آ کر ان کو اپنے ساتھ گھر لے گیا تھا۔ آج کل صرف دونوں ہی رہ رہے تھے۔ آج تو شاہ زر صبح سے ہی گیا ہوا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اس کی گاڑی بھی گھر

میں ہی تھی اور موبائل بھی آف تھا۔ آفس سے اس نے کل ہی چھٹیاں لے لی تھیں اور وہاں وہ گیا ہی نہیں تھا۔ آفس فون کر کے اسے پتا چل گیا تھا۔ اب اسے غصہ آنے کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی ہو رہی تھی جو ایک فطری بات تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا اور مشعال کے پاس اسے ٹریس کرنے کو کوئی اتا پتا ہی نہ تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ افطاری کا بندوبست کرنے لگی۔ سارہ اماں دونوں کے لیے کافی کچھ فریز کر گئی تھیں۔ یوں تو خانساماں ابھی تک یہیں تھا مگر آج وہ کسی کام سے اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ البتہ چوکیدار ابھی تک گیٹ پر موجود تھا۔ وہ فریج سے چیزیں نکال کر تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ جب شاہ زر واپس لوٹ آیا۔ اسے سامنے دیکھ کر مشعال کی جان میں جان آئی۔

جلدی جلدی تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ابھی فورا گاؤں کے لیے نکلنا ہے۔” آتے ہی اس نے ’ ’ کہا۔ ایک تو وہ سارا دن بغیر کچھ بتائے غائب رہا تھا۔ اب شام کے نزدیک اس کی افراتفری میں آمد اور یہ حکم چلانا مشعال کو سخت گراں گزرا۔ بہت چڑی اس وقت افطاری کا وقت تھا۔ شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی اور وہ گاؤں جانے کا سوچ رہا تھا۔ اسے شاہ زر کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

کہاں تھے تم بتا کر نہیں جایا جاتا تھا؟ میں ادھر بیٹھی سارا دن تمہارے بارے میں سوچ ’ ’ سوچ کر پریشان ہوتی رہی ہوں۔” اپنی طرف سے تو اس نے خاصے غصے میں کہا تھا مگر شاہ زر

اس کے اس روپ پر بے اختیار زیر لب مسکرا اٹھا۔ وہ جو پہلے ہی چڑی ہوئی تھی مزید آؤٹ ہو گئی۔

’’مگر تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں تو ہمیشہ دوسروں کو پریشان کر کے سکون حاصل کرنے کی بیماری ہے ناں۔‘‘ شاہ زر جو بغور اس کے غصے اور پریشانی سے سرخ چہرے کو دیکھ رہا تھا ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

’’آئم سوری۔ ڈی سی صاحب کا فون آ گیا تھا۔ بہت ضروری کام تھا۔ اسے نمٹاتے نمٹاتے ہی دیر ہو گئی۔ ایم رئیلی سوری۔ مجھے تمہیں اطلاع کرنا چاہیے تھی مجھے اندازہ تھا کہ تم کتنا پریشان رہی ہو گی مگر میرے سیل کا کارڈ ختم ہو گیا۔ میں الجھ کر سب کچھ بھول گیا کہ تمہیں گاؤں جانے کا کہہ کر آیا ہوں۔‘‘ شاہ زر نے سنجیدگی سے اپنی غلطی تسلیم کی تو مشعال کے تنے اعصاب میں تھوڑا فرق پڑا۔

’’ٹھیک ہے مگر آئندہ خیال رکھنا۔ جہاں بھی جاؤ بتا کر جاؤ۔ سارہ اماں بھی نہیں تھیں اور میں خواہ مخواہ پریشان ہوتی رہی۔‘‘ پچھلے چند گھنٹے اس نے جس ٹینشن میں گزارے تھے اس میں اس کا یوں آؤٹ ہو جانا فطری امر تھا مگر پھر بھی اسے اپنی یہ بے طرح پریشانی خجل کر گئی۔ وہ اپنی کیفیت کا اثر زائل کرنے کو برتن اٹھا کر ادھر ادھر رکھنے لگی۔ ’’اس وقت تو شام اتر رہی ہے۔ موسم بھی ٹھیک نہیں۔ رات کو سفر کرنا بھی مناسب نہیں۔ کل چلیں گے۔‘‘ کھانا برتنوں میں ڈالتے وہ اس کو ٹال رہی تھی مگر وہ جانے کی بجائے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

’’نہیں... کل انتیسواں (۲۹) روزہ ہے پتا نہیں کل چاند رات ہوتی ہے یا پرسوں.... بڑی امی نے عید سے دو تین دن پہلے آنے کو کہا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ بھی کر لیا ہے۔ ہمیں ابھی چلنا ہے۔ رات دس کے قریب حویلی پہنچ جائیں گے۔ اگر ہم آج نہ گئے تو وہ بہت ناراض ہوں گی پلیز تم کھانا پیک کر لو۔ افطار میں بھی ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی ہے۔ راستے میں افطار کر لیں گے۔‘‘ وہ گھڑی دیکھتے کہہ کر کچن سے چلا گیا۔ وہ پر سوچ نظروں سے اسے دیکھتی کھانا پیک کرنے لگی۔ تیار وہ پہلے ہی تھی۔ سامان بھی گاڑی میں موجود تھا۔ رات کو سفر کرنے کے خیال سے اس نے چند ضروری چیزیں گاڑی میں رکھوائیں پھر خود بھی گھر لاک کرتے گاڑی میں آ بیٹھی۔ شاہ زر پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ شہر سے نکلنے میں ہی ان کو ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ افطاری بھی انہوں نے شہر کی حدود میں کی تھی۔ پھر جیسے ہی گاڑی شہر کے قریب پر ہجوم اور گاڑیوں کے بے ہنگم شور شرابے سے باہر نکلی تو شاہ زر نے رفتار تیز کر دی۔ وہ آنکھیں بند کر کے بلاوجہ کچھ سوچنے لگی۔ ہونٹوں پر ایک الوہی سی مسکان سرایت کرتی گئی۔

’’شاہ زر! تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟‘‘ اچانک وہ آنکھیں کھول کر پوچھنے لگی۔ ان گزرے چند دنوں نے دونوں کے آپس کی بول چال کو ہموار کرنے میں ایک ’’پل‘‘ کا کام سرانجام دیا تھا۔ وہ اب خود سے ہی شاہ زر کو مخاطب کر کے بہت ہی لایعنی، عام سی، ہلکی پھلکی ڈھیر ساری اپنائیت سے لبریز باتیں کرنے لگی تھی۔ اپنی بہت سی فیلنگز اس سے شیئر کرنے لگی

تھی۔ شاہ زر اس سوال پر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اچانک اسے بچے پتا نہیں کہاں سے سوجھ گئے تھے۔ وہ اندازہ نہ کر سکا۔

“ہاں... بچے بھلا کسے اچھے نہیں لگتے... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ ’ ’

نہیں... بس ویسے ہی... وہ میں اچانک سوچ رہی تھی کہ بچوں کی بدولت ایک عورت ’ ’ کتنی مکمل محفوظ اور پر سکون ہو جاتی ہے۔” آرام سے اسے جواب دے کر دوبارہ آنکھیں بند کر کے پھر سر سیٹ کی پشت سے ٹکا لیا۔ شاہ زر کچھ دیر اسے بہت گہری پر سوچ نظروں سے دیکھے گیا۔ اس نے یہ بات یوں ہی تو نہیں کہی ہو گی ضرور کوئی وجہ ہو گی۔ وہ سوچ رہا تھا۔

تم نے عید کے لیے سب کے تحائف رکھ لیے تھے ناں...” شاہ زر کو اچانک خیال آیا ’ ’ تو وہ پوچھنے لگا جواباً اس نے سر ہلا دیا۔ آنکھیں کھولنے کی پھر بھی زحمت نہیں کی تھی۔ کافی دیر تک وہ بغیر حرکت کیے اپنی سابقہ حالت میں ہی بیٹھی رہی۔

بہت دنوں بعد شاہ زر کو اس کا یہ روپ دیکھنے کو ملا تھا۔

“ہم دونوں کیا ایک دوسرے کے لیے اپنی ذات کی خامیوں کو سنوار نہیں سکتے؟ ’ ’

باہر بارش ہو چکی ہے جناب! کیا اب ہمیں اسی طرح سڑک پر ہی جمے رہنا ہے کیا ’ ’ گائوں نہیں جانا...” وہ باہر برستی' دم بدم تیز ہوتی بوندوں کو دیکھ کر دوبارہ اسے یوں بت بنا دیکھ کر ٹوک گئی۔ شاہ زر نے ایک گہری سانس لیتے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ اسے اس کا

"جناب" کہہ کر ٹوکنا بہت اچھا لگا تھا۔ ان چند دنوں میں ہی اسے اندازہ ہوا کہ اس لب و لہجے میں بات کرنا مشعال کی عادت تھی ضد نہیں جسے وہ ایک عرصے سے طنز و استہزا سمجھ کر کھولتا رہتا تھا۔ اب بھید کھلا کہ وہ سب تو دھوکا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جو سامنے بیٹھی ہوئی تھی اب اکثر اسے اپنی سمجھ پر افسوس ہونے لگتا تھا۔ باہر بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے جیسے ہی گاڑی پر گرتے یوں آواز پیدا ہوتی جیسے اولے گر رہے ہوں۔ بارش کے ساتھ ساتھ تیز ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی بھی چمک رہی تھی۔ دور تک چھایا ہوا پر ہول سناٹا، پانی کو چیر کر آگے بڑھتی گاڑی مشعال کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرتی جا رہی تھی۔ اسے ایسے موسم ہمیشہ سے ہی خوفزدہ کر جاتے تھے۔ وہ ایسے موسم میں ہمیشہ کمرے میں بند ہو کر بستر میں چھپ جاتی تھی کبھی باہر نہیں نکلتی تھی خاص طور پر سرما کی بارش اسے اور بھی ہراساں کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی اسے موسم کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ اب بارش اس قدر ہولناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی وہ خوف سے کپکپا کر رہ گئی۔

وہ گھر سے چلتے وقت سردی کا انتظام کر کے چلی تھی۔ پاؤں میں جرابیں، جسم پر جرسی تھی اور خود کو اچھی طرح شال میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اسے سردی کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ راستے میں سردی کے خیال سے اس نے پچھلی سیٹ پر کمبل رکھوا لیا تھا۔ رخ موڑ کر ہاتھ

بڑھا کر کمبل اٹھا لیا۔ شاہ زر اسے دیکھ کر رہ گیا۔ موسم نے ایک دم تیور بدلے تھے۔ ہیٹر آن تھا پھر بھی سردی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور وہ صرف جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔

وہ اپنے اوپر جمی شاہ زر کی مسلسل نظروں سے سرخ ہو گئی۔ اس قدر چمک تھی کہ اس سے نگاہیں اٹھائے رکھنا دوبھر ہو گیا۔ ہونٹوں کو کاٹتی اس کی نظروں کے ارتکاز کو توڑتی وہ رخ موڑ گئی۔

تمہیں بھی عید مبارک۔“ بہت دھیمی آواز تھی جو شاہ زر کے کانوں تک بمشکل ہی ’ ’ پہنچ پائی تھی۔

کیا کہا ہے؟ میں نے ٹھیک سے سنا نہیں...“ وہ بن رہا تھا۔ وہ دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی اس ’ ’ شرارت پر مشعال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے شگوفے پھوٹنے لگے۔ رخساروں سے گلاب دہکنے لگے۔

میں نے جو بھی کہنا تھا ایک دفعہ کہہ دیا۔“ اس نے تھوڑی تیزی دکھائی۔ ’ ’

اور... ہمارے ہاں تو اس طرح عید مبارک نہیں کہا جاتا بلکہ...“ وہ رک گیا پھر مسکراتا ’ ’ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مشعال نے نگاہ اٹھا کر لحظہ بھر کو اس خوشبو ایسے شخص کو دیکھا جو صرف تین چار قدموں کے فاصلے پر تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم تو سب سے مل چکی ہو۔ تمہیں تو اندازہ بھی ہو چکا ہو گا۔“ وہ تین چار قدموں کا فاصلہ بھی عبور کر آیا تھا۔ وہ بھونچکا کر آنکھیں پھاڑے اس کی بات کا مطلب سمجھنے لگی۔ جس کے ہونٹوں میں ایک دلفریب و خوب صورت تبسم دبا ہوا تھا۔

اتنی ناقابلِ قبول بات تو میں نے نہیں کہی۔ آج عید کا موقع ہے اتنا تو حق بنتا ہے میرا۔" اس انداز میں شاہ زر اس کے سامنے پہلی دفعہ آیا تھا۔ اس قدر جچ رہا تھا۔ پیام دیتی آنکھیں، کھلا کھلا روشن چہرہ اور مسکراتے لب وہ دیکھتی رہ گئی۔ کبھی وہ شاہ زر کو جارحیت وسفاکیت کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتی تھی جس کا ذکر کرتے اس کی آنکھوں میں طنز اور لہجے میں نفرت سموئی ہوتی تھی۔ پل میں کیا سے کیا بدل جاتا ہے یہاں تو بدلنے میں مہینوں لگے تھے۔ اس وقت وہ محبت برساتی نظروں سے تکتا اس شاہ زر سے بالکل مختلف تھا جو اسے ائرپورٹ کے احاطے میں دیکھ کر برہم ہوا تھا۔ رگیں تن گئی تھیں، آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا، بدن میں شرارے بھرے ہوئے تھے، لاوا پھٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ پچھلے دنوں اس کا انداز کیئرنگ تھا مگر آج کوئی نیا ہی پن تھا۔ پیار بھری شوخی، اپنائیت بھری شرارت، وہ بستر کے کنارے ٹک گئی۔

یہ تو کوئی بات نہ ہوئی مشعال! ابھی سب سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کی جارہی تھی اور اب سامنے آیا ہوں تو نو لفٹ کا بورڈ لگ گیا ہے۔" وہ بھی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پڑا اسٹول کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ مسلسل شرارت پر آمادہ تھا۔ پیار کی چاشنی میں ڈوبا یہ لہجہ اور اس پر بہکتی مچلتی وارفتہ نگاہیں اسے ٹوٹ کر حیا آئی۔ اپنا برسوں کا اعتماد اس وقت ریزہ ریزہ ہوتا محسوس ہوا۔ سر ایک دم جھک گیا۔ نظروں میں چھپی معنی خیزی اور شرارت سے اسے بے

ساختہ گلگلوں کر گئی تھی۔ وہ ایک گہری نظر ڈالتا اسٹول چھوڑ کر اس کے قریب ہی بستر پر ٹک گیا۔ وہ اپنے گجروں میں موجود موتیوں کو چھو رہی تھی۔ شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مشعال...“ اس پوری شدتوں سے پکارا۔ ’ ’

جی...“ وہ اتنا ہی بول پائی تھی۔ ہاتھ جو شاہ زر کی گرفت میں تھا۔ ’ ’

تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ میں اکثر تمہارے چہرے پر موجود یہ تاثر دیکھ ’ ’ کر مبہوت رہ جاتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ میں کبھی بھی اس کی تعریف میں کچھ نہیں کہہ پاؤں گا مگر میں جب بھی سب باتوں سے ہٹ کر صرف اس تاثر کو دیکھتا تھا تو میرے دل و دماغ میں صرف تم ہی تم ہوتی تھیں مگر اگلے ہی پل پھر سب منتشر ہو جاتا تھا۔“ وہ مشعال کے چہرے کو انگلیوں سے چھوئے کہہ رہا تھا۔ وہ پھر بدلنے لگی‘ ایک دم مسکرا دی۔

ایک بات پوچھوں مشعال! سچ سچ بتاؤ گی؟“ اچانک ہی وہ سنجیدہ ہو کر پوچھ رہا تھا۔ ’ ’

مشعال نے کانپتی لرزتی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا جو اس کی آنکھوں میں ہی دیکھ رہا تھا۔

تم نے واقعی مجھے معاف کر دیا ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ مشعال کا ہاتھ کانپ گیا۔ ایک ’ ’ دم نجانے شاہ زر کو کیا ہو گیا تھا وہ بالکل بدل گیا تھا۔

کیسی باتیں کرتے ہو تم اگر میرے دل میں کدورت ہوتی تو اس وقت میرا ہاتھ ’ ’ تمہارے ہاتھ میں نہ ہوتا۔ میں تمہارے سامنے نہ بیٹھی ہوتی۔ یوں صرف تمہارے لیے نہ بنی

سنوری ہوتی۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو میں جو کام کرتی ہوں پوری دل کی آمادگی سے. برضا ورغبت کرتی ہوں ورنہ نہیں کرتی۔ کیا میرے ان چند دنوں کے رویے سے بھی تم نے یہ ‘ ‘ بات محسوس نہیں کی...؟

ہاں کی ہے مگر مشعال! پرسوں جب تمہیں چوٹ لگی تھی اور تم بے ہوش ہو گئی تھیں ’ ’ تو میں تمہیں ڈاکٹر نورین کے کلینک لے گیا تھا۔ جانتی ہو وہ کیا کہہ رہی تھیں...؟“ مشعال بے اختیار نظریں جھکا گئی۔ سرخ چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ شاہ زر نے ایک طویل سانس لی اس کا ہاتھ چھوڑ کر کہنیوں کے بل بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

مشعال! تم نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی... کیا میں اتنا ہی بے اعتبار ہو گیا تھا کہ تم ’ ’ نے یہ خوشی مجھ سے شیئر کرنے کے قابل ہی نہ سمجھا...؟ جب ڈاکٹر نورین نے مجھے بتایا تو ایک دم میں بہت خوش ہوا تھا مگر دوسرے ہی لمحے جب اس نے یہ بتایا کہ تم اس بات سے پہلے ہی آگاہ ہو تو یقین کرو اس وقت اپنے متعلق ڈاکٹر کی حیرت جان کر مجھے خود سے نفرت ہونے ’’لگی۔ دل چاہا کہ میں خود کو کچھ کر بیٹھوں۔ میں جو اپنی خوشیوں کو خود ہی نگل گیا تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ وہ چند لمحے قبل شرارت پر آمادہ رہنے والا شاہ زر بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ بہت سنجیدگی سے کہتا بہت ہی اپ سیٹ ہو رہا تھا۔ شاہ زر اس کے دیکھنے پر اٹھ بیٹھا۔

“ایک اور بات بتاؤ۔ جھوٹ نہیں بولنا۔” وہ پلکیں اٹھاتی گراتی اسے دیکھتی رہی۔ وہ یہ خوشخبری اسے خود سنانا چاہتی تھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ یہ ذکر چھیڑے گا۔

“ڈاکٹر نورین بتا رہی تھیں کہ اب بات کو چاہ ماہ ہونے کو ہیں اور جب تم نے مجھے طلاق کے پیپرز سائن کرنے اور بھیجنے کو منع کیا تھا کیا اسی وجہ سے تم نے انکار کیا تھا...؟” وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا بالکل سنجیدہ تھا۔ اس نے گردن جھکا کر اقرار کر لیا۔ شاہ زر دیکھتے ہی خاموش ہو گیا۔ وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ پیشانی تھامے بیٹھا تھا۔ اسی طرح کئی لمحے بیت گئے۔

“اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم کیا چاہتی ہو...؟” کافی سارے لمحے خاموشی سے سرک جانے کے بعد بھی دونوں طرف چپ.برقرار تھی پھر اس خاموشی کو شاہ زر نے ہی توڑا۔

“کیا مطلب ہے؟ میں سمجھی نہیں۔”

“میں چاہتا ہوں مشعال! تم اب کوئی فیصلہ کرو اس بات سے قطع نظر کرو۔” اس نے “اس” پر زور دیا۔

“میں پہلے ہی تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔” اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

’’نہیں مشعال! وہ تو فیصلہ نہیں تھا‘ مجبوری تھی جو ایک نئی خبر سن کر تم نے اپنا ارادہ بدلا تھا۔ یہی وہ زنجیر تھی جو تمہارے پائوں میں بندھ گئی تھی اور جس کا ذکر تم نے اپنا فیصلہ سناتے وقت کیا تھا۔ اس وقت میں نے تمہاری باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ افسوس میں اس وقت کچھ ہی سمجھ نہ سکا مگر آج میں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ تم فیصلہ کرو۔ جو بھی فیصلہ کرو گی میں قبول کروں گا ہر قسم کے خوف سے دور ہو کر ہر قسم کی زنجیر سے آزاد ہو کر۔‘‘ مشعال آنکھیں پھیلائے حیرت سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے بات ختم کی تو وہ چونک گئی۔

’’ہاں شاہ زر! اس وقت مجھے یہی احساس ہوا کہ اس نئی خبر نے میرے پائوں میں ایک زنجیر باندھ دی ہے مگر شاہ زر قسم لے لو۔ وہ میرے وقتی جذبات تھے جب میں اپنے اندر کی کشمکش سے نکل کر فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا تو اس نے خود بخود مجھے طلاق نہ لینے کے فیصلے پر راسخ کر دیا۔ میں اگرچہ تدبیر عمل‘ ارادوں اور تقدیر کے چکر میں ضرور الجھی تھی مگر بھٹکی نہیں تھی۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے میری رہنمائی کی۔ میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ مجھے اپنے فیصلے پر نہ کوئی پچھتاوا ہے نہ کسی قسم کی کوئی ندامت۔ میرے ساتھ جو بھی ہوا وہ میرے اعمال کا نتیجہ تھا۔ میری غلطیوں‘ ندامتوں اور لغزشوں کی بدولت تھا۔ اللہ بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ وہ ہر شخص کو وہی دیتا ہے جس کا وہ حق دار ہو۔ میں نے جو بویا وہی کاٹا۔ میں جو الجھتی رہتی تھی کہ میری شادی تم سے کیوں ہوئی تو شاہ زر میں غلط کرتی رہی ہوں۔ میری سوچ غلط تھی‘ میرا طریقہ کار غلط تھا۔ میں لاشعوری طور پر ایک دعا ضرور مانگا کرتی تھی کہ اللہ

جو میرے لیے میری ذات کے لیے میری آئندہ زندگی کے لیے بہتر ہو وہی میرے ساتھ کرنا۔ اللہ نے وہی کیا۔ میں خوابوں سرابوں اور گناہوں کے پیچھے ایک عرصے تک بھاگی ہوں مگر میرے اللہ نے مجھے بچالیا۔ سیدھے راستے پر ڈال دیا۔ جوں جوں یہ احساس میرے اندر تقویت پکڑتا گیا کہ میں تمہارے بچے کی ماں بن رہی ہوں تو خود بخود میرے اندر نئے احساسات پیدا ہونے لگے۔ پھر مجھے اس نئے آنے والے وجود کے علاوہ کوئی اور بات سوجھتی ہی نہیں تھی نہ تم اور نہ اپنا آپ۔ البتہ اللہ ضرور یاد رہتا تھا اب تو میں بہت خوش ہوں تمہارے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہنے کا فیصلہ کر کے ہر طرف سے مطمئن ہو گئی ہوں۔ میری ہر بے چینی واضطراب ختم ہو گیا ہے جو ایک عرصے سے میرے اندر پنپتی پیاس تھی وہ بجھنے لگی ہے۔ ابھی تو شاہو مجھے تم سے محبت ہوئی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ میں فیصلہ کروں یہ اب ناممکن ہے تم خود ہی بتاؤ اب میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں۔ اب تو مجھ سے کوئی بھی فیصلہ نہیں ہو گا۔

بچپن میں جب میں نے محبت کے پہلے لمس کو محسوس کیا تھا۔ ابھی محبت کی پہلی پھوار اور دھنک رنگ اوڑھ کر برسی تھی کہ ماما ہم سب کو برطانیہ لے گئیں۔ میں اس وقت بہت روئی تھی‘ بہت تڑپی تھی۔ ساری جوانی محبت کے اس پہلے الوہی سے لمس کو کھوجتی رہی‘ دھنک رنگ محبت تلاش کرتی رہی حتی کہ بھٹکتے بھٹکتے مجھے جولف مل گیا۔ میں نے اپنے اندر کی بے سکونی کو ختم کرنے کے لیے اس کا ساتھ قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر میں پھر بھی بے سکون

تھی یہ حذیفہ ہی تھا جس نے مجھے احساس دلایا کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ کہتا تھا کہ روح مرکز سے ہٹ جائے، جسم سے جدا ہو جائے تو بھٹکتی رہتی ہے بے چین ہوتی رہتی ہے، میرا مرکز تم ہو۔ میرا جسم تم ہو، تم سے جدا ہوئی اللہ کو بھلا دیا اور بھٹکتی رہی۔ اپنی پہچان تک بھول گئی اور اب جو میں تمہاری طرف لوٹی ہوں تو تم مجھے کوئی فیصلہ کرنے کو مت کہو۔ اب کے میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ محبت کیا ہوتی ہے ان دو دنوں میں مجھے پتا چلا ہے۔ ہاں مجھے اقرار ہے شاہو میں تم سے کل بھی محبت کرتی تھی آج بھی کرتی ہوں اور اس وقت بھی ہزار ہا چاہنے کے باوجود خالص نفرت تم سے نہ کر سکی جب ہمارے بیچ نفرت وانتقام کے رشتے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے تمہیں سب بتا دیا ہے اب تم خود بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ رونے لگی تھی اس کی زندگی میں خوشی کی گھڑیاں بہت کم مدت کے لیے آئی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے وہ دل وجان سے مسکرا رہی تھی اور اب وہ رو رہی تھی۔ شاہ زر نے اس کا کندھا تھام کر چپ کرانا چاہا تو وہ اس کے ساتھ لگ کر روتی رہی۔

'نہیں شاہو! اب تم مجھ سے ایسا کچھ بھی کرنے کو مت کہنا۔ ہم دونوں پہلے ہی اپنی ضد، نفرت، جھوٹی انا اور انتقام کے پیچھے اپنا بہت نقصان کر چکے ہیں۔ پچھتاوے ایسے ہیں شاید ہی زندگی میں ختم ہوں۔ اب تو اس نقصان کی نذر کرنے کو ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں سوائے ایک تیسرے وجود جو ہم دونوں کی زندگی خوشیوں اور اس رشتے کی بقا کی ضمانت ہے۔ شاہ زر ہم دونوں کو اب خود سے ہٹ کر اس کے لیے سوچنا ہو گا۔" وہ سلیقے سے سنورے اس

کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ مشعال آنسو بہاتی رہی۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔ بہت محبت سے اس کی روشن قندیل پیشانی چوم لی۔

’’تم مجھے بتا تو سکتی تھیں یہ تیسرا وجود ہم دونوں کی ذات کا حصہ ہی تو ہے۔ میں کب چاہتا ہوں مشعال کہ تم مجھ سے جدا ہو۔ بس یہی سوچتا رہا کہ میرے گناہ اس قدر ناقابلِ معافی تھے کہ جو خبر تمہیں خود بتانی چاہیے تھی وہ ایک اجنبی شخص سے پتا چلی۔‘‘ دوبارہ اسے بازوئوں میں بھرتے وہ بہت نادم تھا۔ مشعال نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

’’نہیں... تمہارے گناہ ناقابلِ معافی نہیں تھے۔ میں تمہیں اسی وقت بتانا چاہتی تھی جب تم نذیر کی شادی پر آئے تھے مگر بتا نہ پائی۔ بعد میں ایسی صورت حال ہوئی کہ تم واپس چلے گئے اور میں کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ یہ میری احمقانہ سوچ اور ڈر ہی ہے کہ اس نے مجھے تب بھی کچھ بتانے نہ دیا۔ جب پچھلے دنوں لاہور گئی تھی میں سوچتی تھی کہ یہ خوشخبری تو صرف میرے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ شاید تم خوش نہ ہو۔ تمہارے سلوک نے رویوں نے مجھے تم سے بدظن کر دیا تھا۔ بس کسی اچھے موقعے کا انتظار کرتی رہی۔ آج میں تمہیں خود یہ بتانا چاہتی تھی مگر تم نے خود ہی بات شروع کر دی پھر شاہ زر میرا کیا قصور تھا۔ میں تو کھوئی ہوئی محبتوں کی تلاش میں یہاں آ نکلی تھی اور تم نے میرے خیالات تک کو' میرے ذہن کی سوچوں کو بھی منفی کر دیا تھا حتیٰ کہ میں خود سے لڑتی رہی۔ تمہیں بھی زچ کرتی رہی۔ اپنی خوشیوں اپنے محسوسات اور جذبوں کی بھی پرواہ نہ کی۔‘‘

ایم رئیلی سوری مشعال...'' شاہ زر نے کچھ کہنا چاہا تو مشعال نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرا دیا۔

نہیں شاہ زر! میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں۔ مجھے خدا کے سامنے مزید شرمندہ مت کرو۔ ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ میں بھی غلط تھی پھر تنہا تم کیوں معافی مانگو مجھے بھی معافی مانگنی چاہیے۔'' اس کی بات پر شاہ زر نے بہت اپنائیت سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔ نازک مرمری ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگالیا۔

شاہ زر! کیا یہ نہیں ہو سکتا ہم ماضی کو بھول جائیں۔ اس سے عبرت پکڑیں اور کبھی نہ یاد کریں۔ باغ والی رات کے بعد میں نے ہر تلخ پل ہر تلخ بات کو بھلا دینے کی کوشش کی۔ جو کچھ یاد ہے اسے بھی بھول جانا چاہتی ہوں۔ میں اب کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتی جو بھی ہوا جیسے بھی ہوا وہ ہمیں سبق دینے کے لیے تھا۔ اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں چاہوں گی ہم دونوں ماضی کو کبھی نہ کریدیں گے۔ ہمارے سامنے ہمارا مستقبل ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے لیے اس حویلی کے سب مکینوں کے لیے اور سب سے بڑھ کر اپنے آنے والے بچے کے لیے جینا ہے۔ پوری خوشی وشادمانی کے ساتھ۔ اسے ایک ایسا انسان بنانا ہے جس پر ہمیں فخر ہو۔ وہ نہ مجھ جیسا ضدی بھٹکا ہوا ہو اور نہ تم جیسا ادھورا۔ وہ ایک مکمل انسان ہو۔ جس کو اللہ پر یقین ہو' جس کی سوچ پختہ ہو۔ جو رشتوں کا احترام کرنا جانتا ہو۔ جو ایک مومن مسلمان ہو۔'' وہ بہت پر عزم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ نظر اٹھا کر شاہ زر کو دیکھا پھر قصداً مسکرا

دی۔ وہ شاہ زر کو اپنے سامنے کبھی بھی نادم نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہمیشہ اس کے سامنے وہ ایک چھایا ہوا مرد رہا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ اسی روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ محبت شاید اسی کا نام ہے۔ محبت کبھی محبوب کو اپنے سامنے جھکانا پسند نہیں کرتی۔ خود اس کے سامنے جھک جانے پر فخر محسوس کرتی ہے۔ شاہ زر دلنواز نگاہوں اور مقدس جذبوں کی یورش لیے اسے دیکھتا رہا۔ اسے مشعال کے چہرے کو اس وقت دیکھنا دنیا جہاں کے سب منظروں سے زیادہ حسین نظارہ لگ رہا تھا۔

’’انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔‘‘ اس نے بھی خلوص سے کہا۔ ’’مگر ابھی اٹھو۔ میں نے کسی کو بھی ابھی تک اس خوشخبری کے متعلق نہیں بتایا۔ پہلے چل کر انہیں آگاہ کریں۔ وہ سب لوگ چار ماہ کے بعد بتانے پر ناراض ہوں گے ابھی تو انہیں بھی راضی کرنا ہے۔ اچھا خاصا معاملہ تم نے چوپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔‘‘ اسے خود سے جدا کر کے خود کو سنبھالتا کھڑا ہو کر اسے بھی خوش گوار موڈ میں کہتا ہاتھ تھام کر کھڑا کرنے لگا۔

’’کیا... میں نے کب معاملہ چوپٹ کیا ہے؟‘‘ اس نے اسے خوش گوار موڈ میں دیکھ کر آنکھیں دکھائیں تو شاہ زر کا معنی خیز قہقہہ چھت پھاڑ رہا تھا۔ وہ سمجھ کر خجل سی ہو گئی۔

’’تو پھر کس نے معاملہ چوپٹ کیا تھا۔‘‘ وہ اس کی طرف جھکتے پوچھ رہا تھا۔ مشعال نے دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکیلا پھر اعتماد سے بولی۔

’’تم نے... ‘‘آرام سے جواب موصول ہوا تھا۔ وہ مسکراتا چلا گیا۔ آج یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا کی ساری دولت مل گئی ہو۔

’’تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں مشعال... ‘‘وہ یک دم سنجیدہ ہو کر کہہ رہا تھا۔ مشعال نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’کیا...؟‘‘

’’ہم دونوں آپس میں لڑتے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ خاص طور پر تم تو غصے میں اتنی حسین لگتی ہو کہ... ‘‘مشعال کے گھور گھور کر دیکھنے پر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

’’چلو اب اٹھو بھی۔ ‘‘اس کا ہاتھ پکڑ کر شاہ زر نے اپنے مقابل کھڑا کیا۔

’’مگر شاہو! میں باہر نہیں جاؤں گی۔ مجھے بہت شرم آ رہی ہے تم خود بتا دو۔ ‘‘وہ شرم سے سرخ ہوتی انکار میں سر ہلانے لگی۔

’’یعنی کہ میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کا ارادہ ہے۔ چلو ٹھیک ہے منظور ہے۔ ‘‘شاہ زر نے اس کے سرخ چہرے کو نظروں کے رستے دل میں اتارتے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ وہیں بستر پر بیٹھ کر شاہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ جب باہر جا کر سب کو بتائے گا تو ماما پاپا، بڑی امی، ابیشا سب کتنے خوش ہوں گے۔ وہ تصور کر کے ہی مسکرانے لگی۔

اس وقت وہ بہت مطمئن و مسرور تھی۔ دل اندر ہی اندر اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کی

لکیروں کو بغور دیکھنے لگی۔ ایک عرصے تک وہ ان لکیروں کے الجھاؤ میں الجھی رہی تھی۔ برطانیہ میں وہ ہر اس شخص کو ہاتھ دکھاتی تھی جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ بہت بڑا دست شناش ہے۔ لکیریں اب بھی ویسی ہی تھیں سیدھی صاف وشفاف اور درست مگر اب اسے عقل آ گئی تھی۔ یہ عقل اگرچہ بہت ٹھوکریں، ناکامیوں، ناامیدیوں اور سنگین لغزشوں کے بعد آئی تھی مگر وہ مطمئن تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت کے سب سے درخشاں ستارے کو جگمگا دیا تھا۔ اس کی زندگی میں جو بھی ہوا تھا وہ سب اس مالک و برتر کی ذات پاک اور رضا سے ہوا تھا۔ اس نے جو بھی مصیبتیں، تلخیاں اور نقصان اٹھائے تھے اپنے اعمال اور سوچ کی بدولت تھے۔ اسے خوشیاں مانگنے اور برتنے کا ہنر آ گیا تھا۔ شانزہ کی قربت نے اسے ناامید ہونے، بات بات پر غصہ کرنے، ہر کام، ہر مسئلے، ہر بات کو انا کا مسئلہ بنا لینے کی بجائے اللہ کی طرف رجوع کرنے کا جو راستہ دکھایا تھا وہ اس قدر روشن و پر سکون و منور تھا کہ اس نے اس پر صرف ایک قدم رکھتے ہی اپنی منزل پا لی تھی۔

محبت، اعتدال پسندی، خوش مزاجی و خوش اخلاقی، راستی، سچائی، ایمانداری جیسی صفات ہی تو تھیں جو زندگی کو خوشگوار و کامیاب بناتی ہیں۔ وہ جو اپنی قسمت اپنی خوشیاں اپنے ہاتھ کی لکیروں میں تلاش کرتی تھی اب وہی خوشیاں اللہ کی رضا میں تلاش کرنے لگی تھی۔

وہ لوگ بھی تو ہوتے ہیں جنہیں خدا آزماتا ہے اور پھر آزماتا ہی چلا جاتا ہے مگر وہ حکم ایزدی جان کر اس کی رضا سمجھ کر سب صبر و شکر سے برداشت کر لیتے ہیں۔ انبیاء کرامؑ کی مثالیں

اس کے سامنے تھیں... کچھ تو شکر کر کے آخرت کی کامیابی حاصل کر لیتے ہیں اور کچھ اس جیسے بھی ہوتے ہیں جو ناشکری کرتے ہیں۔ بات بات پر رونا دھونا مچاتے ہیں۔ بے صبری دکھا کر سب کچھ تباہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس نے بھی ناشکری کی تھی۔ بات بات پر رونا دھونا مچایا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بے صبری دکھائی تھی۔ تو پھر طے ہوا کہ بہتر کون تھے۔ وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں اور اخروی کامیابی کی صورت میں سب کچھ پا لیتے ہیں یا وہ جنہیں خدا نے ذرا آزمایا فوراً تڑپ اٹھے ناشکری پر تل گئے۔ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی برباد کر بیٹھے۔

شاہ زرجو اس کے لیے دنیا بھر میں ناپسندیدہ ہستی تھا آج وہی پسندیدہ ہستی بنا دل کی بستی پر حکمران بنا بیٹھا تھا۔ جب محبت دھنک رنگ اوڑھ کر دل کی سوکھی دھرتی پر بکھرتی ہے تو ہر جذبہ معتبر لگنے لگتا ہے اور ہر احساس خوب صورت رنگوں کا پیراہن اوڑھ کر کتنا دلنشین لگنے لگتا ہے۔ محبت نے خود اس کے اپنے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ ناشکری کر کے خود کو ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو کر ہاتھ میں آئے یہ پیار محبت‘ خوشی وانکساری‘ عاجزی وصبر و شکر کے قیمتی پل نہیں گنوانا چاہتی تھی کیونکہ یہی عقل مندی تھی اور یہی جی حضوری کا پہلا قرینہ تھا۔ اس کے لیے اس پر اللہ کی ذات پاک کا شکر ادا کرنا بھی واجب تھا۔ یک دم کمرے سے باہر قدموں کی آوازیں‘ اور خوشی کی چہکاریں گونجنے لگیں۔ وہ یک دم ”الحمدللہ“ کہتی سب کے استقبال کے لیے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

ختم شد